قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2018 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب و غریب خبریں

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

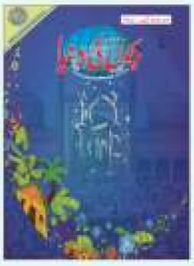

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ہماری بات

دنیا کے بیشتر مسائل محبت اور مفاہمت سے حل کیے جاسکتے ہیں۔ شدت پسندی مسائل کو اور پیچیدہ بنا دیتی ہے اور کوئی بھی مسئلہ اپنے منطقی انجام تک نہیں پہنچ پاتا۔ مسائل معاشرت کے ہوں، سیاست کے ہوں، ثقافت کے ہوں یا کسی اور نوعیت کے، ان کے حل کرنے کی واحد صورت مفاہمت ہی ہے۔ عہد قدیم سے دورِ جدید تک جو مسائل حل نہیں ہوسکے ان میں وہی مسئلے زیادہ ہیں جن میں کسی طبقے یا قوم نے جارحانہ یا شدت پسندانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہ مسائل صرف سیاست یا سماج کے نہیں ہیں بلکہ بہت سے ثقافتی مسائل بھی ہیں جن میں اسی نوع کی شدت پسندی راہ پا گئی ہے اور یہ روش نہ صرف مختلف قوموں اور زبانوں کے درمیان خلیج کو بڑھاوا دے رہی ہے بلکہ ایسے فاصلوں کو جنم دے رہی ہے جن کو پاٹنا نہایت مشکل ہے۔ مہاتما گاندھی کے دور میں بھی کچھ پیچیدہ مسائل تھے جن کے حل کے لیے انھوں نے وہ راہ نہیں اختیار کی جو کبھی منزل تک نہیں پہنچا سکتی۔ انھوں نے اس راستے کا انتخاب کیا جس سے سارے مسائل آسانی کے ساتھ حل ہو جائیں اور کسی بھی قوم یا طبقے کی دل آزاری یا حوصلہ شکنی بھی نہ ہو۔ انھوں نے ایک ایسے ماحول میں عدم تشدد کا تصور دیا، جب تشدد نے خطرناک شکل اختیار کر لی تھی۔ اہنسا کا ایک ایسا فلسفہ دیا جس سے انھوں نے دشمنوں کے دل بھی جیت لیے اور اس تصور کو نہ صرف قومی سطح پر مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ بہت سے عالمی سماجی اور سیاسی دانشوروں اور مفکرین نے بھی اس تصور کو سراہا اور گاندھی جی کو ایک دوراندیش صاحب بصیرت انسان قرار دیا کہ ان کے اس تصور میں انسانی کائنات کو جوڑنے کا جذبہ تھا۔ سماجی، سیاسی اور تہذیبی سطح پر تصادم کی جو صورتیں تھیں انھیں حل کرنے کا گاندھی جی نے جو نسخہ کیمیا دیا وہ نہ صرف تحریک آزادی بلکہ بہت سے تنازعات کے حل کرنے میں مفید اور معاون ثابت ہوا۔ گاندھی جی کے عہد میں جہاں سیاست اور سماج کی سطح پر خلیج بڑھ رہی تھی وہیں لسانی تنازعہ بھی بھیانک صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

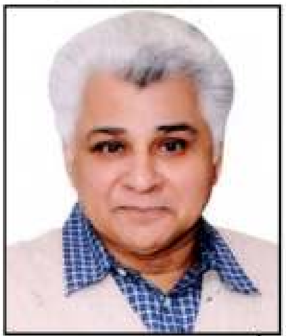

خاص طور پر ہندی اور اردو کے مابین دوری بڑھتی جا رہی تھی۔ اردو ہندی تنازعے میں انگریزوں کی سازشی ذہنیت کارفرما تھی یا یہ ہندی-اردو حامی طبقے کی ضد، انا اور جذبۂ تفوق کا نتیجہ تھا۔ یہ الگ بحث ہے حقیقت یہ تھی کہ یہ دونوں زبانیں کبھی الگ نہیں تھیں۔ دونوں کا خاندان ایک ہے۔ دونوں ہی کھڑی بولی سے نکلی ہیں۔ ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھنے والی ان دونوں زبانوں کے قواعد اور لفظیات میں بھی بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ جملے کی ساخت، محاورے، فعل، فاعل اور مفعول سب ایک جیسے ہیں۔ ہندی کی ہکاری آوازیں بھی اردو کا حصہ ہیں پھر بھی دونوں کے درمیان ایک مصنوعی تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جسے مہاتما گاندھی نے بھی محسوس کیا اس لیے انھوں نے ایک ہندوستانی زبان کا تصور دیا تاکہ زبان کی سطح پر اتحاد اور یکجہتی قائم رہے مگر شدت پسندوں نے گاندھی جی کے اس تصور کو تسلیم نہیں کیا اور اس طرح دونوں زبانوں میں خلیج بڑھتی ہی گئی۔ اردو کو مسلمانوں اور ہندی کو ہندوؤں کی شناخت سے جوڑنے کی سازش جاری رہی جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ اردو کسی خاص قوم یا مذہب کی زبان کبھی رہی ہی نہیں۔ زبان پہلے ہندی یا ہندوی کہلاتی تھی۔ میر تقی میر نے بھی اپنے ایک شعر میں کہا تھا:

نہ جانے لوگ کہتے ہیں کس کو سرورِ قلب　　　آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ

اور مصحفی کا مشہور شعر ہے:

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ　　　اب ہے اشعارِ ہندوی کا رواج

اردو اور ہندی کے درمیان گہرا لسانیاتی رشتہ ہے۔ اردو کے بیشتر الفاظ ہندی اور سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ اس کے باوجود اپنے مفادات کی خاطر دونوں زبانوں کے درمیان دیواریں کھڑی کی جاتی رہیں لیکن اب صورتِ حال تبدیل ہو رہی ہے کیونکہ اب جو ہندی لکھی جا رہی ہے اس میں اردو کے الفاظ بھی استعمال ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر فلموں اور الیکٹرانک میڈیا کی زبان وہی ہندوستانی ہے جس کا تصور گاندھی جی نے دیا ہے۔ لاشعوری طور پر یہ عوام کے درمیان مقبول ہو رہی ہے۔ گاندھی جی نے سیاست، سماج اور زبان کے تعلق سے جو تصورات ہمیں دیے ہیں وہ دائمی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے افکار ہمارے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہیں گے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ماہنامہ **اردو دنیا** نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:20، شمارہ:10، اکتوبر 2018

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

صلاحیت نہیں سفارشات پر ملتے ہیں انعام: ظہیر صدیقی — ہمایوں اشرف 9

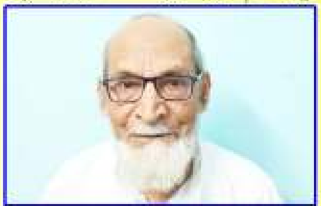

زبان و تعلیم

ادب اطفال کے درسی مسائل — ریاض احمد 14

اکتوبر کے اساطین

سرسید کے پنجاب کے پانچ سفر — اصغر عباس 18

سید والا گہر اور بین المذاہب مفاہمت — مظفر حسین سید 22

مہاتما گاندھی کا تصور امن و آشتی — نیلوفر حفیظ 26

ندا فاضلی کے دوہے — عبدالسمیع 29

فکر تونسوی: ایک عوامی فنکار — مہتاب امروہوی 32

حافظ محمود خاں شیرانی — محمد جابر حمزہ 35

نقد و نگاہ

شاعر کشمیر مجہور اور اردو غزل — قدوس جاوید 38

طامس ہڈرلی طامس — محمد مشتاق تجاروی 42

اردو شاعری میں فارسی الفاظ وتراکیب کا تصرف — محمد زبیر 45

تاریخ و ثقافت

اچل پور کا تاریخی وتہذیبی پس منظر — سید غلام علی بیابانی 48

عالمی ادبیات

جوزف کانراڈ: سامراج شکن ناول نگار — احمد سہیل 51

نزار قبانی: جدتِ افکار اور جرأتِ اظہار کا استعارہ — نایاب حسن 53

ہم نے جنھیں بھلا دیا

شوکت پردیسی: ایک بھولا بسرا شاعر — نعیمہ جعفری پاشا 55

خراجِ عقیدت

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید — شیخ عمران 57

سماجیات

سماجی علوم کی تعلیم و تدریس میں مشاہداتی زاویہ فکر کی اہمیت — سید اطہر رضا بلگرامی 60

گفتگو

مرزا عبدالقیوم ندوی سے خاص ملاقات — عبدالحی 64

نیا آسماں، نئے ستارے

سید عابد علی عابد کی ادبی اور صحافتی خدمات — ثمرین 69

فلم

فلم کی زبان اور تکنیک — عبدالقادر صدیقی 72

کمپیوٹر

کیلکولیٹر اور ونڈوز میڈیا پلیئر 74

کتابوں کی دنیا

تعارف وتبصرہ — ادارہ 78

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 88

آپ کی بات

ستمبر ماہ کے شمارے میں جناب جمال اختر نے ہندی زبان کے بلند پایہ مایہ ناز کوی اور گیت کار گوپال داس نیرج کی ادبی خدمات کو موزوں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کی ذات 'سکینہ' کا کم لوگوں کو ہی علم ہے۔ اس مضمون میں ان کی انسان دوستی اور ارفع اقدار کے ساتھ ان کی پرواز تخیل کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ اگر ایک جانب ان کی قنوطیت آمیزی ظاہر ہوئی ہے، مثلاً 'کارواں گزر گیا...' (فلم 'نئی عمر کی نئی فصل') شہرۂ آفاق گیت کے توسط سے، تو 'اے بھائی ذرا دیکھ کے چلو...' (فلم 'میرا نام جوکر') جیسے تلخ حقیقت سے لبریز گیت کے توسط سے مشاہدات زندگی کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔

داؤد احمد خاں صاحب نے باندہ کے تناظر میں مرزا غالب کے قیام، فارسی زبان میں شعر گوئی اور مختلف ادبی سرگرمیوں کا محاسبہ پیش کیا ہے۔ رؤف خیر نے اپنے مقالے میں پانی پت کے نامور اور چند نایاب ادبا کا نہایت عرق ریزی کے ساتھ محاکمہ پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اور ان کے تئیں مناسب خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ نسیم احمد کے مضمون 'کچن گارڈن' کی اشاعت خوبصورتی کے ساتھ ہوئی ہے۔ یہ مضمون بلا شک اس شمارے کا ایک وقیع مضمون ہے۔ دیگر مضامین بھی از حد تحقیقی و معلوماتی ہیں۔

❁ **ڈاکٹر کرشن بھاوک**: کوٹھی نمبر A-201، گورو نانک، پٹیالہ

جولائی کے اداریے میں آپ نے اپنی بات کی شروعات یوں کی ہے کہ ہر معاشرے میں منفی و مثبت قوتیں ہی کارگر رہتی ہیں اور کشمکش کی صورت بھی اختیار کر لیتی ہیں جو برحق ہے۔ یہ کشمکش تصادم صرف سماج یا سیاست کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ادب و ثقافت پر بھی اس کا غلبہ ہے۔ بلاشبہ یہاں بھی ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو ہر شے کو منفی زاویے سے دیکھتا ہے اور دوسروں کو بھی تخریبی تناظر میں دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ انہی دگرگوں پالیسیوں کو رو بہ عمل رکھتے ہوئے مختلف ادارے اپنی راہوں پر گامزن ہیں، بقول آپ کے تنقید سے بھی بالاتر

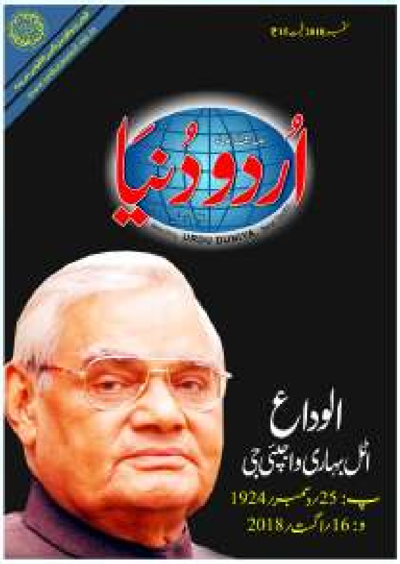

نہیں ہے اور تنقید برائے اصلاح ہی تعصباتی تنقید پر غالب آتی ہے کیونکہ تعصب کی زیادہ عمر نہیں ہوتی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی ایک سرکاری ادارہ ہے جو ان تعصباتی نظریات سے پاک ہے اور کونسل کی پالیسیاں مثلاً سماجی، سائنسی، تکنیکی، ادبی موضوعات پر معیاری کتابوں کی اشاعت کے علاوہ سمیناروں اور مشاعروں کے انعقاد کے لیے مالی تعاون اور مختلف موضوعات پر پروجیکٹ کا سلسلہ اور کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر کے اداروں کا پھیلاؤ تمام شہروں اور دیہات سے جڑا ہوا یہ فاصلاتی نظام تعلیم اردو کے فروغ کے لیے کارآمد اور تاریخ ساز اقدام ہے۔ مضامین کے حصے میں فضیل جعفری پر عتیق اللہ کا مضمون بڑی خوشگوار اور معلوماتی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ ش مظفر پوری، پریم چند پر بھی اچھے مضامین پڑھنے کو ملے۔ میرے دیرینہ رفیق شاہد ساز کا دلچسپ مضمون گوہر جان گوہر ایک مغنیہ ایک شاعرہ بھی مطالعے سے گزرا۔ اس مضمون پر بساط بھر تبصرہ کرنے سے قبل مجھے طنز و مزاح کے شہرۂ آفاق ادیب مشتاق یوسفی مرحوم کا ایک قول یاد آ رہا ہے کہ "جس قدر طوائفوں کی تعریفیں شعرا اور ادبا نے اپنی تخلیقات میں کی ہیں اتنی طوائف کے گاہکوں اور شیدائیوں نے بھی نہیں کی ہیں۔"

رفیق موصوف شاہد نے بھی گوہر جان گوہر کے جوہر گنوانے میں تجزیات کا پورا حق ادا کیا ہے کہ گوہر جان ایک طوائف تھیں جن کا تعلق بقول ان کے جنسی تلذذ سے نہیں بلکہ صرف موسیقی اور ادب و حسن سلوک سے تھا اور مزید برآں عزیز الدین چشتی نے جو تفصیل کے ساتھ گوہر جان پر روشنی ڈالی ہے وہ طوائفوں کی تاریخ میں اس کے کردار کا ایک نایاب حصہ ہے۔ ہاتھ میں تسبیح اور چہرے پر خشیت الٰہی کی ضیاباری، زہد و تقویٰ کی پاس داری قارئین کے لیے تجسس و استعجاب کا باعث ہے۔

میرے رفیق شاہد ساز نے اکبر الہ آبادی سے منسوب کرتے ہوئے شعر پیش کیا ہے وہ دراصل یوں ہے:

کون یکتائے زمانہ رہا گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

تحفتاً اکبر الہ آبادی نے یہ شعر گوہر جان کی سالگرہ پر انھیں بھیجا تھا۔ شاہد ساز نے یہ بات صحیح لکھی ہے کہ گوہر جان غالب کی شاگرد نہیں تھیں کیونکہ غالب کی وفات 1869 میں ہوئی اور گوہر جان 1873 میں پیدا ہوئی تھیں۔ آخرش گوہر جان 1929 میں مہاراجہ میسور کے دربار سے وابستہ ہوئیں اور وہیں 1930 میں جاں بحق اور سپرد خاک ہوئیں۔

❁ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی تمل ناڈو

'اردو دنیا' اگست کے شمارے، اداریے 'ہماری بات' میں آپ نے ہندوستان کی آزادی کا احاطہ کرتے ہوئے تذکرہ کیا ہے کہ آزادی سے زیادہ بیش بہا کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یقیناً غلامی کسی بھی قوم کے لیے ایک منفی قدر کی حیثیت رکھتی ہے، جبکہ آزادی ہر فرد کی جبلت میں شامل ہے۔ کوئی بھی حساس فرد طوق غلامی کو پسند نہیں کرتا۔ یہ کھلی حقیقت ہے کہ ملک کی آزادی کی خاطر ہمارے مجاہدین آزادی نے استعماری زنجیروں کو توڑنے کے لیے جنگیں لڑیں۔ کئی قسم کی صعوبتوں کو جھیلا، قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں۔ ایسے ہی جیالوں کی پرخلوص جدوجہد نے ملک ہند کو غلامی کے اندھیروں سے نکال کر آزادی کا نیا سورج دکھایا۔

قومی اردو کونسل اردو زبان کے فروغ کے لیے جو کوششیں کر رہی ہے وہ لائق ستائش ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ گمنام مجاہدین آزادی پر تحقیقی کام کا آغاز ضرور ہوتا کہ ہم تاریخ کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر نئے نئے موتیوں کو نکال سکیں۔

عبدالحی کا مضمون 'اقلیتوں کی تعلیمی ترقی' معلوماتی ہے۔ اسے پڑھ کر میری معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ اقلیتوں سے متعلق ایسے مضامین ضرور شائع کیے جائیں تاکہ ہمیں زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع ملے۔

فراق گورکھپوری پر خان روشنی کا مضمون نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اُنھوں نے بڑے فن کارانہ طریقے سے فراق کی زندگی کے حالات اور شاعری کو برتا ہے۔ تاریخ سے مجھے بھی شغف ہے۔ میں نے بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، لیکن درخشاں تاجور نے اپنے مضمون 'ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں خواتین کا کردار' میں جن گمنام مجاہدین آزادی کا ذکر مع حوالہ جات کے کیا ہے اُن میں سے چند نام میری نظر سے پہلی بار گزرے۔ بہت خوب۔

جہاں تک ادب اطفال کا تعلق ہے تو یہ سچ ہے کہ اردو داں طبقہ بے حس ہے۔ فیروز بخت احمد صاحب نے ادب اطفال سے متعلق جو خدشات بیان کیے ہیں وہ اپنی جگہ بجا ہیں۔ لیکن میں پوری طرح متفق نہیں ہوں، کیوں کہ رسالے آج بھی بچوں کے لیے شائع ہو رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اردو داں طبقہ اپنے گھروں میں اپنے ہی بچوں کو اُردو نہیں پڑھاتا۔ ہم نے انگریزی کو فوقیت دی اور اپنی مادری زبان اردو کو سوتیلی ماں کا درجہ دے کر کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔

فیروز بخت صاحب نے بالکل سچ فرمایا ہے کہ آج کے مسلم بچے 'پھل' کو 'فل' اور 'پھر' کو 'فر' بولتے ہیں۔ میں اس میں مزید اضافہ کر دوں۔ آج کل ایک نیا فیشن رائج ہوا ہے، کاف (ک) کو 'ق' کے تلفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً 'کامیاب' کو 'قامیاب'، 'مخالفت' کو 'خلافت'، 'خرچ کرنا' کو 'کھرچنا' یا 'کھرچو' وغیرہ۔

رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی کے مضمون 'اردو میں بچوں کا تمثیلی ادب' کو پڑھا۔ انھوں نے بڑی خوبی سے بچوں کے تمثیلی ادب پر روشنی ڈالی ہے، کیونکہ بچے اُن کہانیوں کو خاص دل چسپی سے پڑھتے ہیں جن میں جانور، ہریالی، جن، کیڑے مکوڑے کردار کی شکل میں اُن کے سامنے آتے ہیں۔ شکیل سہسرامی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اپنا کہا۔"

❖ **پرویز اشرفی**: این 113، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

✍ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ (اگست) 2018 باصرہ نواز ہوا۔ رسالہ صوری اور معنوی لحاظ سے بہت خوب ہے۔ آپ کئی شماروں میں کسی ایک فن کار کا انٹرویو شائع کر کے ہماری معلومات میں اضافہ کرتے آ رہے ہیں۔ اس سے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی بھی ہو رہی ہے۔ اقلیتوں کی تعلیمی ترقی پر عبدالحی کا مضمون کافی جاندار ہے۔ معلومات کا موجودہ ڈاٹا دے کر اس کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ اس سے ہم زمین سے جڑے مسائل کا حل نکال سکتے ہیں۔ قومی اردو کونسل کی بہتر کارکردگی کی رپورٹ سے اقلیتی طبقے کے لوگ استفادہ کر رہے ہیں۔ دوسری کئی اسکیموں کا پتہ چلا۔

❖ **صادق جونپوری**: پرانی پارہ، شانتی نگر، بھیونڈی، مہاراشٹر

✍ 'اردو دنیا' اگست 2018 کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ ہر ماہ کی طرح یہ شمارہ بھی قابل تحسین ہے۔ مضامین بھی معیاری ہیں۔ 'گوشۂ اطفال' کے تحت جناب فیروز بخت کا مضمون 'ادب اطفال کے تئیں اردو داں طبقہ کی بے حسی' نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ فاضل مضمون نگار نے ادب اطفال کے تعلق سے جو جائزہ پیش کیا ہے وہ ایک حد تک ٹھیک اور درست ہے لیکن ہم سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ واقعی مضمون نگار نے تجاہل سے کام لیا یا پھر انھیں علم نہیں کہ ریاست مہاراشٹر سے دو انتہائی اہم رسالے 12 اور 24 برسوں سے انتہائی پابندی سے شائع ہو رہے ہیں جسے انھوں نے نظر انداز کر دیا۔

ماہنامہ 'گل بوٹے' ممبئی سے گذشتہ 24 برسوں سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے اسی طرح ماہنامہ 'گلشن اطفال' مالیگاؤں سے 12 برسوں سے شائع ہو کر پورے ملک میں پڑھا جا رہا ہے۔ قومی کونسل کئی سالوں سے اس کی متعدد کاپیاں خرید کر ملک کی منتخب لائبریریوں میں تقسیم کر رہی ہے۔ ہندوستان بھر کے مشہور و معروف نامور ادبا کی سرپرستی اور قلمی تعاون حاصل ہے۔ ادب اطفال پر لائق قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اسی طرح رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں کا نام اب محتاج تعارف نہیں رہا۔ ادب اطفال پر خدمت کرنے والے چندہ اداروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ 1300 سے زائد ادب اطفال کی کتابیں شائع کر کے کم وقت میں ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔ سبھی کتابیں انتہائی معیاری اور مشہور ادیبوں کی ہیں۔ قومی کونسل کے کتاب میلہ پروگرام میں، ممبئی، بھیونڈی، اورنگ آباد، شولاپور اور دیگر مقامات میں رحمانی پبلی کیشنز کا اسٹال بچوں کا پسندیدہ اور محبوب اسٹال رہا ہے۔ ہماری اس تحریر کا مقصد تنقید یا کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ اپنی ادبی خدمات سے قارئین کو آگاہ کرنا ہے۔

❖ **رحمانی سلیم احمد**: رحمانی پبلی کیشنز، مالیگاؤں، مہاراشٹر

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' اگست 2018 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ 15 اگست یوم آزادی کی مناسبت سے سرورق دیدہ زیب لگا۔ اسی مناسبت سے اداریہ کے ساتھ ساتھ درخشاں تاجور کا مضمون 'ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں خواتین کا کردار' اور اسما مسعود کا 'ہماری تحریک آزادی اور راجستھان کے شعرا' قابل ستائش ہیں۔ افسوس ہے کہ جس اردو نے 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ دیا اور اپنی شاعری اور مضامین سے قوم کو جگانے کا کام کیا اس زبان کو مسلم تشخص سے جوڑ دیا گیا۔ اسی طرح اقلیتی فرقے کے مجاہدین آزادی کی قربانیوں پر بھی پردہ ڈالا جا رہا ہے۔ اگست سے آفتاب اختر اور بنوی، فراق گورکھپوری اور شہریار پر سرور حسین، خان روشنی، اور ساجدہ اشتیاق کے مضامین بڑی عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں جو معلوماتی تحقیقی اور دستاویزی ہیں۔ جناب عبدالحی صاحب کی اقلیتوں کی ترقی پر رپورٹ اچھی ہے۔ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو کی کوششیں قابل ستائش ہیں۔ عائشہ خاتون نے "نشاط زندگی کا شاعر جگر" اور محمد عادل نے چکبست کے شعر کا سائنسی تجزیہ میں ان شاعروں کی شخصیت اور کارناموں پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ مصری ادیب عباس محمود العقاد 'انا' کی روشنی میں عبدالمبین ندوی کا مضمون مزہ دے گیا۔ باقی مشمولات بھی اچھے لگے۔

❖ **عبدالحی پیام انصاری**: پپر ولی بازار، ضلع گورکھپوری، یوپی

یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ آپ کے عہد ڈائرکٹری میں دیگر قابل ذکر کارناموں کے علاوہ ابھی ابھی ای۔ لائبریری ویب سائٹ اینڈ ڈیسک ٹاپ اردو بک ریڈر کا کامیاب ترین آغاز ایک تاریخی اور نا قابل فراموش کارنامہ ہے۔ اس خوش کن خبر کو ہمارا سماج پٹنہ نے فرنٹ پیج پر واضح طور پر مورخہ 15، اگست، 2018 بروز بدھ (چہارشنبہ) کو اشتہاری شکل میں شائع کیا جسے پڑھ کر خوشی ہوئی، میں سمجھتا ہوں کہ اس سے تقریباً پوری اردو آبادی باخبر ہوئی ہوگی۔ اردو دنیا کے صفحہ نمبر 74 تا 78 پر ورڈ پیڈ اینڈ ریپیڈکس کمپیوٹر کورس کی بابت بالتفصیل مضمون دیکھا جو کافی معلوماتی ہے۔ اردو کی ترقی کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا ہے ایسے ماحول میں مستقبل کا خیال کرتے ہوئے اردو کی ابتدائی تعلیم کا فروغ انتہائی ضروری ہو جاتا ہے، ہر سطح اور ہر جگہ پر اردو کی ابتدائی تعلیم کا نظم دور حاضر کا شدید ترین تقاضا ہے جس کی تکمیل لازمی ہے۔ حالانکہ یہ کام ہو بھی رہا ہے لیکن اس عمل میں تیزی لانے کی ضرورت ہے۔ اردو دنیا میں سرور حسین صاحب نے اختر اور ینوی کے افسانوں میں سماجی وطبقاتی شعور کے عنوان سے چند منفرد باتیں کی ہیں جو قابل قدر ہیں۔ قمر نقوی صاحب کو انٹرویو کے پہلے سوال کا جواب والدین کے حوالے سے دینا چاہیے تھا، گفتگو میں تعلی مزید در آئی ہے مگر جوابات استفادیاتی ہیں۔ وطن عزیز، ہندوستان، کی محبت میں لکھا گیا اداریہ حوالوں میں رکھنے کے قابل ہے۔

شکیل احمد سہسرامی: پٹنہ بہار

گلزار کے لفظوں میں ''یہ کیسا عشق ہے اردو زبان کا'' دوسال قبل آپ کے مکتب کی دہلیز پہ جو عرض کر رکھی تھی آج اسی دل کی آرزو کی تکمیل دیکھی ہے۔ بہت خوشی ہوئی اردو دنیا کا اگست 2018 کا شمارہ دیکھ کر۔ گلزار کی یادوں کے جھروکے سے خواجہ احمد عباس کی دلربا صورت دیکھنے کو ملی۔ اختر اور ینوی کے افسانوں کا مطالعہ بھی بہت خوب لکھا گیا ہے۔ جگر کی زندگی کے متعلق تحریر بہت کارگر ہے اور یہی مضامین اپنے حسن میں بھرپور ہیں۔

حبیب اوتھو: شہر قاضی احمد، صوبہ سندھ، پاکستان

اگست 2018 کا شمارہ بروقت ہمہ دست ہوا۔ آزادی سے متعلق خواتین کے کردار پر مضامین شائع ہوئے۔ وقت کا تقاضا تھا کیونکہ لوگوں کو آج بھی نہیں معلوم کہ جدوجہد آزادی میں خواتین نے بھی حصہ لیا اور ہند کو آزادی سے ہمکنار کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے جن خواتین کا ذکر کیا ہے ان میں بیگم حضرت محل، لکشمی بائی، کاشی بائی، موتی بائی، اصغری بیگم، حبیبہ رحیمی، جھانسی کی رانی، عزیزن ان کے علاوہ بھیکا جی کاما، ارونا آصف بھی، سلوتری بھائی پھولے، کستوربا، سروجنی نائیڈو، بی اماں، وجے لکشمی پنڈت سچیتا کرپلانی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہماری بات میں مدیر صاحب نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں اردو شاعری اور صحافت کے رول پر تفصیل اور دانش مندانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے اور غلامی و آزادی کے فلسفے کو پیش کیا ہے۔ قمر نقوی سے مصاحبہ فکر انگیز اور معنی خیز ہے اس میں انھوں نے بعض نئی باتوں کا ذکر کا ہے اور یہ انٹرویو ادبی معلومات جدت و ندرت پر مبنی ہے۔ عبدالحی نے اقلیتوں کی تعلیمی ترقی میں اقلیتوں سے متعلق ڈاٹا و تفصیل پیش کی ہے۔ اقلیتوں کے متعلق حکومت کی اسکیموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسلم اقلیت ہندوستان میں آج بھی تعلیمی اعتبار سے بہت پسماندہ ہے۔ دلتوں سے بھی بہت کم ہے اعلی تعلیم میں ان کا تناسب بہت کم فیصد ہے اس کے لیے غور وفکر کرنا ضروری ہے۔ اختر اور ینوی کے افسانوں میں سماجی وطبقاتی شعور ملتا ہے۔ فراق خوبصورتی کا متلاشی تنہائی کا شکار میں فراق کی شاعری کا رومانی اور سماجی تجزیہ ملتا ہے۔ فراق نے رومانی انداز میں سماجی شعور کو پیش کیا ہے۔ یار شہریار میں شہریار کی شاعری فکر وفن کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی میں خواتین کا کردار نئی نسل اور اردو دنیا کے قارئین کے لیے بہت عمدہ مضمون ہے۔ ہماری تحریک آزادی اور راجستھان کے شعرا میں ریاست راجستھان کے شعرا کی خدمات اور کارناموں پر گفتگو کی گئی ہے۔ عائشہ خاتون کا مضمون بھی متاثر کرتا ہے۔ محمد عادل نے برج نرائن چکبست کے شعر کا سائنسی تجزیہ پیش کیا ہے جو منفرد ہے۔ ادب اطفال کے تحت جو مضامین ہیں وہ خوب ہیں لیکن ادب اطفال آج کے دور میں بہت کم لکھا جارہا ہے۔ بچوں کی طرف ہمارا معاشرہ توجہ نہیں دے رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: سابق پرنسپل ڈگری کالج موڑتاڑ، تلنگانہ

'اردو دنیا' اگست 2018 جشن آزادی کی سوغات لیے جلوہ افروز ہے۔ ایک شمارہ کے مطالعہ کے بعد قاری بڑی بے چینی سے اگلے شمارے کا منتظر رہتا ہے۔ جناب مناظر عاشق ہرگانوی نے کوئی انیس سوالات پر مبنی انٹرویو لیا ہے۔ کسی شخص کو خاطر خواہ پذیرائی حاصل نہ ہو تو مجبوراً وہ خودستائی پر اتر آتا ہے۔ اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے سلسلے میں قومی مانیٹرنگ کمیٹی کی مئی 2018 میں منعقدہ ایک نشست کی روداد (ص 11 تا ص 14) کو ڈاکٹر عبدالحی نے بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ انھوں نے اقلیتوں کے آئینی استحقاق کے ساتھ ساتھ اُن کی آبادی کا بھی احاطہ کیا۔ پھر اقلیتی کمیشن اور وزارت برائے اقلیتی امور کی جانب سے روبہ عمل لائے جانے والے مختلف ترقیاتی پروگراموں، اسکیموں اور لسانی ترقی کے لیے مختلف ادارہ جات کے قیام جیسے کارناموں کی طویل فہرست پیش کی۔ یہی نہیں، بلکہ اقلیتوں کے کامل تحفظ کے لیے حکومت نے جو خاطر خواہ انتظامات کیے، وہ بھی جتادیے گئے ہیں۔ اس نشست میں تعلیم وتربیت سے وابستہ ملک کے منتخب ماہرین نے اپنی تجاویز پیش کیں اور نشست کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ بہرکیف اس روداد کا ہر لفظ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ گلزار صاحب نے اپنے ہم پیشہ خواجہ احمد عباس صاحب کا خاکہ (ص 15) کھینچا ہے اور بہت خوب کھینچا ہے۔ یوں تو آئے دن کے -اے عباس پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، پر گلزار صاحب کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ان کی باتوں میں اپنائیت اور صداقت ہوتی ہے کہ دل ہر بات تسلیم کرنے پر آمادہ ہوجاتا ہے اور اس سے حظ بھی اُٹھاتا ہے۔ مضمون کے اختتام پر بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ کاش یہ بیان جاری رہتا۔ فراق کا کلام اور شخصیت جن اوصاف سے متصف ہیں انہیں خان روشنی (ص 22) نے جس عمدگی سے بیان کیا ہے کوئی کیا بیان کرے گا۔ انہوں نے خوشی اور غم کو باہم سمودیا ہے۔ طلبہ کو اس مضمون میں ادب وآداب کی سلوٹیں بشرط مطالعہ کھلتی ہوئی ملیں گی۔ ہماری جدوجہد آزادی پر بھی ص 28 اور ص 31 پر اچھے مضامین شامل ہیں۔ فراق کے علاوہ فکر وفن سے متعلق ص 25 پر خلیل الرحمٰن اعظمی، ص 34 پر جگر مرادآبادی، ص 36 پر چکبست، ص 44 پر الطاف حسین حالی، ص 55 پر عباس مسعود، ص 58 پر شیخ سعدی اور ص 65 پر آل احمد سرور سے متعلق اچھے مضامین درج ہیں۔ ان کے علاوہ بچوں کے ادب کو بھی شامل شمارہ کیا گیا ہے۔ لیکن کمپیوٹر کورس پر حسب سابق انتہائی اہم مضمون (ص 74) ورڈ پیڈ شامل ہے۔ تبصرہ وتعارف کے تحت کوئی دس عنوانات پر تنقیدی تبصرے شامل ہیں اور اخیر میں کونسل کی سرگرمیوں کا معلوماتی خبرنامہ دیا گیا ہے اور کیا چاہیے۔

'اردو دنیا' جولائی 2018 اپنی آن بان کے ساتھ جلوہ گر ہے اور علم وآگہی کا ایک خزینہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے روایتی دلنشیں نہج میں مرحوم فضیل جعفری پر مضمون لکھ کر انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ فضیل جعفری گورنمنٹ کالج اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے۔ ان میں وہی بیباکی، خودداری اور جرأت جیسے اوصاف تھے جن کا ذکر پروفیسر

عتیق اللہ نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ کیا زمانہ تھا اور کیسے گزر گیا۔ کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ علمی اور ادبی ذوق (ص 11) میں محض خودستائی پڑھنے کو ملی۔ گوہر جان پر لکھا گیا مضمون (ص 27) نہایت حسین و دلنشین اور پاکیزہ ہے۔ اس میں مصنف کا انداز بیان بھی کمال کا ہے۔ خورشید آرا بیگم پر دیا گیا مضمون (ص 29) اگر 'خواتین دنیا' میں دیا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا، لیکن مضمون اچھا ہے۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی غالباً 'آجکل' کے شعبہ ادارت سے وابستہ ہیں۔ ان کے مضامین اکثر دل خوش کن ہوا کرتے ہیں مگر قاضی سلیم پر لکھا گیا مضمون (ص 31) عالمانہ اور سنجیدہ ہے کیونکہ موضوع کا تقاضا یہی ہے۔ مسعود جامی نے ص 35 پر اردو افسانے کے رجحانات کے تغیر و تبدل کو بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ بتدریج پیش کیا ہے۔ داستان امیر حمزہ کی مختلف اشاعتوں پر مضمون ص 42 پر دیا گیا ہے۔ اس میں اس داستان کے ارتقاء کی تین منزلیں بتائی گئی ہیں۔ پہلی اور دوسری فارسی زبان میں اور تیسری منزل اردو زبان میں۔ اس طرح تو اردو میں اس کے ارتقاء کی ایک ہی منزل ہوئی۔ قطع نظر اس کے یہ بڑی محنت سے تحریر کردہ تحقیقی مگر دلچسپ مضمون ہے اور انڈر گریجویٹ اور پی جی طلبہ کے لیے مفید ترین ہے۔ اس سے ضرور استفادہ کریں۔ ص 49 تا ص 56 تک خواجہ احمد عباس سے متعلق طویل ادبی مقالہ دیا گیا ہے لیکن مصنف نے اس میں دلچسپی اور دلجمعی برقرار رکھتے ہوئے قابل قدر معلومات فراہم کیں۔

منظر کمال نے انشائیہ پر بہت خوب مضمون تحریر کیا ہے۔ اگر اس مضمون کو انشائیہ پر ہی لکھے ہوئے محمد آدم کے مضمون (فکر و تحقیق۔ اپریل-جون 2018، ص 148) کے ساتھ پڑھا جائے تو انشائیہ پر کامل معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔ اردو دنیا نے یہ قابل تعریف کارنامہ انجام دیا کہ کمپیوٹر سے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد ہر شمارہ میں طلبہ کو فراہم کیا جاتا ہے۔ تبصرہ اور تعارف کے تحت کوئی پندرہ کتابوں کی افادیت سے واقف کرایا گیا ہے (ص 76 تا 85) خبر نامہ (ص 86) کے ذیل میں قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل ہوئی۔

بہرکیف یہ شمارہ اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے قارئین کے روبرو علم کا خزینہ بکھیرے ہوئے ہے۔

✤ **مصطفی ندیم خاں غوری**: زرّین ولا، اورنگ آباد، مہاراشٹر

✍ جولائی 2018 کا تازہ شمارہ نظر سے گزرا۔ خصوصی مطالعہ میں 'نگارشات خواجہ احمد عباس کی بازیافت' (حقانی القاسمی) سخنوروں کے قلب و جگر کے گوشے میں لہراتی

ہوئی ندی کی طرح ہے۔ بلاشبہ خواجہ احمد عباس نے اپنے کالم کے ذریعے سماجی اور سیاسی شعور کو بیدار کرنے کا جو کام عالمی سطح پر کیا ہے اسے دور حاضر کا معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ میری نظر میں حقانی القاسمی کا تیشۂ فکر ارباب فکر و نظر کے لیے انداز زلیخائی سے کسی طور کم نہیں ہے۔ 'اردو گیت کا سفر بحوالۂ پنجاب' (ندیم احمد ندیم)، لمحات کے سفر کو طول دینے کے لیے کافی ہے۔ شخصیات، نقد و نگاہ اور زبان و تعلیم ماہنامہ 'اردو دنیا' کے صفحات پر ایسا ہی ہے جیسے کوئی لاشہ جاگ اٹھا ہو۔ خدا کرے 'اردو دنیا' راہ اردو کے پیچ و خم اسی طرح سنوارتی رہے۔

✤ **نسیم اختر نسیم**: پرنٹ ہٹ، واسع پور، دھنباد، جھارکھنڈ

✍ جون کا شمارہ اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ باصرہ افروز ہوا۔ اداریہ میں دور افتادہ و پسماندہ علاقوں میں چھپی صلاحیتوں کی جستجو پر آپ کا نکتۂ نظر قابل فکر و عمل ہے۔ ترجمہ اور اردو زبان ادب کے تعلق سے جناب اسلم مرزا کا انٹرویو مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے، 'علامتی افسانہ: تحقیقی مضمرات' فکر و فن کے دریچوں کو وا کرتا ہے، جدید تکنیک سے اردو کو ہم آہنگ کرنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں اس کا ایک اہم عکس ہمیں اے ایم صدیقی کے مضمون 'اردو مشینی ترجمے کا آغاز وارتقا' میں نظر آتا ہے" اردو قارئین میں کتب بینی اور مطالعے کے شوق کو فروغ دینے کے لیے شہر شہر اور نگر نگر آپ کا جو کارواں کتاب میلہ کے نام سے گامزن ہے، اس بار اس کی جھلکیاں 'کشن گنج کتاب میلہ' میں دیکھنے کو ملیں۔ درحقیقت اس شمارے میں علم اور تحقیق کے سمندر کو آپ نے کوزے میں بند کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ قابل ستائش ہی نہیں قابل تقلید بھی ہے، اردو میں اس قسم کے معیاری رسالوں کی بڑی قلت ہے، ہم تقریباً ایک دہائی سے اس رسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ اتنے دنوں کے مطالعہ نے اردو زبان و ادب کے تعلق سے ہماری معلومات میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ خاص طور سے اس میں شائع انٹرویوز اور تبصرے کافی اہم ہوتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ بغیر اصل کتاب پڑھے ہی پوری کتاب کا لطف حاصل ہو گیا۔

✤ **اسدالرحمن تیمی و علیم الدین تیمی**: جامعہ امام ابن تیمیہ، مدینۃ السلام، مشرقی چمپارن، بہار

✍ 'اردو دنیا' جون کے شمارہ میں بائیسویں کل ہند کتاب میلہ کشن گنج کی تمہید میں اداریہ میں لکھا ہوا آپ کا یہ جملہ "ہمیں دیہی علاقوں میں چھپی ہوئی صلاحیتوں اور ذہانتوں کی جستجو کرنی چاہیے،" بہت پسند آیا، ایسا اس لیے نہیں کہ بندہ بھی ایک دیہات کا باشندہ ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر شہروں کے مقابلے میں دیہی علاقوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح ڈاکٹر کرشن بھاوک صاحب کا مراسلہ اچھا لگا، اس شمارے میں شامل 'کشن گنج کتاب میلہ' کی مفصل روداد؛ جسے ڈاکٹر توقیر راہی صاحب نے ترتیب دیا ہے، بہت معلوماتی اور مفید ہے، ان کا انداز تحریر خاص طور پر پسند آیا۔ ڈاکٹر راہی صاحب نے کشن گنج اور سیمانچل کے تعلق سے پورے علاقہ کا ادبی تعارف کرا کر اردو والوں پر بڑا احسان کیا ہے، اس قسم کے تعارف سے گذشتہ اور موجودہ پوری ادبی صورت حال سامنے آجاتی ہے۔ محترمہ ممتحنہ اختر کا مقالہ شبلی کی ہیئت پسندی پر بہت معیاری ہے، اس سے بہت کچھ سیکھنے کو مل جائے گا، محترم فہیم اشرف اور آس محمد صدیقی کا مضمون بھی بہت اچھا لگا، اس آپ نے ماحولیات سے متعلق اچھے مضامین شامل کیے ہیں۔

جولائی 2018 میں محترم شمیم طارق صاحب کا لیا گیا انٹرویو جناب محمد انصر کے ذریعے بہت معلوماتی ہے، محمد انصر نے سوال کے جواب پر پھر سوال قائم کرکے اپنی صلاحیت کا اعتراف کرایا ہے جس سے قارئین کی دلچسپی برقرار رہی۔ 'بھٹکل کی موجودہ ادبی صورت حال' جناب شاہ رشاد عثمانی صاحب کا شائع کیا ہے، میرا خیال ہے کہ اس طرح کے دوسرے علاقے کے لیے دیگر مضامین کی بھی ضرورت ہے، مثلاً کسی بھی ضلع کا ادبی تعارف ہر ماہ پیش کیا جائے جس سے وہاں کا ادبی منظر نامہ قارئین کے سامنے آجائے۔

✤ **انصار احمد معروفی**: پورہ معروف، مئو، یوپی

■

ہمایوں اشرف

صلاحیت نہیں سفارشات پر ملتے ہیں انعامات

ظہیر صدیقی

انٹرویو

سرزمین بہار سے تعلق رکھنے والے ظہیر صدیقی کی شخصیت ادبی دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کا شمار 1960 کے بعد ابھرنے والے جدید شاعروں کے ہر اول دستے میں ہوتا ہے۔ خالق کائنات نے انہیں لطف سخن اور طبع سلیم کی ایسی دولت سے نوازا ہے جو بہت کم لوگوں کے نصیب میں ہوتی ہے۔ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں ان کے لکھنے پڑھنے اور چھپنے کی رفتار تیز تھی۔ ملک کے مقتدر رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا اور تقریباً شعری تخلیقی مضامین میں ان کے نام اور کام کی گونج سنائی دیتی تھی۔ وہ اردو کے جدید لہجے کے ہر اول دستے میں اپنی منفرد آواز اور فکری عمق سے بطور خاص پہچانے جاتے تھے۔ پھر مذہبیات کی طرف اس طرح مائل ہوئے کہ ادبی منظر نامے سے کنارہ کش ہو گئے۔ گزشتہ چند سالوں سے پھر ان کی نظمیں اور غزلیں ہندو پاک کے مقتدر رسائل و جرائد میں اشاعت پزیر ہونے لگیں۔ان کے کلام کے تین مجموعے 'ماسوا' (1976)، 'مدعا' (1983) اور 'روشن ورق ورق' (2009) شائع ہو چکے ہیں۔ پیش ہے ان سے ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا لیا گیا انٹرویو

ہمایوں اشرف: اپنی ابتدائی زندگی، تعلیم اور خاندانی پس منظر کے بارے میں تفصیل سے بتائیں؟

ظہیر صدیقی: ضلع رہتاس کے بکرم گنج سے ڈمراؤں جانے والی سڑک پر ایک گاؤں بھنول ہے جو اب ترقی کر کے قصبے کی صورت اختیار کر گیا ہے، وہیں میری پیدائش ہوئی۔ میرے والد مولانا سمیع الدین صدیقی حافظ، عالم، خطیب و قاری چکردھر پور (جھارکھنڈ) میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ میرے چچا مولوی معزالدین صاحب نے مجھ کو اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا اس لیے میرے والد صاحب مجھ کو ہندوستان میں چھوڑ کر اپنے معتقدین کے اصرار پر بنگلہ دیش (سابق مشرقی پاکستان) 1948 میں چلے گئے۔ 1950 میں انھوں نے حج بیت اللہ کا قصد کیا لیکن بمبئی پہنچ کر شدید علیل ہو گئے۔ مجبوراً بنگلہ دیش واپس لوٹائے گئے اور وہیں انھوں نے وفات پائی۔ میں اس وقت 14 برس کا تھا اور چچا کی نگرانی میں کواتھ ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھا۔

میری ماں کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا جب میں دو برس کا تھا۔ دو برس کے بچے سے صرف ماں کا دودھ چھڑانے کا حکم ہے مگر قدرت نے اس عمر میں ماں کی گود چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ والدہ چکردھر پور میں پیوند خاک ہوئیں۔

جب ہمایوں نے ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کیا اور شیر شاہ کی موت ہوئی تو شیر شاہ کے دربار میں درس و تدریس پر مامور کچھ شیوخ و سادات ہمایوں کی فوج سے خائف ہو کر اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے سون ندی کے پچھم اور پورب کے اطراف میں متمکن ہوئے۔ ہمارے بزرگوں میں سب سے پہلے (برہمنوں کی بستی بھنول میں) جنہوں نے قدم رنجہ فرمایا ان کا نام شیخ بہرمند ہے، شیخ بہرمند کی واحد اولاد نرینہ سے آٹھ (8) اولادیں ہوئیں۔ ان کی پہلی اولاد شیخ کریم بخش کی بیٹی میری دادی ہوئیں اور ان ہی کی تیسری اولاد شیخ خورشید کے پہلے بیٹے شیخ حمیدالدین میرے دادا ہوئے۔ میری پیدائش سے بہت پہلے میرے دادا کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے دو بیٹے شیخ معزالدین احمد اور میرے والد اور دو بیٹیاں اللہ نے عطا کیے۔ میری دادی نے ماشاءاللہ کافی عمر پائی۔ جب میں میٹرک میں تھا تو سو (100) سال سے اوپر کی عمر میں انتقال ہوا۔ میری دادی نے میری پرورش کی۔

میری عمر چھ سال کی تھی تو والد صاحب مجھ کو اپنے ہمراہ گاؤں سے چکردھر پور لے گئے اور ایک پرائمری اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ لیکن دو سال کے بعد دوسرے درجے کا امتحان دے کر جب چھٹیوں میں گاؤں واپس ہوا تو گاؤں کا ہی ہو کر رہ گیا۔ میرے چچا نے میرا امتحان لیا اور میرے پروگریس سے غیر مطمئن ہوئے اور انھوں نے میرا داخلہ اپنی نگرانی میں گاؤں کے اپر پرائمری اسکول میں کروا دیا جہاں مجھے یہ فائدہ ہوا کہ پانچویں کلاس بورڈ کے امتحان میں سب ڈویژن بھر میں اول آیا اور ماہانہ وظیفہ پایا۔ وہاں دوسری طرف گاؤں کو یہ فائدہ ہوا کہ اپر پرائمری اسکول مڈل اسکول بن گیا۔

کواتھ ہائی اسکول ضلع رہتاس سے 1954 میں میٹرک پاس کیا اور پٹنہ چلا آیا۔ اس زمانے میں بھی پٹنہ سائنس کالج میں داخلہ آسان نہیں تھا۔ بہت سے فرسٹ ڈویژن میٹرک پاس لڑکے بھی منھ دیکھتے رہ جاتے تھے۔

بہرحال پٹنہ سائنس کالج نے میرے داخلے کی منظوری تو دے دی لیکن میں والد صاحب کی وفات اور خاندانی ترکے سے محجوب ہو جانے کی وجہ سے سائنس کالج میں داخلہ نہیں لے سکا۔ شارٹ ہینڈ اور ٹائپ سیکھنے لگا۔ اگر چہ 18 برس سے کم عمر والوں کو سرکاری ملازمت نہیں ملتی ہے لیکن تحریری مقابلہ میں اوّل آنے کی وجہ سے ساڑھے سترہ برس کی عمر میں جولائی 1955 میں پٹنہ میڈیکل کالج ہسپتال میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ ملازمت کے دوران ہی 1959 میں بہار یونیورسٹی سے آئی.اے. پاس کیا اور پھر جب 1961 میں بی.اے. آنرز (اردو) کے امتحان میں شامل ہونے والا تھا کہ بہار یونیورسٹی اپنا بوریا بستر باندھ کر ''گرہ میں گریباں کے تار تار لیے'' پٹنہ سے اپنا دفتر اٹھا کر مظفر پور لے گئی۔ پٹنہ، آرہ، گیا اور پٹنہ کے کچھ کالج مگدھ یونیورسٹی کے تحت ہوگئے۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ مگدھ یونیورسٹی ابھی کاغذی اسٹیج میں تھی لہٰذا اس کے طلبا بے یار و مددگار ہوگئے۔ بہرحال پٹنہ یونیورسٹی کو ترس آگیا اور اس نے اپنی یونیورسٹی کے طلبا کے علاوہ مجوزہ مگدھ یونیورسٹی کے طلبا (بحیثیت نن کالجیٹ) کے امتحان کی ذمہ داری قبول کر لی۔ 1961 میں بی.اے. آنرز (اردو) میں ٹاپ کیا۔ دوستوں نے مبارک باد دی۔

اخبار میں تصویر چھپی۔ میرے نام کے ساتھ میرے گاؤں کا نام بھی شائع ہوا۔ گاؤں کے لوگ خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ جلسۂ تقسیم اسناد میں شامل ہوا، یہ امید لیے کہ گولڈ میڈل ملے گا لیکن طلائی تمغہ ایک اور ٹاپر دو! ظاہر ہے پٹنہ یونیورسٹی اپنے ٹاپر کو کیسے فراموش کر سکتی تھی۔ مجھ کو طلائی تمغہ سے محروم ہونا پڑا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد 1959 سے 1964 تک کے وقفے میں پرائیوٹ طور پر سارے امتحانات پاس کیے۔ خواہش تھی کالج کی لکچرری۔ ایسی بات نہیں کہ اس کے مواقع نہیں ملے۔ ایم.اے. پاس کرنے کے فوراً بعد سہیل عظیم آبادی نے لوہاردگا کالج جوائن کرنے کے لیے منتخب کیا لیکن ال.آئی.سی. کی ملازمت میں میری تنخواہ زیادہ تھی اور میں کم تنخواہ پر کالج جوائن کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہی رکاوٹ اس وقت بھی پیدا ہوئی جب مگدھ یونیورسٹی کے اس وقت کے V.C. ڈاکٹر نرمدیشور پرشاد نے لکچرر شپ کا آفر دیا۔ کلام حیدری نے ان سے پوچھا: ''آپ ان کو تنخواہ کیا دیں گے؟'' اچھا تو یہ already settled ہیں کہہ کر ڈاکٹر صاحب بھی خاموش ہوگئے۔ یہی سب رکاوٹیں تھیں جن کی وجہ سے میں نے پوری زندگی معمولی عہدے پر گزاری اور 1998 میں ال.آئی.سی. کی ملازمت سے سبکدوش ہوا۔

ا: اپنے آغازِ سخن کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ظہیر صدیقی: 1960 لکھنؤ سے ایک ماہنامہ 'شمع ادب' شائع ہوا کرتا تھا جس میں مبتدی شعرا کے لیے ایک گوشہ وقف تھا اور اصلاحِ سخن جناب فراق گورکھپوری فرمایا کرتے تھے۔ میں نے اپنی اکلوتی غزل (جس کا کوئی شعر میرے ذہن میں نہیں اور نہ وہ رسالہ ہی دستیاب ہے) اس ماہنامہ کو بھیجی جو اپریل 1960 کے شمارہ میں شائع ہوئی اور جس نے فراق صاحب سے داد تحسین وصول کی۔ لیکن باضابطہ شاعری کی ابتدا 1962 سے ہوئی۔ پہلی غزل ؎

'حضور حسن شب غم کا ماجرا کہیے
غرور حسن سے روداد نارسا کہیے

'شاعر' بمبئی مارچ 1962 کے شمارہ میں شائع ہوئی جس کو 'جائزۂ ڈائجسٹ کراچی (مدیر: وسیم فاضلی) نے منتخب کیا۔

اب تو چھپنے چھپانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ 'شمع' دہلی میں متعدد غزلیں اور 'شاعر' بمبئی میں متعدد آزاد نظمیں شائع ہوئیں۔

ایک بات کی وضاحت کردوں کہ مجھے شعوری طور پر ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ 'شاعر' میں چھپنے والی میری پہلی غزل غالب کی زمین میں ہے۔ بعد میں 'دیوان غالب' کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کا اندازہ ہوا جس کو میں نے غالب صدی کی ایک شعری نشست میں غالب کے ایک مصرعہ پر تضمین کر کے نذر غالب بنا کر پیش کیا۔

ایم.اے. (اردو) 1961-63 کا سیشن پٹنہ یونیورسٹی کا سنہری دور تھا۔ بہار کی دو پرانی یونیورسٹیوں اور تین نئی یونیورسٹیوں کے پانچ ٹاپرس تھے۔ مگدھ یونیورسٹی کا ٹاپر (Topper) میں تھا لیکن ملازمت کی وجہ سے پٹنہ یونیورسٹی ایم.اے. میں داخلہ نہیں لے سکا، بقیہ چار نے داخلہ لیا۔ میں ایم.اے. میں داخلہ تو نہیں لے سکا لیکن شعر و ادب سے گہرے تعلق کی بنا پر میرا اٹھنا بیٹھنا یونیورسٹی کے ذہین طلبا خصوصاً ظفر اوگانوی، لطف الرحمٰن (سابق شہاب شمسی) قمر اعظم ہاشمی اور علی حیدر ملک کے ساتھ رہا۔ ہم لوگوں کی مشترکہ کوششوں سے یونیورسٹی کے باہر ایک ادبی ادارہ کا قیام عمل میں آیا لیکن بعد میں اصولی اختلاف کی بنا پر ادارہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ ویسے یہ اختلاف شعر و ادب کے لیے نیک فال ثابت ہوا۔ دونوں اداروں 'ادارۂ فنکار' اور 'حلقۂ فکر و فن' نے شعر و ادب کے میدان میں بہتر کارکردگی کے لیے اپنی کوششیں تیز کردیں۔ نتیجتاً دونوں نے خوب صورت انتخابات شائع کیے۔ میں جس ادارہ سے منسلک تھا اس کا نام 'ادارۂ فنکار' تھا۔ اس کا صدر میں منتخب ہوا۔ نائب صدر علی حیدر ملک ہوئے اور جنرل سکریٹری کا فریضہ ظفر اوگانوی کے سپرد ہوا۔ 'ادارۂ فنکار' نے 'پرتو' کے نام سے نومبر 1962 میں اپنا پہلا انتخابی مجموعہ شائع کیا جس میں نو آموز اور مبتدی شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات شامل ہوئیں۔ تقریظ ڈاکٹر اختر اورینوی نے لکھا اور جن اکابرین نے اپنے تاثرات سے نوازا ان کے اسمائے گرامی ہیں علامہ جمیل مظہری، پروفیسر سید حسن، جناب سہیل عظیم آبادی، جناب مظہر امام، پروفیسر سید علی حیدر نیر، جناب وہاب اشرفی اور جناب فرحت القادری۔

ا: اس وقت کے حالات اور رجحانات کیا تھے؟

ظہیر صدیقی: جدیدیت سر ابھار رہی تھی۔ ترقی پسندی میں اعتدال آگیا تھا۔ پروپگنڈہ اور نعرہ بازی ختم ہو گئی تھی۔ فیض، مخدوم محی الدین اور ان ہی جیسے دوسرے شعرا کا بول بالا تھا۔ مجروح سلطان پوری نے ایسے اشعار سے توبہ کر لی تھی۔

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح
وہ سرزمین ستارے جسے سلام کریں

ان کی نگاہ بدل گئی تھی۔

ملی جب ان سے نظر بس رہا تھا ایک جہاں
ہٹی نگاہ تو چاروں طرف تھے ویرانے
نگاہ ساقی نامہرباں یہ کیا جانے
کہ ٹوٹ جاتے ہیں خود دل کے ساتھ پیمانے

کھلے جو ہم تو کسی شوخ کی نظر میں کھلے
ہوئے گرہ تو کسی زلف کی شکن میں رہے
مجھے نہیں کسی اسلوب شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مری سخن میں رہے

میں نے اپنے مضمون 'فیض کی نظریاتی شاعری فن کے نقطہ نظر سے' میں مجروح سلطان پوری کے ایسے اشعار پر اعتراض کیا تھا۔

لال سویرا اس دنیا میں سب کا سہارا ہو کے رہے گا
ہو کے رہے گی دھرتی اپنی دیش ہمارا ہو کے رہے گا

تو مجروح سلطان پوری نے اپنی کتاب 'غزل' مطبوعہ 1970 ''ظہیر صدیقی کے لیے۔ حق بحق دار رسید دستخط مجروح سلطان پوری 24 جون 1972 مرحمت فرمائی تھی۔ میں ان کی اعلیٰ ظرفی اور خوش خلقی کا قائل ہو گیا۔ اسی کتاب کے پیش لفظ 'مطلع عرض کرنے سے پہلے' میں یہ چند سطور قابلِ داد ہیں:

''جدید شاعروں کے ہاتھوں پرانے پودے میں نئی کونپل پھوٹ رہی ہے اور وہ ہے شعری لہجے کا ایک اور نیا پن۔ اگر اس کی آبیاری سب وشتم کے بجائے خون جگر سے ہو سکی، اس لہجے کو صحیح معانی مل سکے اور ان کے پاؤں کے نیچے زمین بھی رہی تو کچھ دنوں بعد عجب نہیں کہ ان کے سامنے ہمیں اپنی شاعری کی زبان پرانی معلوم ہونے لگے۔ لیکن اکثر و بیشتر مشاعروں کے موجودہ رویے کو دیکھتے ہوئے مستقبل قریب میں یہ خیال حقیقت بنتا نظر نہیں آتا۔''

آج مجروح زندہ ہوتے تو جدید شاعروں کے مثبت رویے کو دیکھ کر اپنے آخری جملے کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ دراصل فکر و فن اور اس کے اسلوب اظہار میں تبدیلی اپنے آغاز میں بالعموم بیشتر لوگوں کے لیے ناقابل قبول ہوتی ہے، وہ اس لیے کہ تبدیلی اپنے شروعاتی دور میں افراط و تفریط کی شکار ہوتی ہے۔ Anti thesis جو ناقابل قبول ہونے کے باوصف چند برسوں کے بعد Thesis میں بدل جاتی ہے اور قبولیت حاصل کر لیتی ہے۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ جب ترقی پسندی اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی اور جدیدیت پر پُرزے نکال رہی تھی اس وقت بھی ہمارے مشاہیر شعرا (مثلاً فراق، فیض، جمیل مظہری، مجروح، قتیل شفائی، مخدوم، جاں نثار اختر، حسن نعیم، منیر نیازی وغیرہم) کی دھوم مچی تھی۔ نہ وہ کٹر ترقی پسند تھے اور نہ جدیدیت کے حامی بلکہ روایت کا احترام کرتے ہوئے اپنی گوارا جدت طرازی اور ندرت اظہار کے لیے مشہور و معروف تھے۔

● ا: آپ نے شاعری کو ہی کیوں اپنا ذریعۂ اظہار بنایا؟ نثر نگاری پر کیوں توجہ نہیں دی؟

ظہیر صدیقی: شروعات تو نثر نگاری ہی سے ہوئی۔ 1961 میں بی۔اے۔ آنرز کے امتحان کے ایک پیپر میں 50 نمبروں کا ایک مضمون لکھنا تھا۔ میں نے 'فیض احمد فیض کی شاعری' عنوان کو منتخب کیا اور تشفی بخش مضمون لکھ گیا۔ امتحان ختم ہونے کے بعد میں نے فیض احمد فیض کی نظریاتی شاعری (فن کے نقطۂ نظر سے) مضمون لکھا جو 'شاعر' بمبئی جولائی 1963 کے شمارہ میں شائع ہوا اور پھر وسیم فاضلی کی ادارت میں نکلنے والے 'جائزہ' ڈائجسٹ کراچی نے اشاعت کے لیے منتخب کر لیا۔ میرا یہ مضمون کافی مقبول ہوا۔ لیکن اس مضمون کی اشاعت سے پہلے بے اختیارانہ ایک غزل ہو گئی۔ مجھے اس وقت ذرا بھی احساس نہیں تھا کہ یہ غزل غالب کی زمین میں ہے۔ بعد میں غالب صدی منائے جانے والی ایک نشست میں غالب کے ایک مصرعہ پر تضمین کر کے اسے نذر غالب بنا کر پیش کیا۔ بہر کیف میری یہ پہلی غزل 'شاعر' بمبئی مارچ 1962 کے شمارے میں شائع ہوئی۔ ویسے جہاں تک نثر نگاری کی بات ہے میں نے متعدد مضامین (تنقیدی)، تبصرے، کتابوں پر دیباچے لکھے ہیں جو ایک مجموعہ کی شکل میں یکجا کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن شاعری کا نشہ اتنا سرور انگیز اور سکون بخش ہوتا ہے کہ جو شاعر اس کے جال میں پھنس گیا تو پھنس گیا۔

● ا: آپ کے نزدیک شاعری کے لیے بنیادی شرائط کیا ہیں؟ آپ کے نظریۂ فن کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔

ظہیر صدیقی: موضوع یعنی زندگی کا تجربہ شاعری نہیں بلکہ شاعری کا محرک ہے۔ زندگی کے تجربات خام مواد ہیں جو ٹھوس پیکروں (Concrete images) کے ذریعہ ذہن تخلیق کو مہمیز کرتے ہیں اور فی بطن شاعر حسی پیکروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہ حسی پیکر ایک منضبط جہان معنی کو تشکیل دینے سے قاصر رہتے ہیں تو تجریدیت اور بہت حد تک لایعنیت اور مجہولیت کو جنم دیتے ہیں اور اس طرح فن پارہ چیستاں بن کر رہ جاتا ہے۔ شاعر محض فنکار نہیں بلکہ وہ اپنے فن کا ناقد بھی ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ حسی تجربات سے منضبط ہو کر ایک نئے جہان معنی کو تشکیل دے سکے ہیں یا نہیں۔

تخلیق فن بلاشبہ داخلی عمل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مواد خارج سے حاصل ہوتے ہیں لیکن خارجی عوامل فی بطن شاعر داخلیت میں کچھ اس طرح تحلیل ہو جاتے ہیں کہ من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔

خارج سے داخل اور پھر داخل سے خارج دراصل 'جوہر' اور 'عرض' کے مابین صفا اور مروہ کا دو چکّر ہے۔

جوہر۔ قائم بالذات ہے۔

عرض۔ قائم بالغیر ہے۔

زندگی کے تجربات اپنی اولین شکل میں 'جوہر' ہیں اور ٹھوس پیکر 'عرض' ہیں۔ ٹھوس پیکر جب شاعر کے حسی تجربے سے گزرتے ہیں اور ایک جہانِ معنی پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں تو 'جوہر' میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ حسی تجربہ جو 'جوہر' بن چکا ہے۔ اسی کا اظہار 'عرض' ہے جو شاعر کے ہونٹوں یا صفحۂ قرطاس پر آ کر جوہر بن جاتا ہے۔

کلاسیکی دور اور ترقی پسند دور سے لے کر آج تک ایسے شعرا کی کمی نہیں جو زندگی کے تجربات کو بغیر حسی

تجربات بنائے من وعن اوزان و بحور میں قید کر کے خوش ہوتے رہے ہیں۔ ایسی شاعری کو شاعری نہیں کہہ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ منظوم بیان کہہ سکتے ہیں۔

• ا: کیا شاعری میں شاعر کے موقف حیات یا نظریے کے عمل دخل کے آپ قائل ہیں؟

ظہیر صدیقی: ہاں! اگر شاعر چاہے تو اپنا کوئی موقف حیات یا نظریہ پیش کرسکتا ہے لیکن اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ کسی نظریہ کی تبلیغ پر مامور نہیں ہے، بلکہ وہ شاعری پیش کرنا چاہتا ہے۔ شاعری کسی نظریے کی تبلیغ کے لیے نہیں۔ نظریہ خام مواد ہے اس کو شاعری بننے کے لیے احساس کی منطق سے گزرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر اقبال کا ایک مصرعہ ہے۔ خودی کا سرنہاں لا الہ الا اللہ۔

یہاں اقبال کا اصل مقصد کلمہ کی تبلیغ نہیں بلکہ انسان کی خودی، انفرادیت اور عظمت کی پہچان کے لیے کلمہ کا سہارا لیا گیا ہے۔ اگر انسان اپنی عظمت و انفرادیت کا جویا ہے تو اس کو کسی ایک کا ہو کر رہنا ہے نہ کہ کروڑوں معبودوں کا۔ اسباب کی پرستش ذلت کی موجب ہے۔ مُسبّب الاسباب کی پرستش میں انسان کی عظمت و عزیمت پوشیدہ ہے۔

• ا: آپ نے شعوری یا غیر شعوری طور پر سب سے زیادہ کس شاعر کا اثر قبول کیا؟

ظہیر صدیقی: شعوری طور پر کسی شاعر کا نہیں۔ لیکن چونکہ میری پہلی غزل لاشعوری طور پر غالب کی زمین میں ہوئی تھی اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ لاشعوری طور پر میں نے غالب کا اثر قبول کیا۔

• ا: کلاسیکی شعرا میں کس شاعر کو آپ زیادہ پسند کرتے ہیں؟

ظہیر صدیقی: میں شاعر سے زیادہ شاعری پر توجہ دیتا ہوں۔ اس طرح بہت سے کلاسیکی شعرا مثلاً میر، درد، سودا، انیس، آتش، غالب، مومن وغیرہ کے یہاں متعدد اچھے اشعار ملتے ہیں۔ اس لیے سارے کلاسیکی شعرا کی شاعری میں اچھے اشعار مجھے پسند ہیں۔ لیکن خصوصی طور پر کوئی ایک شاعر مجھے پسند نہیں بلکہ ہر کلاسیکی شاعر کے یہاں ناپسندیدہ اشعار بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں۔

• ا: آپ کا شمار جدیدیت پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بتائیں کہ جدیدیت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ جدیدیت کے زیر اثر ہونے والی تبدیلیوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

ظہیر صدیقی: یہ سچ ہے کہ میرا شمار جدیدیت پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ ویسے میں نے کبھی شاعر ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کجا جدیدیت پسند ہونے کی بات۔ اس سوال کے جواب کے لیے کیوں نہ میں صف اوّل کے نقاد ڈاکٹر وہاب اشرفی کے مضامین سے کچھ اقتباسات پیش کروں۔

''موضوع کے اعتبار سے زیادہ طریقۂ اظہار کے لحاظ سے ظہیر صدیقی ایک جدید شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں جدید حسیت ہے۔ ایسی حسیت شاعری کو داخلی اور ذاتی بناتی ہے۔ اشکال و ابہام سے گریز لفظ و معنی کی ایک وسیع دنیا آباد کرنے پر اصرار کرتی ہے......''

''مصیبت یہ ہے کہ حسی بیداری بہت سے نئے شعرا کے یہاں بطور فیشن پیدا ہوئی ہے۔ فطری طور پر ایسی حسیت سے ان کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ داخلیت اور خلاقی کے نام پر وہ شاعری کے بجائے چیستان تخلیق کر رہے ہیں اور جدیدیت ناحق بدنام ہو رہی ہے۔ ایسے میں ظہیر صدیقی کا دم غنیمت ہے کہ ان کے یہاں جدیدیت فیشن نہیں ہے بلکہ ان کی ملجب مزاجی کا تقاضا ہے.....''

جدیدیت روایت سے انقطاع نہیں بلکہ روایت کی توسیع ہے۔ تغیر کو ثبات ہے اور ادب تغیر کی گود میں پناہ لیتا ہے۔ سماجی قدریں ہر دور میں یکساں نہیں ہوتیں۔ تبدیلیاں ان کا مقدر ہیں لیکن تبدیلیوں کا مطلب یہ نہیں کہ ماضی کے ورثہ سے بے نیاز ہو کر ادبی سفر کا آغاز ہو۔ شعری سفر نئی منزلوں کی جستجو ہے لیکن زادِ راہ تو روایت ہی کی دین ہے۔ جدیدیت کے زیر اثر ہونے والی تبدیلیاں مستحسن ہیں۔

• ا: آپ کن لوگوں کو جدیدیت کے رجحان کا نمائندہ شاعر سمجھتے ہیں؟

ظہیر صدیقی: وہ جو جدیدیت کے نمائندہ شاعر کہلانے کا حق رکھتے ہیں ان میں بیشتر یا تو اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں یا خاموش ہوگئے ہیں۔ میرے حافظے میں اس وقت کوئی بھی نہیں۔ ویسے بھی شاعر سے زیادہ شاعری میرے پیش نظر رہتی ہے۔

• ا: آپ اپنے معاصر شعرا میں کن کو پسند کرتے ہیں؟

ظہیر صدیقی: معاصر شعرا ہوں یا بالکل نئی نسل کے شعرا میں صرف ان کی شاعری پر توجہ دیتا ہوں۔ بہت سے معاصر شعرا ہیں جن سے بہتر شاعری نئی نسل کے شعرا پیش کر رہے ہیں۔ اس لیے میں شعرا سے زیادہ شاعری سے دلچسپی رکھتا ہوں۔

• ا: اپنی نسل کے بعد کے آنے والے شعرا کے بارے میں آپ کے خیالات کیا ہیں؟

ظہیر صدیقی: نئی نسل کے شعرا بڑی تندہی سے شعری سرمایہ پیش کر رہے ہیں۔ لیکن اخباروں میں چھپنے کے شوق نے ان کی شاعری کو رطب و یابس کا شکار بنا دیا ہے۔ تعجب ہے کہ قارئین کی کمی اور اردو زبان سے عام بے توجہی سے لاتعلق بس غزل پہ غزل کہے جا رہے ہیں، گویا صحرا میں اذان دے رہے ہیں۔ ہمارے کچھ ہم عصر ادیب ان کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ مسودہ پڑھے بغیر نئے شعرا کے مجموعۂ کلام کا دیباچہ لکھ رہے ہیں۔ ان کی بے جا تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتابیں چھپنے کے بعد اپنے دامن اوراق میں زبان و بیان اور اوزان و بحور کی فاش غلطیاں لیے ہوئے منظر عام پر آ رہی ہیں۔

• ا: آپ کو ہندوستان اور پاکستان کی جدید اردو شاعری میں کوئی فرق محسوس ہوتا ہے؟

ظہیر صدیقی: حتمی طور پر تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اگر اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے تو میں بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کی جدید اردو شاعری زیادہ Urbanize ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پاکستان کے بیشتر شعرا امریکہ، انگلینڈ، کینیڈا اور دوسرے مغربی ممالک میں مستقلاً مقیم ہیں۔

• ا: کیا یہ فرق محض موضوعات تک ہے یا لفظیات اور اسلوب میں بھی کوئی فرق نظر آتا ہے؟

ظہیر صدیقی: موضوعات مختلف ہوں گے تو مضامین بھی مختلف ہوں گے اور ان کے اظہار کے لیے لفظیات اور اسلوب بھی کسی حد تک مختلف ہوں گے۔

• ا: اردو شعرا کی اتنی بڑی تعداد کے باوجود آج کوئی میر، غالب اور اقبال پیدا نہیں ہوتا۔ آپ اس کا سبب کیا سمجھتے ہیں؟

ظہیر صدیقی: فی زمانہ گوناگوں مشاغل اور مسائل نے دیگر لوگوں کے ساتھ شعرا کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اب عوام و خواص کی دلچسپی صرف مشاعروں، شعری نشستوں اور ادبی کتابوں کے مطالعہ تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی دلچسپی کے مراکز سنیما، ٹی.وی، اسپورٹس اور دیگر سرگرمیاں ہیں۔ سب سے زیادہ نقصان ادبی مراکز میں سیاسی لوگوں بلکہ صاف لفظوں میں کہا جائے تو سیاسی لیڈروں کی دخل اندازی سے ہوا ہے۔

کاوش تخلیق فن انعام تک
شاعری پہنچی درِ حکام تک

ویسے بھی آج سقراط، افلاطون، ارسطو یا نیوٹن، آئن سٹائن کہاں پیدا ہو رہے ہیں۔ آج سے ساڑھے چودہ سو برس پہلے ہی اللہ کے بھیجے ہوئے سب سے عظیم دانشور کے ساتھ ہی رسولوں کی آمد پر بھی مہر لگ گئی ہے۔ لگتا ہے کہ

یہ کمی قانون قدرت کے تحت ہے۔

ہ ا: موجودہ اردو شاعری کے اجتماعی کردار کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟

ظہیر صدیقی: اردو شاعری کا اجتماعی کردار اپنے فرائض منصبی سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ تنگ بند غزلیں اور صرف غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ ایسی غزلیں نہ ذوق جمال کو تسکین فراہم کرتی ہیں اور نہ معاشرہ کے لیے مفید ہیں۔ مبتدی شعرا اپنے مسودہ کی اصلاح کے بغیر نام نہاد نقادوں سے تقریظیں لکھوا کر آب و تاب کے ساتھ شائع کر کے اپنا مجموعہ منظر عام پر لا رہے ہیں اور شاعروں، ادیبوں کو اس شرط پر دے رہے ہیں کہ وہ ان کی شاعری کی تعریف میں اپنا قلم توڑ دیں۔ ڈاکٹر جس کو 55-50 برسوں کا طبی تجربہ ہے وہ بھی اور 70 برس سے اوپر کا ماہر نفسیات وہ بھی صرف غزلیں کہہ رہا ہے۔ انھیں یہ توفیق نہیں کہ اپنی پروفیشنل صلاحیتوں کو قلم بند کریں تا کہ اردو کے سرمایے میں اضافہ ہو اور اردو سماج کو فائدہ بھی پہنچے۔

ہ ا: کیا موجودہ ادبی صورت حال آپ کو طمانیت و آسودگی کا سامان فراہم کرتی ہے؟ ماضی قریب اور آج کے ادب میں آپ کوئی کمی محسوس کرتے ہیں؟

ظہیر صدیقی: موجودہ ادبی صورت حال طمانیت اور آسودگی کا سامان نہیں فراہم کرتی ہے۔ ماضی قریب کے ادیبوں کے خیالات سے آپ اتفاق نہیں کرتے ہوں لیکن ان کی شعری صلاحیت اور زبان و بیان کی درستگی کو چیلنج نہیں کر سکتے لیکن آج......اس کے جواب کے طور پر اوپر کے کسی سوال کے جواب میں اپنی رائے کا اظہار کر چکا ہوں۔

ہ ا: آپ کی شاعری کی عمر تقریباً 55 سال سے اوپر ہو گئی ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ اس طویل عرصے میں آپ کے صرف تین شعری مجموعے سامنے آئے؟

ظہیر صدیقی: میرے ذہن تخلیق میں دو توام شخصیتیں ہیں جو اصل میں ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں۔ ایک شخصیت تو فنکار کی ہے جو لمحات تخلیق میں حسی تجربے سے گزرتا ہے اور اس کے اظہار کے لیے علامتوں، تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کا سہارا لیتا ہے۔ دوسری شخصیت قاری اور ناقد کی ہے (جس کو سطور بالا میں کسی جگہ میں نے Mid wife سے تعبیر کیا ہے)۔ فی بطن شاعر قاری/ناقد گرامر اور عروض کے اوزان و بحور میں دسترس رکھتا ہے۔ یہ دونوں توام شخصیتیں جب ایک ہو جاتی ہیں یعنی ثنویت وحدت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس وقت شعر کا نزول ہوتا ہے۔ یہی پابندی ہے جس کی وجہ سے میرے یہاں اشعار کا ذخیرہ نہیں ہے۔ میں کمیت کے بجائے کیفیت میں یقین رکھتا ہوں۔ ایک غزل میں کم از کم دو تین اشعار تو ایسے ہوں جو کھٹکنے اور غور و فکر پر مجبور کریں۔ غزل مثنوی تو ہے نہیں کہ کسی بھی شعر پر رکے بغیر پورے کلام کا متنوں میں مطالعہ کیا جائے تا کہ اخیر میں کہانی کے انجام تک جلد سے جلد پہنچا جائے۔ میری غزلوں میں بہت سے اشعار قاری کو کھٹکنے اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ غزل کے اچھے اشعار کو مضمون آفریں ہونا چاہیے۔

ہ ا: آپ نے جو کچھ لکھا اور اس کے بدلے میں جو کچھ پایا، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں یا ایسی کوئی تحریر آپ کے نوک قلم تک پہنچنے کے لیے اب بھی بے تاب ہے؟

ظہیر صدیقی: بھائی! میں نے کچھ پانے کے لیے تو لکھا نہیں۔ گھر کی کفالت کے لیے تو LIC کا سہارا لیا۔ 'پانے' سے میری مراد مادی منفعت تھی۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ میں نے جو کچھ پایا وہ بیش بہا ہے۔ متعدد سربرآوردہ نقادوں اور ادیبوں نے مجھ ناچیز کے کلام کی ستائش کے ذریعہ میری ہمت افزائی کی اور میرے قلم کو چلتے رہنے کا حوصلہ دیا۔ ان عنایات کے لیے میں ان کا شکرگزار رہوں۔ شعری اور ادبی تخلیقات پر مطمئن ہونے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ جب تک دم میں دم ہے اور قبضے میں قلم ہے بہتر سے بہتر تخلیق کے لیے مبداءِ فیض کی توفیق چاہتا ہوں۔

ہ ا: تخلیقی فنکار عموماً اپنے نقادوں سے شاکی رہتے ہیں۔ آپ کی رائے اپنے نقادوں کے بارے میں کیا ہے؟

ظہیر صدیقی: میں نے کسی نقاد کو Appoint کیا نہیں اس لیے کسی کو بھی اپنا نقاد کیسے کہوں؟ ہاں متعدد کرم فرماؤں نے میری شاعری پر جو کچھ لکھا بغیر میرے مشورے اور اطلاع کے اپنے طور پر لکھا۔ میں ان کی بے لوث محبت کے لیے تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔

ہ ا: پھر بھی آپ اپنے نقادوں میں کسے بہتر سمجھتے ہیں؟

ظہیر صدیقی: اگر نام لینا ضروری ہے تو ڈاکٹر وہاب اشرفی۔ انھوں نے میری پہلی کتاب 'ماسوا' (مطبوعہ 1976) سے پہلے ایک بہت ہی وقیع اور جاندار مضمون لکھا۔ پھر آخری کتاب 'روشن ورق ورق' پر پُرخلوص بصیرت افروز مضمون لکھا۔ اس سلسلے میں ایک اور ناقد کا نام لوں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ ہیں ڈاکٹر محفوظ الحسن۔

ہ ا: انعامات و اعزازات کی حیثیت فی زمانہ کیا ہے؟ آپ دہلی، علی گڑھ یا ممبئی میں ہوتے تو کس انعام کے مستحق ہوتے؟

ظہیر صدیقی: انعامات و اعزازات فنکار کی صلاحیتوں سے زیادہ سفارشات پر ملتے ہیں۔ معتبر ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کچھ ادارے شاعر سے رقم لیتے ہیں اور پھر اسی کی رقم کو انعام کی رقم بنا کر ہار اور شال پہنا کر اس کی نذر کرتے ہیں۔ واللہ اعلم!

انعام کے سلسلے میں جہاں تک استحقاق کی بات ہے میں خود کو بہت زیادہ اہل نہیں سمجھتا۔ منجملہ دوسری دعاؤں کے میں یہ دعا بھی مانگا کرتا ہوں: ''اے اللہ مجھ کو میری نگاہ میں چھوٹا اور دوسروں کی نگاہ میں بڑا بنا دے''۔ (اللہ هم اجعلنی فی عینی صغیرا و فی اعین الناس کبیرا)

اس دعا کی موجودگی میں اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار کیسے ہو سکتا ہوں۔ ویسے بھی کسی انعام کے لیے میں شاعری نہیں کرتا۔ ہاں! اگر انعام ملتا ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کا بچہ تندرست اور خوب صورت پیدا ہو۔ لیکن کوئی شخص بچوں کی نمائش میں انعام حاصل کرنے کے لیے تو بچہ پیدا نہیں کرتا۔ ہاں! اگر بچوں کے میلے میں اُس کے بچے کو انعام مل جائے تو اس کا خوش ہونا فطری عمل ہے۔

ہ ا: نئی نسل کے فنکاروں کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے۔

ظہیر صدیقی: (1) نئی نسل کے فنکار ہوش مند ہیں، باصلاحیت ہیں۔ وہ ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا'' پر کاربند ہوتے ہوئے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھیں۔ مشاعروں میں اگر ان کو نہیں مدعو کیا جائے تو وہ مایوس نہ ہوں کیونکہ مشاعروں میں چند اچھے شاعروں کو چھوڑ کر ایسے اداکاروں کو بلایا جاتا ہے جن کو شاعر کہنا ہی غلط ہے۔

(2) ان کے شہر یا محلے میں ہی ایک سے زیادہ لوگ ہو سکتے ہیں جو زبان دانی میں ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود خالق کل سے آپ کو ایک اچھے شاعر ہونے کی توفیق ملی۔ اس پر مغرور ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

(3) اس وقت معاشرہ ظلم و تشدد کی زد میں ہے۔ ہر طرف برائیوں کا ڈیرہ ہے۔ ایسے میں ایک شاعر ان کی اصلاح تو نہیں کر سکتا لیکن انگلیاں تو اٹھا سکتا ہے۔ غزل کی تخلیق کافی نہیں ہے۔ نظم کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

(4) قاری یا سامع کی پسند اور ضرورت کے فرق کو سمجھیں۔ قارئین/سامعین بچوں کی طرح ہیں۔ بچوں کو کھیل کود پسند ہے جب کہ پڑھنا لکھنا ان کی ضرورت ہے۔ یہ تو گارجین کا کام ہے کہ ان کی پسند کے مقابلے میں ان کی ضرورت کو ترجیح دیں۔ ہمارے شعرا بھی معاشرہ کے گارجین ہیں۔

■

Dr. Humayun Ashraf
P. G. Department of Urdu
Vinoba Bhave University
Hazaribagh-825301(Jharkhand)
Mobile: 9771010715
Email: dr.h.ashraf@gmail.com

زبان و تعلیم

ادب اطفال کے درسی مسائل

ریاض احمد

جس طرح بچوں کے ادب کی تخلیق وتصنیف بہت مشکل کام ہے اسی طرح بچوں کے ادب کی تدریس کا جائزہ لینا اوران کی افادیت ومسائل بیان کرنا بھی۔ بات کہاں سے شروع کی جائے سمجھ میں نہیں آتا۔ مسائل بہت ہیں اور ان کے حل کے امکانات سے مایوسی بھی نہیں۔ابتدائی سوالات جو ہر مدرس، معلم، ماں باپ، سرپرست اور ماہر تعلیم وتعلم کے ذہن میں ابھر کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ آخر ہم کس طرح کے ادب کو بچوں کا ادب یا ادب اطفال کہیں گے؟ ادب اطفال کی تدریس کس طرح کی جانی چاہیے؟ کس عمر کے بچوں کے لیے کون سے تدریسی طریقے اپنائے جائیں؟ ادب اطفال سے ان کی زندگی میں کیا کیا فائدے ہیں؟ کیا یہ ادب پارے ان کی پوری زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ بچوں کے ادب کی تخلیق کرتے وقت کن نفسیاتی، معاشرتی اور فلسفیانہ اصولوں اور پس منظر کو سامنے رکھنا بہتر ہوگا ؟ کیا ہمارے ملک اور دنیا کے دوسرے ممالک نے اس کے لیے ضابطے اور قوانین مرتب کیے ہیں۔ کیا قومی اور بین الاقوامی سطح پر ان کی ترقی اور معیار و جانچ کے لیے ادارے بنائے گئے ہیں۔ ہمارے ملک میں مرکزی سطح اور ریاستی سطح کے تعلیمی، تحقیقی اور اشاعتی اداروں نے بچوں کے ادب کی ترویج وترقی کے کون سے اقدامات کیے ہیں؟ اگر ہاں تو کس حد تک اور ان کا معیار کیا ہے؟ قانونی اعتبار سے بچے کے عمر کی حد کیا ہے۔ اگر بچوں سے ان کے ادب کے ذریعے مثبت اقدار اور انسانی حقوق و بھلائی کا کام نہ لیا گیا تو آنے والی نسلوں کو کون سے نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا ؟ ان ہی چند اہم سوالات کا تجزیہ اس مختصر سے مقالے میں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

مشترکہ ہندوستان میں بچوں کے ادب کی ترویج میں سرزمین پنجاب کا بہت اہم رول رہا ہے اس لیے گفتگو یہیں سے شروع کرنا بہتر ہے۔ جدید ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں اسی پنجاب کی دھرتی پر کرنل ہالرائڈ کی رہنمائی میں علمی وادبی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تھا، یہیں سررشتہ تعلیم میں ملازمت کرتے ہوئے مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کو یہ خیال آیا کہ انگریزی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو میں بھی موضوعی نظمیں لکھی جانی چاہئیں اور پھر ان دونوں بزرگوں نے انگریزی کی کامیاب تمثیلی نظموں اور بچوں کو اپیل کرنے والی نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔ حالانکہ مولانا حالی اور محمد حسین آزاد سے قبل بھی بچوں کے لیے مفید نظمیں، حکایات، کہانیاں اور مضامین کئی شعرا اور ادبا نے لکھی مگر دانستہ طور پر یہ ادب پارے اس لیے تخلیق نہیں کیے گئے تھے کہ یہ بچوں کے ادب کے لیے سنگ میل ثابت ہوں۔ انگریزی دور حکومت میں درسی کتابوں کے شعبہ سے ادب اطفال کی طرف شعوری طور پر توجہ مبذول کی گئی اور بچوں کے ذوق کی نظم ونثر لکھی جانے لگی۔

اردو زبان کے ارتقائی دور میں ہی بچوں کے لیے کچھ ایسی نظمیں، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں لکھی گئیں جن کو بلاشبہ بچوں کے ادب کی ابتداء کہہ سکتے ہیں اس ضمن میں امیر خسرو کی خالق باری کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے گویا اردو میں بچوں کے ادب کی روایت تقریباً سات سو سال پرانی ہے۔ امیر خسرو کے بعد دکن میں قلی قطب شاہ نے بھی موضوعی نظمیں لکھ کر بچوں کے ادب میں اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ عبدالغفور شہباز نے بھی اس ضمن میں کارنامے انجام دیے ہیں۔ بعد کے بہت سے چھوٹے بڑے ادبا و شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے جو حال تک پہنچتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی ان شعراء میں سرفہرست ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کے علاوہ میر تقی میر، انشاء اللہ انشا، میر امن دہلوی، محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، سرسید احمد خاں اور مرزا غالب نے بالترتیب برسات کی بہاریں، آدمی نامہ، روٹی نامہ، موہنی بلی، رانی کیتکی، باغ و بہار، طالب علم، مٹی کا دیا، منتخب الحکایات، امید کی خوشی اور قادرنامہ لکھ کر بچوں کے ادب کی مضبوط بنیاد ڈالی۔ ان بزرگوں کے بعد کے لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں نثر نگاروں میں حسن نظامی (شہزادی کی چتا، مچھر) پریم چند (پنچایت، عیدگاہ) سید سلیمان ندوی (تعلیم کی اہمیت) ڈاکٹر ذاکر حسین (ابوخاں کی بکری، آخری قدم) امتیاز علی تاج (بچوں کی بہادری)

کنہیا لال کپور (کتے) عصمت چغتائی (سفید جھوٹ) سہیل عظیم آبادی (عقلمند عورت) کرشن چندر (گدھے کی سرگزشت، الٹا درخت) احمد ندیم قاسمی (چوہوں کی بارات) وغیرہ کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔

شعرا میں علامہ اقبال (ایک پہاڑ اور گلہری، جگنو، ایک آرزو، بچے کی دعا، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ اور ہمالہ) چکبست (خاک وطن) اکبر الہ آبادی (دلی دربار، ہونہار بیٹا) وحید الدین سلیم (سیکھو) حفیظ جالندھری (ننھے منھے بچے) تلوک چند محروم (اچھا آدمی) عادل رشید (منظوم کہانی) جمیل مظہری (اے مادر وطن ہندوستان) جاں نثار اختر (ہم ایک ہیں) ندا فاضلی (نغمہ گر چلے گئے) ساغر نظامی (بڑھے چلو) شبنم کمالی (آؤ گیت گائیں) ظفر کمالی (یتیم لڑکا، کتابیں) کے نام بطور خاص لیے جاسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ایسے شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے بچوں کے لیے بہترین نظمیں تخلیق کی ہیں۔

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ بڑے قلم کاروں نے بچوں کے ادب پر توجہ نہیں دی لیکن یہ بات صد فیصد درست نہیں۔ مذکورہ شعرا و ادبا میں بڑے قلم کاروں کے نام زیادہ ہیں اس کے علاوہ کئی ایسے شاعر و ادیب ہیں جنھوں نے بچوں کے ادب اور ان کی درسی کتابوں کی طرف بطور خاص توجہ دی۔ اس ضمن میں حامد اللہ افسر میرٹھی، گوپی چند نارنگ، مظہر امام، شکیل الرحمن، علقمہ شبلی، کنہیا لال کپور، طلحہ رضوی برق، علیم اللہ حالی، عبد الصمد، عبد اللہ ولی بخش قادری، رئیس صدیقی، کوثر مظہری، شان بھارتی اور اظہار اثر کے نام خاص طور سے لیے جاسکتے ہیں۔ اہل قلم حضرات کا خاطر خواہ رجحان بچوں کے ادب کی طرف تو رہا ہی ہے، خواتین، جو بچوں سے زیادہ قریب اور ان کی نفسیات کو بہتر طریقے سے سمجھنے والی ہوتی ہیں، نے بھی بچوں کے ادب میں بے بہا اضافہ کیا ہے۔ جن خواتین اہل قلم کا نام اس زمرے میں لیا جاسکتا ہے ان میں خواجہ حسن نظامی کی اہلیہ لیلہ خواجہ بانو، امتیاز علی تاج کی اہلیہ حجاب امتیاز علی، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین، جیلانی بانو، خدیجہ مستور، رفیعہ منظور الامین، الطاف فاطمہ اور قدسیہ زیدی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔

اردو میں بچوں کے ادب کا جائزہ لیتے وقت بہت سے ادبا و شعرا کا ذکر ضروری سمجھا جاتا ہے جنھوں نے تھوڑا بہت بھی ان کے لیے ادب کی تخلیق کی۔ مذکورہ بالا سطور میں ان میں سے کچھ کا ذکر بھی ہوا لیکن دو ایسے حضرات ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی بچوں کو پڑھانے، ان کے لیے درسی کتابیں تیار کرنے اور ان کے لیے ادب کی تخلیق کرنے میں صرف کردی، جب تک ان دونوں حضرات کا تذکرہ نہ کیا جائے، اردو میں بچوں کے ادب کا تصور ادھورا ہے۔ میری مراد مولوی اسماعیل میرٹھی اور شفیع الدین نیر سے ہے۔

مولوی اسماعیل میرٹھی کی پیدائش 1844 میں ہوئی صرف سولہ سال کی عمر میں سررشتہ تعلیم میں ملازم ہوگئے بعد میں ترقی کرکے سہارن پور میں بطور فارسی کے ہیڈ مولوی اور سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1899 میں سبکدوش ہوئے 1917 میں اس دارفانی سے کوچ کیا۔ مولوی اسماعیل کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی اردو ریڈرس ہیں یہ کتابیں بچوں کی نفسیات اور ذہنی نشو ونما کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ اگر کوئی بچہ ان پانچوں ریڈرس کو اچھی طرح پڑھ لے تو یقینی طور پر اس کی اردو دانی اچھی ہوجائے گی۔ اردو ریڈرس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے ان کی دلچسپی اور معلومات دونوں کو پیش نظر رکھ کر بہت سی نظمیں لکھیں۔ اس سے قبل اردو میں باضابطہ نصابی کتابیں تیار کرنے کا خیال کسی کو نہیں آیا تھا۔ ان کی نظمیں اتنی دلچسپ ہیں کہ بڑے بھی چٹخارے لے کر پڑھتے ہیں۔ یہ نظمیں پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں کو یکساں متاثر کرتی ہیں۔ مولوی اسماعیل کا خاص کمال انگریزی کی اچھی نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھالنا ہے انھوں نے کئی انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ کیا۔ ان کی سیدھی سادی زبان میں دل کو چھو لینے والی باتیں بچوں کو بہت بھاتی ہیں۔

شفیع الدین نیر کی پیدائش ضلع علی گڑھ میں 3 نومبر 1903 میں ہوئی بچپن میں کافی مشکلیں اٹھا کر دہلی کے اینگلو عربک اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں 1945 سے 1969 تک مدرسی کی اس سے قبل دہلی کے موڈرن اسکول میں تقریباً 20 سال تک استاد رہے۔ نیر صاحب نے تقریباً پچاس برسوں تک مسلسل بچوں کے لیے لکھا۔ ہندو پاک میں ایک بہت بڑے طبقہ کو ان کا شاگرد ہونے پر فخر ہے ان میں قدآور صحافی خوشونت سنگھ اور کلدیپ نیر بھی شامل ہیں۔ ان کی پہلی نظم 'صبح' 1926 میں رسالہ ہونہار میں شائع ہوئی اور پہلی کہانی میاں مٹھو 1939 میں چھپی۔ نیر صاحب بیک وقت بچوں کے ادب کے شاعر اور نثر نگار دونوں تھے۔ کم وبیش انھوں نے بچوں کے لیے پچاس کتابیں لکھیں۔ بچوں کی دلچسپی اور نفسیات کے لحاظ سے انھوں نے اپنی نگارشات کو چار سال سے چودہ سال تک کے بچوں کے لیے تین زمروں میں تقسیم کردیا تھا۔ ان کی آخری نظموں میں 'پکا ارادہ' ہے جو 1977 میں کھلونا میں شائع ہوئی۔ نیر صاحب ایک عملی انسان ہونے کے ساتھ ساتھ باعمل استاد بھی تھے۔ بقول ذاکر صاحب وہ 'پیدائشی معلم' تھے۔ بچوں کے ادب کو مالا مال کرنے والا استاد 30 جنوری 1978 کو اس جہان فانی سے کوچ کرگیا۔

شروع سے ہی بچوں کے ادب کا فروغ ایک اہم مسئلہ رہا ہے تاہم ملک گیر سطح پر شائع ہونے والے بچوں کے رسالوں نے اس مسئلہ کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ہمارے ملک کے مختلف شہروں سے بچوں کے معیاری رسائل شائع ہوئے مثلاً نونہال اور پھول لاہور سے، پیام تعلیم، کھلونا، امنگ، نرالی دنیا، پھلواری اور ہونہار دہلی سے، رام پور اور لکھنؤ سے نور، کلیاں اور ثاقی، غنچہ بجنور سے اور مسرت پٹنہ سے۔ ان رسالوں میں مسرت، کھلونا، پھلواری اور امنگ و پیام تعلیم کی گراں قدر خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) نے بچوں کی دنیا شروع کرکے اس راہ کی دشواریوں کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ فی الحال بچوں کی دنیا، پیام تعلیم اور امنگ جیسے رسالے بچوں کے ادبی تقاضے کو پورا کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ بچوں کے ادب کے ضمن میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) اور نیشنل بک ٹرسٹ نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں اور رسالے شائع کرکے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

عام طور سے ادب اطفال کی کتابیں بچوں کے نصاب میں الگ سے شامل نہیں ہوا کرتیں بلکہ ان کی درسیات میں بچوں کی نفسیات، سماجی اہمیت، اقدار اور فہم وفراست کے مطابق تاریخی، ثقافتی اور تہذیبی شعور، مختلف علوم وفنون اور ایجادات، نامور شخصیات و مذہبی پیشوا، علم حیوانات ونباتات اور جغرافیائی خطوں اور ان خطوں میں پائے جانے والے لوگوں کے رہن سہن، حیوانات و عجائبات اور مختلف سیاحوں کے حالات اور سفر نامے اس طرح ترتیب دیے جاتے ہیں کہ بچوں کے ذہن پر ان کا مثبت اثر ہو۔ درسی نصاب میں وہی نظمیں اور نثر، مضمون، کہانیاں وغیرہ شامل کی جاتی ہیں جن کا براہ راست تعلق معلومات، تہذیب وثقافت اور تاریخی حقائق ومعلومات سے ہوتا ہے۔ بچوں کی درسیات میں مذکورہ علوم وعنوانات کی ترتیب نامعلوم سے معلوم کی جانب، کم معلومات سے زیادہ معلومات کی طرف، آسان سے مشکل کی طرف اور جز سے کل کی طرف ہونا چاہیے۔ عام طور سے دیکھا یہ

جاتا ہے کہ بچوں کی درسی کتابیں جن میں نثر و نظم کے ذریعے ادب اطفال کو شامل کیا جاتا ہے بہتر ترتیب کی کمی پائی جاتی ہے۔

ہمارے ملک کی مختلف ریاستوں میں بچوں کی درسیات کی تیاری و اشاعت مختلف ریاستی تعلیمی بورڈ و اشاعتی اداروں کے ذمے ہے کچھ ریاستوں میں تو مذکورہ باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے بلکہ چند ریاستیں ایسی ہیں جنہیں بچوں کی درسیات کی تیاری میں مہارت حاصل ہے مثلاً کیرالا اور مہاراشٹر، لیکن ایسی ریاستوں کی تعداد بہت کم ہے۔ 2005 میں اسکولی درسیات کو بہتر رہنمائی فراہم کرنے کے لیے اور مستقبل میں خاطر خواہ علمی و تعلیمی ترقی کے لیے قومی درسیات کا خاکہ۔ 2005 تیار کیا گیا اس کے رہنما اصول کے تحت بچوں کی درسیات میں سماجی بیداری، ماحولیاتی توازن، دائمی ترقی، اچھے اقدار سے متعلق قصہ کہانیاں، واقعات و حکایات، جنگلوں کی کٹائی اور قدرتی توازن کے بگڑنے سے ہونے والے مضر اثرات، مختلف قوموں اور نسلوں کے درمیان بڑھتی کشیدگی اور جنگ کے مضر اثرات مثلاً کیمیائی ہتھیاروں کے اثرات، بے روزگاری، مہاجرین کے مسائل، بچہ مزدوری وغیرہ موضوعات کو درسی کتابوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شامل کرنے کی صلاح دی گئی ہے تاکہ ان سماجی مسائل سے طلبا آشنا ہو سکیں اور مستقبل میں بہتر شہری بننے کی کوشش کر سکیں۔ اس ضمن میں چند ریاستی اشاعتی اداروں اور مرکزی سطح پر قومی کونسل برائے تعلیمی تحقیق (NCERT) نے ان رہنما اصولوں کی کچھ حد تک پابندی کی ہے تاہم ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔

بچوں کے ادب کے ہندوستانی تناظر میں ان نکات کا خیال رکھنا ضروری ہے جن سے ہندوستانی تاریخ و ثقافت، جدوجہد آزادی کی تاریخ، ہندوستانی آئین کے اساسی پہلو اور دستوری ذمے داریاں، ہماری قومی شناخت میں معاون عناصر و علامتیں، قومی و سیاسی ہم آہنگی، سماجی نظریہ مساوات، جمہوریت و سیکولر ازم، جنسی مساوات، ماحولیاتی تحفظ کا احساس، منفی معاشرتی سوچ کا انسداد، معاشرتی و معاشی بہتری کے لیے چھوٹے خاندان کے مثبت پہلوؤں کا پرچار اور سائنسی شعور و سوچ کے لیے ذہنی ہم آہنگی وغیرہ۔ مذکورہ مضامین کی تشہیر و تفہیم اور حصول کے ہدف کو سامنے رکھتے ہوئے ایسے اسباق، مضامین، نظمیں، غزلیں، گیت شامل کیے جانے چاہئیں جن کی زبان آسان اور پرلطف ہو اور ہندوستان کی دوسری زبانوں اور ثقافت کے منافی نہ ہو۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور خطوں کی ثقافت، فنون لطیفہ، تاریخی حقائق آثار قدیمہ، تہذیبی روایات اور تہوار جن سے طلبا کے ذہنوں کو ہندوستانی رنگا رنگی اور گنگا جمنی تہذیبی وراثت کا پتہ چلے بھی شامل نصاب ہوں۔

اب سوال اٹھتا ہے کہ کیا موجودہ نصاب اور نصابی کتابیں قومی سطح پر ان مقاصد کی تکمیل کر رہی ہیں یا نہیں؟ بچوں کی تعلیم و تدریس میں تعلیمی فلسفہ اور تعلیمی نفسیات کا بہت عمل دخل ہے قدیم طرز تعلیم ترقی یافتہ نصابات اور اصول کا ساتھ نہیں دے پا رہا ہے پرانا طرز تعلیم معلم مرکوز اور مواد پر مبنی ایک میکانیکی عمل تھا۔ استاد طلبا کو رٹنے رٹانے کے ذریعہ بغیر بحث و مباحثہ کے تعلیم پر زور دیتا تھا جب کہ اب طفل مرکوز تعلیم، سرگرمی پر مبنی بچے کی ہمہ جہت ذہانت اور صلاحیت کو فروغ دینے کا نام ہے۔ بچے کی سمعی، بصری اور لسانی ذہانت کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف النوع اسباق کے ذریعہ اخلاقی قدروں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک عام بچہ خودی سے سرشار ہوتا ہے، والدین اور اساتذہ سے متاثر ہوتا ہے، جذبات احساسات پر بہت دیر تک قابو نہیں رکھتا، اپنے مسائل کا حل خود تلاش کرنا چاہتا ہے، اپنے بڑوں کی تقلید کرتا ہے اور خود بینی کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کمرہ جماعت میں اسے بہت حد تک آزادی چاہیے تاکہ سرگرمی پر مشتمل پر مسرت تعلیم کے لیے موقع حاصل ہو۔ چنانچہ بچے کی تخلیقی قوت اور فنی صلاحیتوں کے ذریعے علوم و فنون کو حاصل کرنے کا شوق پیدا کرنے اور تلاش و جستجو کے ذریعہ کچھ نیا کرنے کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے بچوں کے ادب میں اسی طرح کے اسباق شامل کرنا چاہیے تاکہ بچے آزادانہ طور پر اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر سکیں اور درس و تدریس کے ساتھ ساتھ اپنے بچپن کا لطف بھی اٹھا سکیں

بچوں کے ادب کے ہندوستانی تناظر میں ان نکات کا خیال رکھنا ضروری ہے جن سے ہندوستانی تاریخ و ثقافت، جدوجہد آزادی کی تاریخ، ہندوستانی آئین کے اساسی پہلو اور دستوری ذمے داریاں، ہماری قومی شناخت میں معاون عناصر وعلامتیں، قومی وسیاسی ہم آہنگی، سماجی نظریہ مساوات، جمہوریت و سیکولر ازم، جنسی مساوات، ماحولیاتی تحفظ کا احساس، منفی معاشرتی سوچ کا انسداد، معاشرتی و معاشی بہتری کے لیے چھوٹے خاندان کے مثبت پہلوئوں کا پرچار اور سائنسی شعور و سوچ کے لیے ذہنی ہم آہنگی وغیرہ۔

اڑنے دو پرندوں کو ابھی شوخ فضا میں
پھر لوٹ کے بچپن کا زمانہ نہیں آتا

لیکن ساتھ ہی ساتھ اوپر بتائے گئے اقدار سے منھ موڑنا بھی نہیں چاہیے بچوں کو ترقیاتی ادب کے مطالعہ پر زور تو دیا جائے مگر اس بات کا خیال بھی رکھا جائے کہ ہمارے پاس جو فلسفیانہ، ثقافتی، تہذیبی اور روحانی اقدار ہیں وہ ضائع نہ ہوں۔ کیونکہ موجودہ سائنسی اور تکنیکی ترقی اپنے اندر مثبت پہلوؤں کے ساتھ ساتھ بعض منفی پہلو بھی لیے ہوئے ہے چنانچہ جب بچوں کے ادب میں سائنسی رجحانات و ترجیحات کے مضامین داخل کیے جائیں یا درجہ میں پڑھائے جائیں تو ان منفی پہلوؤں کی نشاندہی کر دی جائے جن سے نسل انسانی کو امکانی خطرہ ہے۔ سائنسی اقدار کے ساتھ ساتھ مختلف مذاہب کی کتابوں سے بچوں کے لیے اچھے اقدار، نیک سلوک، عادات و اطوار، بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے محبت وغیرہ کی تعلیم مذہبی کتابوں سے ماخوذ کر کے دی جائیں۔

تعلیم کو تحت الشعور کا خزانہ کہا گیا ہے اکیسویں صدی میں تعلیم کے موضوع پر قائم بین الاقوامی کمیشن کی رپورٹ چار اقداری پہلوؤں کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کراتی ہے ان میں پہلا مقصد خاص طور سے ثانوی سطح کی تعلیم میں نوجوانوں کے ذہنوں کو علم سے رغبت اور شوق پیدا کرانے اور معلومات کے لیے تجسس پیدا کرنے اور نئے نئے خیالات کو ذہن نشیں کرنے کے لیے اپنے دماغ کی کھڑکیاں کھلی رکھنے کی صلاح دی گئی یہ بالکل درست ہے کہ بچہ اگر اپنے ذہن کی کھڑکیاں کھلی رکھے گا اور اسے بغیر خوف و خطر کے تعلیم حاصل ہوگی تو وہ مستقبل کا ایک بے باک شہری بنے گا۔ کلاس روم ہو یا گھر، کھیل کا میدان ہو یا تفریح گاہیں اسے اپنے جذبات و خیالات کی آزادانہ ترسیل کا موقع دیا جانا چاہیے۔ درمیان تعلیم کسی طرح کا خوف بچے کے ذہن میں نہیں آنا چاہیے۔ خوف سے بچے میں پروان چڑھتی ہوئی صلاحیتیں مر جاتی ہیں اور وہ زندگی بھر احساس کمتری کا شکار رہتا ہے۔

خوف کے سائے میں گر بچہ پلا
بے زباں ہو جائے گا یا بدزباں ہو جائے گا

دوسرے پہلو میں علم عمل کے لیے عمل کے حاصل کرنے کی صلاح دی گئی ہے تاکہ حاصل کردہ علوم کو بچہ اپنی عملی زندگی کے کام میں لا سکے، نفع بخش روزگار حاصل کر سکے، اپنے افراد خانہ کے کام آ سکے، اپنے سماج اور اپنی قوم و ملت کے کام آ سکے اور سب سے بڑھ کر عالم انسانیت کے لیے کارآمد ہو۔ گویا بچوں کے ادب میں ایسے عنوانات،

اسباق شامل کرنا چاہیے جو اس کے مستقبل کی زندگی کو روشن کر سکے۔ تیسرے پہلو کی تشریح کرتے ہوئے معاشرتی زندگی کو بہتر اور مل جل کر زندگی گذارنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس میں تعلیم کے تمام تر سماجی عناصر سے بحث کرتے ہوئے امداد باہمی، وقت کی پابندی، صلہ رحمی، صفائی ستھرائی، کمزور طبقوں کی مدد اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کے رویے پر زور دیا گیا۔ گویا بچوں کے ادب کے ذریعے نسلی، لسانی، مذہبی، قومی اور عالمی برادری کے افہام و تفہیم کا فروغ ہو۔ چوتھے پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تعلیم کے ذریعے ہر بچے کے جسم و ذہن کا ہمہ جہت فروغ ضروری ہے تعلیم کے ذریعے اس کی ذہنی صلاحیتیں، قوت احساس، جمالیاتی ذوق، روحانی اقدار، احساس ذمے داری کی تربیت اس طرح کی جائے کہ اس کی شخصیت کے سبھی امکانی صلاحیتوں کا فروغ ہو سکے اور مستقبل میں ایک انسان دوست شہری بن سکے۔ اسے احساس جمال کے اقدار کے ساتھ ساتھ آس پاس کے ماحول کو بہتر بنانے کا سلیقہ آجائے۔ اس میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ قدرتی تحفظ کے لیے جنگلوں اور جانداروں کا استحصال بہت خطرناک اور آنے والی نسلوں کے لیے مضر ہے۔ وہ آنے والی نسلوں کے لیے قدرتی عطیات و وسائل بچا کر رکھے۔ گویا ادب اطفال کے ذریعے کل کے شہری یعنی بچوں کے ذہن و دل میں یہ بات ڈالنی ہوگی کہ دنیا کو بہتر اور رہنے کے لائق کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ اگر مذکورہ اقدار کے فروغ کے لیے نثر و نظم کے عنوانات درسی کتابوں میں شامل کیے جائیں تو اس کے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں مثال کے لیے ندا فاضلی کی نظم 'نغمہ گر چلے گئے' جو کیرالا کے نویں جماعت کی درسی کتاب میں شامل ہے پیش کیا جا سکتا ہے۔

کٹی پھٹی ہیں دھرتیاں　　سمندروں کی وسعتوں کو
دھواں دھواں فضائیں ہیں　　پی رہی ہیں بستیاں
لہو لہو عبادتیں ہیں　　عمارتوں میں چن رہی ہیں
بے اثر دعائیں ہیں　　پربتوں کی چوٹیاں
وہ جنگلوں کے چوکیدار　　معاہدہ زمیں کا جو فلک سے تھا
جانور چلے گئے　　نہیں رہا
سنبھالتے تھے موسموں کو　　دلوں کے آس پاس تھا جو راستہ
جو شجر چلے گئے　　نہیں رہا
اداس گھونسلے ہیں　　کسی کا اب کسی سے
ان کے نغمہ گر چلے گئے　　کوئی رابطہ نہیں رہا

ایک اور نظم جو انسانی بھلائی میں آفاقی حیثیت کی حامل ہے حالی نے لکھی ہے 'مٹی کا دیا' اور کام مشعل راہ ہے۔

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سر رہ لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گزر جائے ہر ایک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور فانوس سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے
ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پہ چھایا ہوا
سرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

نثری اصناف جن کا اجمالی جائزہ لیا جا چکا ہے میں بھی بچوں کے ادب سے متعلق کچھ ایسے اسباق لکھے گئے ہیں جن سے مثبت اقدار کا فروغ ہوتا ہے۔ یوں تو ایسے اسباق کی تعداد سیکڑوں میں ہے لیکن ان میں کچھ شہرہ آفاق نثری نمونے (کہانیاں، افسانے، انشائیہ، خاکے اور مضامین) ایسے ہیں جنھیں قومی سطح پر اور ریاستی سطح پر تیار کی جانے والی بچوں کی نصابی کتابوں میں بار بار شامل کیا جاتا ہے۔ مثلاً عیدگاہ، پنچایت، حج اکبر، عبرت اور نادان دوست (پریم چند) گزرا ہوا زمانہ اور خوشامد (سرسید احمد خاں) آخری قدم اور ابو خاں کی بکری (ڈاکٹر ذاکر حسین) جینے کا سلیقہ (خواجہ غلام السیدین) کھدر کا کفن (خواجہ احمد عباس) ماحول بچائیے (محمد اسلم پرویز) وغیرہ بچوں کے ادب میں شامل ایسی شاہکار کہانیاں اور مضامین ہیں جن کے ذریعہ ہم نونہالوں کے درخشاں و تابناک مستقبل کی تشکیل و تعمیر کر سکتے ہیں یہاں ڈاکٹر ذاکر حسین کا لکھا ہوا ایک سبق آموز مضمون 'ابو خاں کی بکری' کہانی سے اقتباس ملاحظہ ہو:

"کچھ دیر جب گزر گئی تو بھیڑیا بڑھا۔ چاندنی نے بھی سینگ سنبھالے اور حملے کیے کہ بھیڑیے کا ہی جی جانتا ہوگا۔ بیسویوں مرتبہ اس نے بھیڑیے کو پیچھے ریل دیا۔ ساری رات اسی میں گزری، کبھی کبھی چاندنی اوپر آسمان کی طرف دیکھ لیتی اور ستاروں سے آنکھوں آنکھوں میں کہہ دیتی ارے کہیں اس طرح صبح ہو جائے۔

ستارے ایک ایک کر کے غائب ہو گئے۔ چاندنی نے آخر وقت میں اپنا زور دونا کر دیا۔ بھیڑیا تنگ آ گیا تھا کہ دور سے روشنی دکھائی دی، ایک مرغ نے کہیں سے بانگ دی۔ نیچے مسجد سے اذان کی آواز آئی، چاندنی نے دل میں کہا اللہ! تیرا شکر ہے میں نے اپنے بس بھر مقابلہ کیا اب تیری مرضی۔ موذن آخری مرتبہ اللہ اکبر کہہ رہا تھا کہ چاندنی بے دم ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اس کا سفید بالوں کا لباس خون سے بالکل سرخ تھا۔ بھیڑیے نے اسے دبوچ لیا اور کھا گیا۔

درخت پر چڑیاں بیٹھی کہہ رہی تھی، ان میں اس پر بحث ہو رہی تھی کہ جیت کس کی ہوئی۔ بہت کہتی تھیں کہ بھیڑیا جیتا۔ ایک بوڑھی سی چڑیا تھی وہ کہتی تھی چاندنی جیتی۔"

اقتباس 'ابو خاں کی بکری'

اگر مذکورہ شعری و نثری نمونے بچوں کے ادب کے طور پر مثالی کتابیں تیار کرنے والے افراد اور ادارے شامل کریں تو ادب اطفال سے آنے والے نسلوں کے لیے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں اور مستقبل میں آپسی بھائی چارہ، افہام و تفہیم، سچائی و دیانتداری، ایثار و قربانی، ماحولیاتی تحفظ اور Sustainable development کے لیے راہیں استوار کی جا سکتی ہیں۔

حوالے

- نور الحسن نقوی، تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2009
- اردو شاعری کا انتخاب، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1993
- ڈاکٹر ریاض احمد، اردو تدریس جدید طریقے اور تقاضے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 2013
- ضیاء الرحمن غوثی، بہار میں بچوں کا ادب، پوسٹ باکس نمبر 8607، دہلی۔54، 2005
- صدیق الرحمن قدوائی، دہلی کے اسکولوں میں اردو نصاب کے مسائل، اردو اکادمی، دہلی، 1987
- ڈاکٹر ریاض احمد، تعلیم و تدریس کے روشن پہلو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2011
- National Curriculum Fram Work for School Education, NCERT, New Delhi, 2005
- National Curriculum Fram Work for Teacher Education, NCTE, New Delhi, 2009
- عبد الحمید کاراشیری، بچوں کی تعلیم جدید نفسیات کی روشنی میں، اردو دنیا، NCPUL، نئی دہلی، جون 2012
- کرن سنگھ، عالمی سماج میں نوجوانوں کی تعلیم، یوجنا اردو، پبلی کیشن ڈویژن، نئی دہلی، ستمبر 2003
- ڈاکٹر ریاض احمد، بچے کی تربیت ایک تجزیاتی مطالعہ، یوجنا اردو، پبلی کیشن ڈویژن، نئی دہلی، نومبر 2008
- منتخبات اردو، برائے درجہ نہم و دہم، مغربی بنگال اردو اکیڈمی، کولکاتا، 2009
- کیرالا ریڈر اردو (IX) SCERT کیرالا، 2010
- کرشن کمار، بچے کی زبان اور استاد: ایک دستور العمل، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، 2007

■

Dr. Reyaz Ahmad
Assistant Professor
College of Teacher Education, Sambhal
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500032
Email: reyazahmed045@gamil.com

اصغر عباس

سرسید کے پنجاب کے پانچ سفر

1987 میں 'سرسید اقبال اور علی گڑھ' کے عنوان سے مونوگراف شائع ہوا اس میں سرسید کے پنجاب کے تین سفر کا ذکر ہے لیکن علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میرے لیے انیسویں صدی کے علم وخبر کا بہترین سرچشمہ ہے جس پر میں ایک پیاسے کی طرح پہنچتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرسید نے پنجاب کے تین نہیں پانچ سفر کیے تھے۔ یہاں ان کا مختصر احوال پیش کر رہا ہوں۔

پنجاب کی سرزمین سرسید کے قدوم میمنت لزوم سے پہلی بار 1873 میں سرفراز ہوئی۔ وہ 25 دسمبر 1873 کو بنارس سے جہاں وہ سب جج کے عہدہ پر مامور تھے، علی گڑھ آئے اور یہاں سے 25 دسمبر 1873 کی ڈاک گاڑی سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں ان کے ہم کاروں میں مولوی سمیع اللہ خاں، سید محمد محمود، سید زین العابدین، مرزا عابد علی بیگ، محمد حمید اللہ خاں، سید ظہور حسین، خواجہ محمد یوسف، منشی وجیہ الدین ہیڈ ماسٹر بلند شہر، منشی محمد یار خاں اور منشی مشتاق حسین ساتھ تھے۔ یہ ٹرین 26 دسمبر کو صبح دس بجے امرتسر پہنچی۔ یہاں سرسید اور ان کے رفقا کا استقبال کرنے والوں میں آغا کلب عابد، خان محمد شاہ، میاں محمد خاں، شیخ الٰہی بخش سوداگر، شیخ غلام حسین، شیخ خدا بخش، منشی مہدی علی خاں، میاں غلام حسن، میاں اسد اللہ خاں، شیخ غلام صادق، حاجی محمد سیف الدین، میاں یوسف شاہ، وزیر شاہ اور شیخ سکندر خاں تھے۔ ان عمائدین امرتسر نے سرسید اور ان کے قافلہ کی شیرینی سے تواضع کی۔

26 دسمبر 1873 کو یہ ٹرین بارہ بجے دن میں لاہور پہنچی۔ یہاں سرسید اور ان کے احباب کا خیر مقدم کرنے والوں میں برکت علی خاں، سردار محمد حیات خاں، نواب عبدالمجید خاں، شیخ غلام محمد سبحانی، ڈاکٹر رحیم بخش، فقیر سید قمر الدین، منشی محمد لطیف، سید فضل شاہ ریلوے ڈپارٹمنٹ، منشی محمد شمس الدین ایڈیٹر پنجابی اخبار، سید نادر علی شاہ ایڈیٹر کوہ نور، منشی ہرسکھ رائے مالک مطبع کوہ نور، مولوی احمد شفیع چیف محرر، وہاب الدین ہیڈ ماسٹر، سید عالم شاہ تحصیلدار، محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی اسٹیشن پر موجود تھے۔

سرسید اور ان کے رفقاء کا قیام بازار انارکلی میں شیخ رحیم بخش سوداگر کی کوٹھی میں تھا۔ 26 دسمبر 1873 کی شام میں مولوی سمیع اللہ خاں اور سید محمود نے بادشاہی مسجد، مسجد وزیر خاں کے علاوہ رنجیت سنگھ کی چھتری اور اس کے دیگر مقامات کو دیکھا۔ 28 دسمبر 1873 کو سرسید اور ان کے ساتھیوں نے شالی مار باغ دیکھا۔

29 دسمبر 1873 کو صدر کمیٹی کا جلسہ ساڑھے بارہ بجے دن میں راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں ہوا۔ اس جلسہ میں جدید اردو تنقید کے بانی مبانی مولانا الطاف حسین حالی موجود تھے۔ وہ حیات جاوید میں لکھتے ہیں:

''جس گرم جوشی کے ساتھ اہل لاہور نے ریلوے اسٹیشن پر سرسید اور ان کے ہمراہیوں کا استقبال کیا اور جس چاؤ اور امنگ اور فیاضی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ ان کی مدارات کی اور جس شوق سے لوگ بیرون لاہور سے سرسید کی آمد سن کر لاہور میں آئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید اور ان کے کام کی عظمت کا نقش عموماً اہل پنجاب کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ مگر 29 دسمبر کو جو لکچر سرسید نے راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں جہاں کئی ہزار آدمیوں کا مجمع تھا، دیا اس کا سماں مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ سامعین پر ایک سکتے کا عالم تھا اور کوئی ایسا نہ ہوگا جو زار و قطار نہ روتا ہو اور جو اپنی بساط سے زیادہ چندہ دینے پر آمادہ نہ ہو۔''

اسی جلسہ میں ہمارے زمانے کے رسالہ 'ادبی دنیا' لاہور کے ایڈیٹر صلاح الدین احمد کے والد احمد بخش بھی موجود تھے۔ وہ ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے لیکن انھوں نے اپنی بساط سے کہیں زیادہ زر تعاون پانچ سو روپیہ مدرسۃ العلوم کو دیا تھا۔ اس جلسہ کو مولوی سمیع اللہ خاں، سید محمود اور سردار محمد حیات خاں نے بھی خطاب کیا۔ جلسہ کے اختتام کے بعد سردار محمد حیات خاں کی رہنمائی میں

سرسید اوران کے ساتھیوں نے جہانگیر کا مقبرہ دیکھا۔

30 دسمبر 1873 کو 'انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب' نے سرسید کے اعزاز میں جلسہ کیا۔ اس زمانے میں اس کے سکریٹری سنسکرت اور انگریزی کے عالم نوین چندر تھے۔ انھوں نے سرسید کا استقبال کیا۔ انجمن کی جانب سے محمد حسین آزاد نے سرسید کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا جس میں ان کی دانشورانہ خدمات کا بڑے والہانہ انداز میں اعتراف کیا گیا ہے۔ سپاس نامہ کی تحریر محمد حسین آزاد کی ہے۔ اسی سفر کے دوران سرسید کی ملاقات اقبال کے استاد سید میر حسن سے ہوئی۔

31 دسمبر 1873 کو سرسید اوران کے رفقا 8 بجے کی میل ٹرین سے لاہور سے علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ ان لوگوں کے ساتھ برکت علی خاں امرتسر تک آئے۔ سرسید اوران کے ساتھی آغا کلب عابد کی کوٹھی میں فروکش ہوئے۔ امرتسر میں سرسید اپنے احباب محمد شاہ خاں، خواجہ محمد جان، شیخ غلام حسن منشی، محمد مہدی خاں اور سردار دیال سنگھ کے مکانوں پران سے ملنے کے لیے گئے۔

سرسید دربار صاحب بھی گئے۔ دربار صاحب میں جہانگیر کے مقبرے کے قیمتی پتھر نصب ہیں جس نے اس زیارت گاہ کی زینت بڑھادی ہے۔ شب میں آغا کلب عابد کے یہاں رات کا کھانا کھا کر یہ حضرات علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ امرتسر اسٹیشن تک آغا کلب عابد اور برکت علی خاں ساتھ آئے۔

دوسری بار سرزمین پنجاب 1884 میں سرسید کے قدموں سے مشرف ہوئی۔ اس سفر سے پہلے اردو میں نسائی تحریک کے قائد اول سید ممتاز علی کو 11 نومبر 1883 کے خط میں سرسید لکھتے ہیں:

''میرا ارادہ ماہ دسمبر میں پنجاب آنے کا ہے مقصد صرف خلیفہ محمد حسن صاحب سے پٹیالہ میں، گورداس پور میں سردار محمد حیات خاں سے اورلاہور میں آپ (سید ممتاز علی) سے اور برکت علی خاں سے ملنے کا ہے۔ غالباً ہمارے دوست محمد اسمٰعیل خاں رئیس دتاولی بھی ساتھ ہوں گے۔ میں تو مناسب نہیں سمجھتا کہ میرے وہاں آنے کی بابت کچھ زیادہ چرچا کیا جائے۔ اس کی دھوم دھام کیا۔ ہاں اگر کالج کے لیے کچھ چندہ مل جائے تو جو دھوم دھام چاہو کرو۔''

علی گڑھ سے 22 جنوری 1884 کو حاجی محمد اسمٰعیل رئیس دتاولی، سرسید کی بہن کے نواسے سید محمد علی، سرسید کے سفر نامہ پنجاب کے مرتب سید اقبال علی کے ہمراہ سرسید دہلی پہنچے۔ اس پارٹی میں یہاں اکرام اللہ خاں رئیس دہلی بھی شامل ہوگئے۔ 23 جنوری 1884 کو یہ حضرات لدھیانہ آئے۔ یہاں ان لوگوں کا قیام نواب علی محمد خاں کی کوٹھی میں تھا۔ 24 جنوری 1884 کو سرسید اور ان کے ہمراہی جالندھر کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں سرسید اوران کے رفقاء کنور ہرنام سنگھ اہلووالیہ کی کوٹھی میں ان کے مہمان ہوئے۔ 25 جنوری 1884 کو یہ قافلہ امرتسر کے لیے روانہ ہوا۔ یہاں ان کا قیام ہوٹل میں تھا۔ 27 جنوری 1884 کو سرسید اوران کے ساتھی گورداس پور کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں سردار محمد حیات خاں نے ان کی میزبانی کی۔

گورداس پور میں سرسید یہاں کے گوردوارے میں بھی گئے جہاں انھیں دستار اور خشک وتر میوے پیش کیے گئے جسے انھوں نے بڑے ادب واحترام سے لیا۔ 29 جنوری 1884 کو سرسید اوران کی پارٹی دوبارہ امرتسر گئی اوراسی ہوٹل میں مقیم ہوئی۔ جہاں پہلے قیام کرچکی تھی۔

اس سفر میں سرسید اور ان کے ساتھیوں کا گذر لدھیانہ، جالندھر، گورداس پور اورامرتسر کے اسٹیشنوں سے ہوا اور ہر اسٹیشن پر سرسید کے فدائیوں اور چاہنے والوں کا ایک انبوہ کثیر ان کے استقبال کو موجود ہوتا تھا۔ اُن مقامات پرانھیں ڈھیروں سپاس نامے بھی پیش کیے گئے۔

30 جنوری 1884 کو سرسید اوران کے ساتھی لاہور پہنچے۔ سید اقبال علی سرسید کے سفر نامہ پنجاب میں لکھتے ہیں: ''لاہور کے اسٹیشن پر ایسا سماں دکھائی دیا جیسا کہ الف لیلیٰ کے قصوں میں بیان ہوا ہے۔'' یہاں سرسید سے ملنے سیال کوٹ سے اقبال کے استاد سید میر حسن بھی آئے تھے۔ اخبار انجمن پنجاب اپنی 9 فروری 1884 کی اشاعت میں لکھتا ہے: ''مولوی سید احمد خاں بہادر 30 جنوری کی شام کو وارد لاہور ہوئے اور کڑی باغ میں مہاراجہ کپورتھلہ کی کوٹھی میں قیام فرمایا۔ اسی روز سے ان کی قیام گاہ زیارت گاہ بن گئی ہے۔'' پنجاب یونیورسٹی لاہور میں انھیں عصرانہ دیا گیا۔ جلسہ میں محمد حسین آزاد نے نظم پڑھی۔ لاہور کی متعدد تنظیموں نے انھیں مدعو کیا اور سپاسنامے پیش کیے۔ آغا محمد باقر کا بیان ہے کہ ''ان سب سپاسناموں کو میرے باوا جان محمد حسین آزاد نے بڑی عقیدت سے لکھا تھا''۔ ان میں پنجاب کی پردہ دار بیبیوں کی جانب سے جو سپاس نامہ محمد حسین آزاد نے لکھا تھا اس کے جہاں تہاں سے اقتباس پیش کررہا ہوں۔

''یا حضرت، آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک پنجاب میں بہت تھوڑی بیبیاں پڑھی لکھی ہیں۔ گھر میں بیٹھی اللہ اللہ کرتی ہیں اوراسی نعمت میں خوش ہیں جتنا سنتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ہندوستان کے لوگوں کو بہت سمجھایا ہے اور بہت جتایا ہے کہ یہ لوگ اپنی بد نصیبی سے جس مفلسی اور بدحالی میں پڑے ہیں یہ سب بے علمی کے سبب ہے۔ آپ کی ہدایتوں سے لوگ بہت سمجھ گئے اور تھوڑا ہو یا بہت ان باتوں کا خیال ہوگیا ہے۔ آپ نے سب کو بھلائی کا راستہ بتایا۔ خدا آپ کا بھلا کرے۔''

ہم سنتے ہیں کہ آپ نے علی گڑھ میں ایک مدرسہ بنایا ہے۔ اس میں بہت لوگ بڑے بڑے علموں کی کتابیں پڑھتے ہیں اور بڑی عزت کی نوکریاں پاتے ہیں۔ اللہ آپ کی اور آپ کی اولاد کی عزت بڑھائے۔

ہم نے سنا ہے کہ آپ نے بہت اچھی اچھی نئے نئے علموں کی کتابیں ان کے لیے تیار کرائی ہیں اور آپ اخبار بھی چھاپتے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے لوگوں کی بہت آنکھیں کھل گئی ہیں اور دل بڑے ہوگئے ہیں۔ خدا آپ کی نیت میں برکت دے۔

ہم نے سنا ہے کہ آپ نے اپنے مدرسہ میں ہمارے بچوں کے لیے رہنے سہنے کے گھر اور کھانے پینے اور آرام کی سب چیزیں بہت اچھی طرح بنوادی ہیں اور آپ اورآپ کے دوست ہروقت ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور دین آئین، نماز روزے کے لیے بھی تاکید کرتے ہیں۔ اس بات کو سن کر جس طرح پہلے بچوں کو باہر بھیجتے ہمارا جی ڈرتا تھا اب خاطر جمع ہوگئی ہے۔ اسی طرح آپ کا اورآپ کے بچوں کا اللہ نگہبان رہے۔

آپ جانتے ہیں کہ اولاد ماں باپ کو جان سے سوا پیاری ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ماں اپنے بچوں کو باپ سے کتنا زیادہ چاہتی ہے۔ سمجھ لیجیے کہ ہمارے دل مردوں سے کتنا زیادہ آپ کو دعائیں دیتے ہوں گے۔

آپ پیرومرشد ہیں، سید ہیں۔ آل رسول ہیں اور سب کی بھلائی کے لیے محنت کرتے ہیں۔ یہ نذرانہ غریبانہ کہ ماتھے کا پسینہ اور آنکھوں کا تیل ٹپکا کر جمع کیا ہے۔ آپ کے لائق نہیں لیکن مان کا پان ہے اور سچے دل کی نیاز ہے۔ امیدوار ہیں کہ قبول ہو۔''

سرسید کے دوسرے سفر پنجاب کی مفصل روئداد سرسید کا سفر نامہ پنجاب مرتبہ سید اقبال علی میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ محرم علی چشتی کے اخبار رفیق ہند، پنجابی اخبار، رہبر ہند، اخبار کوہ نور، اخبار انجمن پنجاب، عربی اخبار شفاء الصدور اورانگریزی اخبار ٹریبون میں اس سفر کی تفصیلات موجود ہیں۔

4 فروری 1884 کو سرسید اوران کے احباب لاہور سے علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ 4 بجے شام کو یہ لوگ جالندھر پہنچے اور یہاں سردار بکرمان سنگھ کی کوٹھی میں ان کے مہمان ہوئے۔ یہاں سرسید نے لکچر بھی دیا اورانھیں

سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا۔

جالندھر سے 4 فروری 1884 کی شب میں سرسید اوران کے رفقا، پٹیالہ کے لیے روانہ ہوئے۔ رات میں یہ لوگ راج پورہ اسٹیشن پہنچے اور یہاں ریاست پٹیالہ کے ڈاک بنگلہ میں قیام کیا اور علی الصباح پٹیالہ کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں سرسید کے آنے کا مقصد خلیفہ سید محمد حسن اور خلیفہ سید محمد حسین سے ملاقات تھی۔ یہ دونوں حضرات علی گڑھ کالج اور سرسید تحریک کے زبردست حامیوں میں تھے۔ پٹیالہ میں سرسید اوران کے احباب خلیفہ سید محمد حسن کی کوٹھی میں مقیم اوران کے مہمان ہوئے۔ یہاں دو دن ٹھہرنے کے بعد 6 فروری 1884 کو مظفر نگر کے لیے روانہ ہوئے۔ اس شہر میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بیٹے نواب اسحاق خاں انڈین سول سروس کے عہدہ پر مامور تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ لاہور سے مراجعت کے بعد سرسید اوران کے رفقاء مظفر نگر میں ایک دن قیام کریں یہ لوگ نواب اسحاق خاں کی کوٹھی میں فروکش ہوئے۔ انھوں نے بڑی محبت سے پارٹی کی تواضع کی۔ مظفر نگر کے اسکول میں سرسید کا لکچر ہوا اور انھیں عربی اور اردو میں سپاسنامے پیش کیے گئے۔ دوسرے دن یہ لوگ مظفر نگر سے علی گڑھ پہنچے۔

سرسید کا پنجاب کا تیسرا سفر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے اجلاس لاہور میں شرکت کے لیے تھا۔ اس اجلاس کے صدر سردار محمد حیات خاں تھے۔ یہ 27 دسمبر 1888 سے 30 دسمبر 1888 تک لاہور میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس میں 347 ممبر اور کئی سو وزیٹر شریک ہوئے۔ جلسہ میں سرسید نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں مفصل تقریر کی۔ نسائی تحریک کے قائد اول سید ممتاز علی بھی کانفرنس میں شریک تھے۔ کانفرنس میں کالجوں کے غریب طلباء کی امداد کے لیے کمیٹیاں بنائی گئی اور شادیوں کے اخراجات میں تخفیف کے لیے تجاویز پیش ہوئیں۔ کانفرنس میں مدرسۃ العلوم کے ہر دل عزیز پرنسپل تھیوڈور بک بھی شریک تھے جنھوں نے انگریزی میں تقریر کی جس کا برجستہ اردو ترجمہ شیخ عبدالقادر نے کیا۔ سرسید نے شیخ عبدالقادر کی نفیس اردو کی بڑی تعریف کی اور انھیں گلے لگالیا۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے اجلاس میں شرکت کے لیے سرسید 25 دسمبر 1888 کو علی گڑھ سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں اکثر ممبران کانفرنس اس گاڑی پر سوار ہوتے گئے۔ امرتسر اسٹیشن پر سرسید کے وفد کے لیے حاضری چنی گئی۔ جب یہ ٹرین لاہور اسٹیشن میں داخل ہوئی تو اسٹیشن پر ہزاروں افراد سرسید کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ ان پر پھولوں کی اتنی بوچھار کی گئی کہ سارا لاہور اسٹیشن پھولوں سے ڈھک گیا۔ اس کانفرنس کے مہمانوں کی رہائش اور آسائش کا اہتمام سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر اوران کے دوست محمد برکت علی خاں نے کیا تھا۔ مہاراجہ کپورتھلہ کی کوٹھی میں سرسید اوران کے ساتھیوں کے قیام کا انتظام تھا۔ اس میں تقریباً ساٹھ مہمان فروکش تھے یہ کوٹھی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ایک فرانسیسی جنرل نے بنائی تھی۔ جس کمرے میں سرسید مقیم تھے وہاں ہمہ وقت ان کے پنجابی دوستوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اس سفر میں بھی لاہور کے کالجوں کے طلبا نے انھیں سپاس نامے پیش کیے۔ سرسید نے اعتراف کیا ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس لاہور کا یہ اجلاس خوبیوں اور شان وشوکت اور انتظام کے لحاظ سے سب کانفرنسوں سے اول رہا اور اسی طرح وہ عملی کارروائی میں بھی قابل توصیف اور لائق تقلید ہوا۔''

سرسید کا پنجاب کا چوتھا سفر اپریل 1894 میں ہوا۔ لاہور میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے حامیوں اور مخلصین نے سرسید کو لاہور آنے کی دعوت دی تھی۔ اس وفد میں ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، محمد مزمل اللہ خاں، مرزا عابد علی بیگ، ذکاء اللہ کے بیٹے عنایت اللہ بی اے، نذیر احمد بی اے اور سرسید کے مخلص رفیق سید ممتاز علی جن کے نام سرسید کے سب سے زیادہ خطوط مکاتیب سرسید میں موجود ہیں، شامل تھے۔

یہ ڈیپوٹیشن 14 اپریل 1894 کو علی گڑھ سے لاہور کے لیے بمبئی میل سے روانہ ہوا اور 15 اپریل 1894 کو لاہور پہنچا۔ اسٹیشن پر تقریباً ڈھائی تین ہزار سرسید کے عقیدت مندوں نے ان کا استقبال کیا۔ سارا اسٹیشن پھولوں کا بچھونا ہو گیا تھا۔ اسٹیشن سے سرسید کی فرودگاہ تک دونوں طرف لوگ جھنڈیاں لیے کھڑے تھے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سکریٹری بھی بہ نفس نفیس اس وفد کے استقبال کے لیے کھڑے تھے اور اس ڈیلیگیشن کے اعزاز کے لیے جتنے جلسے ہوئے ان سب میں وہ شریک تھے۔ انجمن حمایت اسلام کے کارکنان اور انجمن کے کالجوں کے طلباء اسٹیشن سے سرسید کی قیام گاہ تک ساتھ گئے۔ اس وفد کے اعزاز میں جو اجلاس ہوئے ان میں پہلے جلسہ کے صدر سردار محمد حیات خاں تھے اور دوسرے اجلاس کے صدر محمد شاہ دین ہمایوں تھے۔ مذکورہ جلسوں میں سے کسی جلسہ میں بہ سبب ناسازی طبع سرسید شریک نہ ہو سکے۔ ان کو جتنے سپاسنامے پیش کیے گئے ان کے بھی وہ جواب نہ دے سکے۔ اپریل کے گرم موسم میں وہ علی گڑھ سے لاہور بہ حالت علالت گئے تھے تاکہ علی گڑھ کالج کے لیے ایض نورانی جمع ہو سکے۔ اس سلسلے میں ڈیپوٹیشن کو بڑی کامیابی ہوئی اور وزنی جیب کے ساتھ وہ علی گڑھ واپس ہوا۔

سرسید کے چوتھے سفر پنجاب کے دوران پنجاب کے بعض اخبارات نے اعتراض کیا تھا کہ اہل پنجاب کو مدرسۃ العلوم کے بجائے پنجاب کے اسکولوں کی امداد کرنی چاہیے۔ سرسید کو اس کا بھی افسوس تھا کہ لوگوں کے خیال میں معلوم نہیں کس سبب سے یہ بات جم گئی تھی کہ حامیان مدرسۃ العلوم مدرسہ حمایت الاسلام کے مخالف ہیں۔ سرسید نے لکھا ہے کہ وہ جو خود ''جو مسلمانوں کی تعلیم وترقی کی کوشش میں مصروف ہیں کسی ایسے کام سے جو مسلمانوں کی تعلیم وترقی اور تہذیب سے متعلق ہو، مخالفت ہونی محالات سے ہے، مگر ہاں یہ ان کی مستقل رائے ہے کہ مسلمانوں کی ترقی اعلیٰ تعلیم وتربیت سے ہوگی۔'' لیکن پنجاب میں سرسید کی مخالفت کا سب سے بڑا مرکز محرم علی چشتی کا اخبار رفیق ہند تھا حالانکہ وہ سرسید کے دوسرے سفر پنجاب کے دوران ان کے استقبال میں پیش پیش تھے اور انھوں نے اس موقع پر اپنے اخبار کا خصوصی ضمیمہ بھی شائع کیا تھا جس میں سرسید کو بے نظیر رہنما، اپنی صدی کا سب سے جلیل القدر عالم اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کا قائد بتایا گیا تھا۔ لیکن 1894 میں وہ سرسید کے جانی دشمن بن گئے تھے۔ اس انقلاب احوال کا معمہ ابھی تک لاینحل ہے۔ میری نظر سے رفیق ہند کے اس دور کے جتنے شمارے گذرے ہیں ان میں سرسید کے مذہبی افکار کو بنیاد بنا کر ان پر لعن طعن کی گئی ہے۔ لیکن سرسید کے مذہبی افکار تو 1870 سے معلوم ومعروف تھے۔ اغلب خیال ہے کہ انھیں سرسید سے کوئی ذاتی توقع تھی جو پوری نہ ہوئی ہو اور اسے انھوں نے مذہبی رنگ دے دیا ہو۔ اور سرسید اوران کے احباب اخبار رفیق ہند کی ملاحیوں کا نشانہ بنے ہوں لیکن ان سب کے باوجود پنجاب میں سرسید کی مقبولیت میں شمہ بھر کمی نہیں آئی اور اہل پنجاب نے ان سے وعدہ لیا کہ وہ موسم سرما میں سید محمود اور محسن الملک کے ساتھ آئیں گے۔ پنجاب کے اخبار 'اخبار عام' نے سرخی جمائی ''سرسید پنجاب سے فائز المرام واپس ہوئے''۔ یہی نہیں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سرسید نے انجمن حمایت اسلام لاہور کا ان کے برادرانہ برتاؤ کا شکریہ ادا کیا ہے۔

19 اپریل 1894 کو مدرسۃ العلوم کا یہ وفد لاہور سے علی گڑھ کے لیے روانہ ہوا۔ آٹھ بجے امرتسر پہنچا۔ ایک دن وہاں قیام کیا۔ 20 اپریل 1894 کو جالندھر پہنچا وہاں ایک روز ٹھہرا۔ جالندھر سے قریب بارہ بجے رات کو

سرسید جس تحریک کے پیغام کو لے کر پانچ بار پنجاب گئے تھے وہ کوئی عارضی مصلحتوں اور جزوی اصلاحات یا ہنگامی ضروریات کے تحت پیدا نہیں ہوئی تھی وہ ایک تہذیبی تحریک تھی جس کا مقصد تمام تر زندگی کی تطہیر تھا۔ اس میں تغیر اور تسلسل دونوں پر نظر تھی۔ سرسید نے جو کچھ کیا اس سے بہتر طریقہ آج اکیسویں صدی میں بھی اب تک سامنے نہیں آیا۔ اس تحریک کا خیر مقدم اہل پنجاب نے بڑے جوش وولولہ سے کیا۔ حالی نے لکھا ہے کہ قومی خدمات کی داد جو سرسید کو ملنی چاہئے تھی اس کا حق پنجاب کے برابر کسی صوبے سے ادانہ ہوسکا۔

علی گڑھ پہنچا۔ دوران سفر ہوشیار پور، گجرات، راولپنڈی، سیال کوٹ، جموں اور ملتان کے سرسید کے عقیدت مندوں نے ان سے التجا کی کہ مدرسۃ العلوم کا یہ وفد مذکورہ مقامات پر بھی آئے لیکن ابتدائے سفر سے سرسید کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وفدان جگہوں پر نہ جاسکا۔ اثنائے سفر میں جب ٹرین پانی پت پہنچی تو یہاں تقریباً چار پانچ سو افراد سرسید کے چاہنے والے موجود تھے۔ انھوں نے نہایت تکلف سے اس وفد کی تواضع کی۔

سرسید پانچویں دفعہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں شرکت کے لیے پنجاب گئے۔ یہ جلسہ 22 اور 24 فروری 1895 کو لاہور میں ہوا۔ سرسید، محسن الملک، حاجی محمد اسماعیل، رئیس دتاولی، مولانا شبلی اور خواجہ غلام الثقلین 20 فروری 1895 کو علی گڑھ سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ اسی اثنا میں پانی پت اور کرنال میں سرسید کے معتقدین نے ان سے درخواست کی کہ وفد ایک دن کرنال میں قیام کرے۔ 20 فروری 1895 کو شام سات بجے یہ ڈیلیگیشن کرنال پہنچا۔ یہاں اس کا قیام رستم علی خاں کی کوٹھی میں تھا۔ پانی پت سے مولانا الطاف حسین حالی مع دیگر اعزہ کے کرنال آئے۔ سجاد حسین کرنال میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ دوران قیام وہ سرسید اوران کے رفقاء کے ساتھ ساتھ رہے۔ 21 فروری 1895 کو رستم علی خاں کے دوسرے مکان میں وفد کے لیے خیر مقدمی تقریب ہوئی۔ جلسہ کی صدارت خان بہادر الطاف حسین نے کی۔ مولانا الطاف حسین حالی نے کرنال اور پانی پت کی جانب سے سرسید کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ میرا قیاس ہے کہ یہ سپاس نامہ حالی کا ہی تحریر کردہ تھا۔

لیکن یہ ان کے کلیات نثر حالی میں موجود نہیں ہے۔ اس سپاسنامہ کا جواب سرسید نے دیا۔ اس کے بعد محسن الملک نے تقریر کی۔ خواجہ سجاد حسین نے کرنال اور پانی پت کی جانب سے علی گڑھ کالج کے لیے زرتعاون پیش کیا۔ 21 فروری کی شام کو یہ ڈیپوٹیشن لاہور کے لیے روانہ ہوا اور 22 فروری کی شام کو ساڑھے چار بجے لاہور پہنچا۔ استقبال کے لیے انجمن حمایت اسلام کے سکریٹری مولوی شمس الدین اسٹیشن پر چشم براہ تھے۔ ان کے ہمراہ انجمن حمایت اسلام کے معززین اور کارکنان کے علاوہ انجمن اسلام کے کالجوں کے طلبا کا ہجوم تھا۔

لاہور پہنچ کر سرسید کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ وہ انجمن کے جلسوں میں شریک نہ ہوسکے۔ محسن الملک نے 24 فروری 1895 کو انجمن کے جلسہ کو خطاب کیا۔ ''انجمن حمایت اسلام کے دسویں سالانہ جلسہ کی مختصر کیفیت'' کے عنوان سے پنجاب گزٹ سیال کوٹ نے لکھا ''یہ جلسہ بڑی خوبی کے ساتھ سرانجام ہوا۔ وہ عالی جناب سرسید احمد خاں، محسن الملک اور مولوی شبلی نعمانی کی تشریف آوری کی وجہ سے تھا۔ پچھلے جلسوں کی بہ نسبت ہجوم زیادہ تھا اور کامیابی بھی زیادہ ہوئی۔ اس جلسہ میں ایک ایسے مستقل سرمایہ کے فنڈ کی بنیاد پڑی جو انجمن حمایت اسلام کو زیادہ گدائی سے بچاوے گا وہ یہ کہ ایک فنڈ 'سرسید فنڈ' کے نام سے قائم ہوا ہے جس میں سو حصے دار مقرر کیے گئے ہیں۔ ہر ایک حصہ سو روپیہ کا ہے۔ پس اس حساب سے ہر حصہ دار سو سو روپیہ جمع کرکے انجمن حمایت اسلام کے سپرد کردے گا۔ اس سے دس ہزار جمع ہوجاوے گا جس سے انجمن ایک خاص جائداد خریدے گی اور انجمن حمایت اسلام کے کالجوں کو استقلال ہوجائے گا۔''

علی گڑھ کالج کے وفد کی واپسی 24 فروری 1895 کو شام ساڑھے سات بجے لاہور سے ہوئی اور 25 فروری 1895 کو بارہ بجے یہ وفد علی گڑھ پہنچا۔

سرسید جس تحریک کے پیغام کو لے کر پانچ بار پنجاب گئے تھے وہ کوئی عارضی مصلحتوں اور جزوی اصلاحات یا ہنگامی ضروریات کے تحت پیدا نہیں ہوئی تھی وہ ایک تہذیبی تحریک تھی جس کا مقصد تمام تر زندگی کی تطہیر تھا۔ اس میں تغیر اور تسلسل دونوں پر نظر تھی۔ سرسید نے جو کچھ کیا اس سے بہتر طریقہ آج اکیسویں صدی میں بھی اب تک سامنے نہیں آیا۔ اس تحریک کا خیر مقدم اہل پنجاب نے بڑے جوش وولولہ سے کیا۔ حالی نے لکھا ہے کہ قومی خدمات کی داد جو سرسید کو ملنی چاہئے تھی اس کا حق پنجاب کے برابر کسی صوبے سے ادانہ ہوسکا۔

خدا کی برکتیں پنجاب اور پنجاب والوں پر
جنھوں نے ہر سفر میں تجھ کو آنکھوں پر بٹھایا ہے

(حالی)

مراجع وماخذ:

1۔ حیات جاوید۔ الطاف حسین حالی۔ اکادمی پنجاب لاہور
2۔ سرسید اقبال اور علی گڑھ۔ اصغر عباس۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1987
3۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1873، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
4۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1874، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
5۔ سرسید کا سفرنامہ پنجاب۔ سید اقبال علی۔ مجلس ترقی ادب لاہور
6۔ مکتوبات سرسید جلد دوم اسماعیل پانی پتی۔
7۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1883، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
8۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1884، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
9۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1887، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
10۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1888، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
11۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1889، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
12۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1893، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
13۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1894، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
14۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1895، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
15۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1896، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
16۔ اخبار 'الوقت' گورکھپور، 1892، کریمیہ لائبریری، انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی
17۔ اخبار 'گورکھپور' گورکھپور 1893، کریمیہ لائبریری، انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی
18۔ اخبار 'رفیق ہند' لاہور 1892، کریمیہ لائبریری، انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی
19۔ مقالات محمد حسین آزاد، مجلس ترقی ادب، لاہور
20۔ مکتوبات آزاد، مجلس ترقی ادب، لاہور
21۔ کلیات نظم حالی۔ مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور

■

Asghar Abbas
Gulshan Dost, Sir Syed Nagar, Civil Lines
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:9358209974

سید والا گہر اور بین المذاہب مفاہمت

مظفر حسین سید

بین المذاہب مفاہمت (یعنی انٹرفیتھ انڈراسٹینڈنگ) بظاہر ایک جدید اصطلاح ہے، تاہم یہ کوئی نیا تصور نہیں، بلکہ صدیوں قدیم ہے، اور اس کی اپنی تاریخ ہے۔ بین المذاہب تفہیم وافہام کا رواج دیرینہ ہے، ہمارے یہاں عہد قدیم میں مذہبی مذاکرے ہوتے تھے اور عہد وسطی میں بھی۔ یہاں سمراٹ اشوک، شہنشاہ اکبر اور شہزادہ داراشکوہ کے ذریعہ منعقدہ مباحثوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔

اس گفتگو میں مزید پیش رفت سے قبل یہ سوال برمحل ہے کہ ہمارے یہاں بین المذاہب مفاہمت کی خوشگوار ابتدا کب اور کہاں سے ہوئی۔ راقم نے عرض کیا کہ یہ روایت قدیم ہے، اب یہ بات دگر کہ اس وقت عصری علما، حکما، ارباب اختیار، نیز عوام الناس، اس عمل کے کسی اصطلاحی معنی سے آشنا نہ تھے۔ تاہم بحث وتمحیص وافہام وتفہیم کا ایک عمل جاری رہتا تھا اور بڑے صحت مند طریقے سے۔ حقیقت یہ ہے کہ وطن عزیز میں بین المذاہب افہام وتفہیم کے وکلا میں حضرت امیر خسرو، سنت کبیر، شہنشاہ اکبر و شہزادہ داراشکوہ کے مثل متعدد مردان دانا شامل ہیں۔ اس ضمن میں بالخصوص اکبر اور داراشکوہ کی خدمات پر مفصل گفتگو ہوسکتی ہے، تاہم سردست اس کا محل نہیں۔

اکبر اور دارا تو خیر بین المذاہب مفاہمت کے علم بردار تھے، لیکن کسی نہ کسی سطح پر یہ سلسلہ دیگر مغل حکمرانوں کے دور میں بھی جاری رہا۔ مثلاً جہاں گیر اور شاہ جہاں دونوں کے دربار میں مسیحی مبلغین کو تقریر کرنے اور اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کی اجازت تھی۔ اس کوتاہ قلم کو یہ دعویٰ کرنے کی اجازت دیجیے کہ داراشکوہ کے بعد ہماری تاریخ علم ودانش میں جس مفکر نابغہ نے بین المذاہب مفاہمت کو فروغ دیا، اس کو جدید رنگ ولباس عطا کیا، ایک منطقی شکل دی، اس کا نام نامی سید والا گہر یعنی سر سید تھا۔ اس میدان میں سید والا کی خدمات پر صفحات کے صفحات رقم کیے جاسکتے ہیں۔ تاہم مختصراً عرض ہے کہ موصوف نے انجیل مقدس کی تفسیر 'تبیین الکلام' تصنیف کی، 'احکام طعام فی اہل کتاب' کی ترقیم کی۔ مذہبی افہام وتفہیم کی غرض سے متعدد مضامین کی تسطیر کی، نیز آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کو باقاعدہ دعوت دی، ان سے 'آریہ سماج' کے سلسلے میں گفتگو کرکے اپنے اشکالات دور کیے اور دوسروں کو بھی آگاہ کیا۔

سید والا گہر وحید العصر تھے، نابغہ عہد تھے، ہستی نادر روزگار تھے، وہ محض مصلح قوم یا ماہر تعلیم نہیں تھے، بلکہ مفکر عظیم تھے، صاحب نظر تھے، صاحب فکر تھے، صاحب فلسفہ تھے، تمام تر امور دنیاوی، علمی وادبی کے مثل دین ومذہب کے باب میں بھی ان کا ایک مخصوص نظریہ تھا۔ جس کی روشنی میں انھوں نے اپنی شخصیت کی تعمیر وتوسیع فرمائی تھی۔ سید والا ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ہمرشتہ وحدت ادیان اور بین المذاہب مفاہمت کے زبردست حامی تھے۔ علاوہ ازیں سید والا گہر بین الاقوام یگانگت، قومی یکجہتی اور آزادیٔ رائے کے زبردست، داعی اور وکیل تھے۔ ان کی عظمت کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے نظریات کسی پر مسلط نہیں کرتے تھے۔

سید والا گہر کا نظریۂ مذہب کسی حد تک نظریۂ عام کے برعکس تھا۔ ان کا ایقان تھا کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے، ان کا خیال تھا کہ انسان کی ہستی کے دو حصے ہیں، اوّل معبود حقیقی کا حصہ اور دوئم معاشرے کا حصہ ان کے نظریے کے مطابق ہر دو میں توازن لازم ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب اور سیاست دو اشیائے جداگانہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اہل اسلام نے کسی دور میں بھی سیاسی امور کو الہامی امور خیال نہیں کیا۔ خود رسول اکرمؐ وخلفائے راشدین کے دور میں تمام دنیاوی فیصلے غور وخوض کے بعد، باہم مشاورت سے کیے جاتے تھے، یہ بات دل کو لگتی ہے۔ اگر تمام امور دنیاوی حتمی طور پر سراسر مذہب کے تابع ہوتے تو پھر کسی مجلس مشاورت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ تاریخ اسلام میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ غزوات سے قبل رسول اکرمؐ نے صحابہ کے مشورے کی اساس پر حکمت عملی ترتیب دی ہے۔ یہی روایت خلفائے راشدین کے دور میں اور مابعد بھی جاری رہی۔ ورنہ مسلم قائدین ہر موقع پر علماء کی مدد سے قرآن وحدیث سے استنباط کرتے اور عصری تقاضوں کے تحت اپنی عقل وفراست، نیز باہم مشورے سے بھی کوئی فیصلہ نہ کرتے۔ دراصل اس فلسفے کی روح یہ ہے کہ بلاشبہ قرآن حکیم رہبر اعظم ہے اور حدیث نبوی ہدایت نامۂ علوی۔ انہی کی روشنی میں بنیادی اصول ترتیب دیے جاتے ہیں۔ لیکن کسی موقع پر، کسی دنیاوی مسئلے کے درپیش آنے پر فوری فیصلے حکمران وقت اور ان کے مشیر اپنے علم، عقل وتجربہ کی بنیاد پر ہی کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ ان کے علم میں علم دین بہرحال شامل رہتا ہے۔

سید والا گہر کی روشن خیالی اور وسیع النظری کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ جب انھوں نے درسگاہ علی گڑھ میں شعبۂ دینیات قائم کیا تو نصاب کی تیاری، نیز اساتذہ کے انتخاب کے سلسلے میں دارالعلوم دیوبند سے رجوع کیا، مولینا قاسم نانوتوی سے مشورہ کیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے اپنے

مذہبی نظریات وخیالات کو کبھی درسگاہ پر مسلط نہیں کیا۔ مذکور ہے کہ خود سید والا نے ہندوستان کے دینی مدارس کے لیے ایک مکمل نصاب ترتیب دیا تھا۔ لیکن ان کا تیار کردہ نصاب کبھی ان کی قائم کردہ درسگاہ میں رائج نہیں کیا گیا۔

سید والا وحدت ادیان، بین المذاہب افہام وتفہیم، نیز مفاہمت کے زبردست وکیل تھے تاہم انھوں نے اکبر اعظم کی طرح نہ کوئی نیا دین ایجاد کیا، نہ کبھی خود کو مذہبی پیشوا قرار دیا اور نہ ہی کبھی اپنے احباب، مقلدین وشاگران عزیز کو مجبور کیا کہ وہ ان کے عقائد کی پیروی کریں یا ان کے نظریۂ مذہب کو لازماً تسلیم کریں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ سید والا کے تمام اقربائے حبیب، ان کے خیالات سے غیر متفق تھے۔ خواہ محسن الملک ہوں، وقار الملک ہوں، مولانا حالی ہوں یا علامہ شبلی نعمانی، ان تمام حضرات نے اپنے مرشد سے تمام تر عقیدت ومحبت کے باوصف، کبھی ان کے نظریۂ دین کو قبول نہیں کیا، بلکہ برملا تنقید کی۔ اس کے باوجود ان کے روابط باہمی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سید والا کے تمام رفقا ان کے اخلاص نیت ودیانت فکر ونظر کے صمیم قلب سے قائل تھے۔ یہ نہ صرف سید والا، بلکہ ان کے اہل حلقہ، ہر دو کی معاملہ فہمی اور فراست وعظمت کی دلیل ہے۔

اسلام بنیادی طور پر امن وآشتی کا علم بردار ہے، اس لیے اس مذہب کے پیشواؤں نے کبھی کسی مذہب کی مخالفت نہیں کی، بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ مسلم علما، فضلا، حتیٰ کہ حکمرانوں نے بھی عموماً مذہبی مفاہمت پر اصرار کیا۔ ہر دور میں علما ومفکرین نے مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعے کا اہتمام کیا، اور بین المذاہب افہام وتفہیم پر زور دیا۔ اسی روایت کی پیروی کرتے ہوئے، ہندوستانی علمانے بھی غیر اسلامی مذاہب کے فلسفہ وفکر کی تفہیم کی ممکنہ کاوش کی۔ تاہم اس باب میں سب سے اہم کردار سید والا گہر کا ہی ہے۔ انھوں نے اپنی سطح پر بین المذاہب مکالمے کی ابتدا کی، شناسا اہل فرنگ سے تبادلہ خیال کیا اور موقع بہ موقع مسیحی پادریوں سے گفتگو کا سلسلہ برقرار رکھا۔

راقم کی اس رائے کی توثیق پروفیسر خلیق احمد نظامی کی ایک عبارت سے بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

'وحدت ادیان' کے تصور پر سب سے پہلے سرسید نے موثر گفتگو کی تھی۔ مولانا آزاد نے اپنے زور بیان سے اس نظریہ کو ایک ادبی شاہکار بنادیا ہے، لیکن جس ذہن نے اس مسئلہ کی فکری اور اجتماعی اہمیت کا احساس سب سے پہلے ہندوستان میں کیا تھا وہ سرسید تھے۔ ان کی 'خطبات احمدیہ' اور 'تبیین الکلام' کے متعلق تو کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں تقابلی مطالعۂ مذاہب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سرسید کی مذہبی فکر کا تقاضا تھا کہ مذہبی تصورات پر مسلسل غور وفکر ہوتا رہے، اور زمانے کے مطابق اجتہاد سے گریز نہ کیا جائے۔ یہ فکر اگر ان بنیادوں پر آگے بڑھ جاتی، جو سرسید نے متعین کی تھیں تو ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی فکر کی بہت سی خلشیں دور ہوجاتیں۔'

(بحوالہ: مضمون، سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے، مشمولہ: کتاب۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک، از خلیق احمد نظامی)

بین المذاہب تفہیم کے سلسلے میں سید والا گہر کے کردار کو سمجھنے کے لیے اس عہد کے مذہبی پس منظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ جب سید والا نے اپنی تحریک اصلاح کا آغاز کیا، اس وقت کمپنی بہادر کی سرپرستی وہمت افزائی کے سائے میں یوروپ کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے پادریوں نے مسیحیت کی تبلیغ کے لیے ہندوستان کو کئی حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ مثال کے طور پر شمالی ہند، یعنی آج کے اتر پردیش اور بہار میں امریکہ کا میتھوڈسٹ چرچ، راجستھان میں آئرلینڈ کا رومن کیتھولک چرچ اور پنجاب میں اسکاٹ لینڈ کا بریزی ٹرین چرچ، سرگرم عمل تھے۔ اس خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرنے لیے مسلم علما نے مناظروں کا سلسلہ شروع کیا، تاکہ مسیحی علما کو مسکت جواب دیا جاسکے اور ان کی غلط تشہیر کے سبب عام مسلمان گمراہ نہ ہونے پائیں۔ واضح ہو کہ اس دور میں ہندو علماء کے ساتھ مناظروں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اس ضمن میں سید والا گہر کا موقف یہ تھا کہ مناظرہ بازی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس کی جگہ باہم گفتگو کرکے افہام وتفہیم کے ذریعہ کوئی درمیانی راستہ نکالنا چاہیے۔ موصوف کی ان مبارک کاوشوں کا ذکر مولانا الطاف حسین حالی نے تفصیل سے کیا ہے۔ ملاحظہ ہو، ان کا یہ اقتباس:

''مناظرہ کا طریقہ اس قدر غیر مہذب اور خراب ہوگیا تھا کہ کتابوں کے نام 'لٹھ، جوت، آرہ، درّہ، قیقاب اور کنطاپ' رکھے جاتے تھے۔ 'تہذیب الاخلاق' نے جہاں تک کہ اس سے ہوسکا تعصب کی جڑ کاٹی، تقلید کی بندشیں توڑیں، مذہبی تحریروں میں آزادی کی روح پھونکی۔ مذہبی حمایت کا فرسودہ طریقہ، جو اس زمانہ میں کچھ بکارآمد نہ تھا اس کی جگہ دوسرا طریقہ جو زمانے کے مناسب حال تھا جاری کیا۔ مناظرے کے ناپسندیدہ طریقے کی اصلاح کی اور اپنے طرز بیان سے اس طریقہ کی ایک مثال قائم کی، جس کی قرآن نے ہدایت کی ہے کہ، لوگوں سے عمدہ طریقے سے بحث کرو'۔

(بحوالہ: حیات جاوید، از، الطاف حسین حالی)

سید والا گہر کا ایک معروف انشائیہ ہے 'بحث وتکرار'، اس سے یہی سبق حاصل ہوتا ہے کہ مناظرہ فاصلے اور تلخیاں پیدا کرتا ہے اور ربط وقربت کی تمام راہوں کو مسدود کردیتا ہے۔ اس سلسلے میں خود سید والا کی ایک اور تحریر بھی ملاحظہ فرمایئے۔

''بڑے درجہ کی روحانی اور مذہبی تعلیم کے واسطے مختلف مذہبوں کی حقیقت پر مباحثہ کرنے کے لیے ایسوسی ایشن یعنی جماعتیں مقرر کی جائیں، جیسے کہ نہایت دانا اور نہایت اچھے ایشیا کے بادشاہ ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔ اور ایمان کا زر خالص، جن خراب باتوں سے پھیکا اور بدرو ہورہا ہے، ان برائیوں کو خاص خاص کمیٹیاں لوگوں کو جتایا کریں۔ اور مقدس اور معزز کتابوں پر غور اور تمیز سے بحث کی جایا کرے''۔

(بحوالہ: مقالات سرسید، مرتبہ، محمد اسماعیل پانی پتی)

سید والا نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ انھوں نے مناظرہ بازی سے گریز کرتے ہوئے، افہام وتفہیم کا سلسلہ شروع کیا۔ سید والا کی یہ مہم 1857 سے قبل ہی شروع ہوچکی تھی۔ اس دور کے ماحول کے بیان میں سید والا کے معترف ومدّاح، عیسائی پادری کرسچین، ڈبلو، ٹرال نے اپنی کتاب' سرسید احمد خاں: ری اورئنٹیشن آف مسلم تھیولوجی' میں بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کا ایک اقتباس پیش ہے۔

'' 1841 میں وہ (جرمن پادری فنڈرز) مبلغوں کے ایک چھوٹے سے حلقے، کرسچین مشنری سوسائٹی میں شامل ہونے کے لیے آگرہ آگیا۔ اسی زمانہ میں سید احمد نے منصفی کا امتحان پاس کیا، جو ابھی نیا نیا شروع ہوا تھا اور وہ اکبر اعظم کے دارالسلطنت، فتح پور سیکری میں منصف مقرر ہوئے۔ آگرہ جو ہمیشہ سے اسلامی تہذیب اور علوم کا مرکز رہا تھا اور اس وقت شمال، مشرقی صوبہ جات کا دارالحکومت تھا، مشنری سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اس زمانہ میں مشنری سرگرمیاں بہت تیزی سے پھیل رہی تھیں، 1830 کے اواخر تک متعدد مشنری سوسائٹیوں نے وہاں اپنے قدم جمالیے تھے وہاں (ان کی) کئی شاندار عمارتیں (بھی) تھیں اور سکندرہ میں 1839 میں قائم شدہ مشہور یتیم خانہ بھی تھا، جس میں 1840 کے بعد ایک پریس قائم ہوا اور 1842 کے بعد شمالی ہند بائبل سوسائٹی کا دفتر قائم کیا گیا''۔

(بحوالہ، سرسید احمد خاں: ری اورئنٹیشن آف مسلم تھیولوجی۔ از، کرسچین۔ ڈبلو۔ ٹرال)

بین المذاہب مفاہمت کے ضمن میں سید والا کی کتاب 'تبیین الکلام' ان کا ایک بے مثل کارنامہ ہے۔ یہ کتاب دراصل توریت اور انجیل کی تفسیر ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے خود عبرانی زبان پڑھی اور دو عبرانی داں یہودیوں کو ترجمے میں مدد کے لیے ملازم رکھا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ، 'بلاشبہ انسانیات کے مطالعہ کے سلسلہ میں سرسید کی یہ تصنیف بے مثل، ایک قابل قدر علمی کوشش

ہے۔ اس کے آخر میں جو حوالہ جاتی ضمیمے ہیں ان سے اس کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ 'حقیقت یہ ہے کہ 'تبیین الکلام' کی تصنیف سید والا کا ایک بنیادی کارنامہ اور دارا شکوہ کے 'سرِ اکبر اور مجمع البحرین' کے بعد بین المذاہب افہام و تفہیم کی اہم ترین کوشش ہے۔

سید والا گہر نے عیسائیوں کے علاوہ ہندوؤں سے بھی تعلقات کو استوار رکھا۔ ان کے کئی عزیز دوست، غیر مسلم، یعنی ہندو تھے، ان میں سرفہرست تو راجہ جے کشن داس تھے، مگر ان کے علاوہ بھی کئی حضرات تھے۔ جیسا کہ اوّلاً مذکور ہوا، بین المذاہب مفاہمت کی اپنی حکمت عملی کے تحت سید والا نے ایک مرتبہ 'آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کو اپنی رہائش گاہ پر تشریف لانے کی دعوت دی۔ اور وہاں اپنے متعدد مسلمان دوستوں کو بھی جمع کیا۔ ان سب کے سامنے سرسوتی جی نے تقریر کی اور اپنے مسلک و عقیدے کی صراحت کی۔ اس کے ثبوت میں ہندی کے مصنف، ویر بھارت تلوار کے اس اقتباس کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

''شیو پرساد نے دیانند سرسوتی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ دیانند سرسوتی نے ویدوں کا ڈنکا بجایا، لیکن جب انہوں نے ان کو ایک قابل احترام مسلمان دوست کے مکان پر تیس چالیس مسلمانوں کے سامنے وید پر تقریر کرتے اور وید پڑھتے دیکھا اور سنا تو ایشور کی مایا (مہما) یاد آگئی۔ شیو پرساد نے جس مسلمان دوست کا ذکر کیا ہے وہ سید احمد تھے۔ سید احمد خود ایک بڑے دینی مصلح تھے اور کئی معاملوں میں ان کے اور دیانند کے خیالات یکساں تھے۔''

(بحوالہ: سوانح، راجہ شیو پرساد۔ از، ویر بھارت تلوار)

سید والا گہر کی مذہبی بصیرت، ارفع و اعلیٰ سطح کی تھی۔ وہ انتہائی حدود تک عقلیت پسند تھے۔ خلاف فطرت و خلاف منطق کسی بات سے، خواہ وہ کہیں لکھی یا کہی گئی ہو، اتفاق نہیں کرتے تھے۔ ان کی اس دقاقت پسندی پر اعتراض تو ممکن ہے، لیکن ان کی حق پرستی و اخلاص نیت سے قطعاً اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ سید والا نے 'تہذیب الاخلاق' کے توسط سے شدید، جارحانہ مذہبی مناظرے اور غیر منطقی مناقشے کی ہیئت کو تکمیلاً تبدیل کرنے کی حتی الوسع کوشش کی۔

متشدد علما نے سید والا کو نیچری یعنی فطرت پرست کا خطاب دیا، تو انھوں نے بہ فخر و انبساط، اسے قبول کرلیا۔ اس ضمن میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے رقم کیا:

''جو ہمارے خدا کا مذہب ہے وہی ہمارا مذہب ہے۔ خدانہ ہندو ہے، نہ عرفی مسلمان، نہ مقلد، نہ لامذہب، نہ یہودی نہ عیسائی، وہ پکا، چھٹا ہوا نیچری ہے۔ وہ خود اپنے کو نیچری کہتا ہے۔ پھر اگر ہم نیچری ہوں تو اس سے زیادہ ہم کو کیا فخر ہے''۔

(بحوالہ: مقالات سرسید۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی)

سید والا بہ یقین کامل وحدت ادیان کے قائل تھے۔ ان کی نظر میں مختلف مذاہب میں باہم کوئی تصادم نہیں تھا۔ درحقیقت سید والا کی خدمات اس باب میں مشعل ماہ منور ہیں، نیز ان کے مضامین اس ضمن میں رہنمائی کی غرض سے آج بھی دستیاب، بامعنی و موثر ہیں، بشرطیکہ کوئی رجوع کرنے والا ہو۔

آج مناظرے کا نہیں مکالمے کا دور ہے، لہٰذا 'بین المذاہب مکالمے' کی ترویج ایک مبارک عمل ہے اور آج کے دور عالم گیریت و عالم کاری میں اس کی اہمیت دو چند بلکہ چہار چند ہوگئی ہے۔ مگر ستم ظریفی یہ کہ آج جبکہ یہ ایک عام نعرہ ہے کہ دنیا ایک عالمی گاؤں بن چکی ہے تو صارفیت، تجارت، سفارت، ثقافت، نیز جدیدیت کی رعایت سے خواہ پورا عالم ایک موضع بن چکا ہو، مگر جہاں تک نسلی و مذہبی مفاہمت کا تعلق ہے، یہ دنیا آج بھی منتشر ہے اور مکالمات کے باوجود، عملاً کوئی بڑی تبدیلی ظہور میں آتی نظر نہیں آتی۔ آج بھی ہر طرف مذہبی منافرت، فرقہ وارانہ تشدد و دہشت گردی کا دور دورہ ہے۔ مقام شکر ہے کہ اہالیان علم و دانش اس لعنت سے پاک ہیں۔

سید والا کے امتیازات میں یہ بات تکمیلاً روشن ہے کہ وہ تعصب کے شدید مخالف تھے۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ عصبیت اسلام کی روح کے خلاف ہے۔ تعصب کے موضوع پر ان کی کئی ترقیمات ہیں۔ ان کا واضح نظریہ تھا کہ کسی تہذیب، قوم اور کسی قائد یا عالم کو حقیر نہ سمجھا جائے۔ بلکہ جہاں جہاں محاسن و محامد نظر آئیں انھیں قبول کیا جائے۔ ان سے استفادہ کیا جائے۔ اسی نقطہ نظر کی برکت سے ان کے یہاں ایک مثالی توسع موجود ہے۔ اس ضمن میں سید والا گہر کی ایک نگارش مختصر، بعنوان: 'غیر مذاہب کے پیشواؤں کا ہم کو ادب کرنا چاہیے'، چشم کشا ہے، اس کا متن ملاحظہ ہو:

''ہم کو نہایت افسوس ہے کہ جب ہم مذہبی پیشواؤں کی کوئی کتاب دیکھتے ہیں تو اس میں ایک مذہب والا دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا بری طرح ذکر کرتا ہے۔ یہ امر مذہب اسلام کے برخلاف ہے۔ جس مذہب کے جو پیشوا ہیں، جب ہم اپنے مذہبی مباحثوں میں ان کا ذکر کریں، خواہ وہ لوگ ہندو ہوں یا پارسی، عیسائی ہوں یا یہودی یا خود مختلف عقائد کے مسلمان ہی ہوں، اگر ہم ان کے بزرگوں و پیشواؤں کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں گے تو کیا وجہ ہے کہ وہ اس طرح ہمارے بزرگوں اور پیشواؤں کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی سے پیش نہ آئیں، اس لیے خدا تعالیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے۔ 'مت برا کہو ان کو (جو) خدا کے سوا کسی اور کی عبادت کرتے ہیں، پھر وہ بڑھ کر نادانستگی سے خدا کو برا کہیں گے'۔ (سورۃ انعام) پس حقیقت میں غیر مذہب والوں کے پیشواؤں کو برا کہنا خود اپنے مذہب کے پیشواؤں کو برا کہنا ہے۔ علاوہ اس کے اخلاق اور متانت سے نہایت بعید ہے کہ ہم کسی مذہب کے پیشوا کا بے ادبی سے ذکر کریں۔''

(بحوالہ: تہذیب الاخلاق)

مذہب کے ضمن میں سید والا کا نظریہ یکدم صریح اور واضح تھا۔ خود ان کے الفاظ میں:

''میں نے مذاہب کی صداقت دریافت کرنے کے لیے اور مذہب کی جانچ کے لیے یہ اصول قرار دیا ہے کہ وہ فطرت انسانی کے مطابق ہے یا نہیں... اور مجھ کو یقین ہوا ہے کہ اسلام عین فطرت کے مطابق ہے.. ان لوگوں پر جنھوں نے دانستہ، فطری یا نیچری ہونے کا (اور) دوسرے معنوں میں مجھ پر الزام لگایا ہے، ان کو خدا کے سامنے اس کا جواب دینا ہوگا۔ خدا سب چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے جس طرح اس نے آسمان و زمین، دنیا و مافیہا اور تمام مخلوقات کو پیدا کیا اسی طرح اس نے نیچر (فطرت) کو بھی پیدا کیا۔ وہ جس طرح ہمارا اور تمہارا سب کا خالق ہے اس طرح نیچر کا بھی خالق ہے پس مخالفین کا یہ کہنا کہ میں نیچر کو خالق یا نعوذ باللہ نیچر کو خدا کہتا ہوں، کس قدر بہتان عظیم ہے، جس کو میں مخلوق کہتا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ وہ اس کو خالق کہتا ہے''۔

(بحوالہ: تقریر بہ مقام لاہور 1884، مشمولہ خطبات سرسید۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی)

اس ضمن میں موصوف کا ایک اور مختصر اقتباس:

''نیچر نے قوموں کی خصلتوں اور طبیعتوں کا اختلاف زیادہ تر ملک کی خاصیت پر رکھا ہے''

(بحوالہ: مکمل لیکچرز اینڈ اسپیچز۔ مرتبہ امام الدین گجراتی)

سید والا مختلف قوموں کے درمیان اتحاد، اتفاق، روابط باہمی اور مراسم باضوابط کے حامی اور وکیل تھے۔ ان کے خیال میں لفظ 'قوم' سے مراد ہندوستانی، یعنی ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے۔ اس ذیل میں ایک اور اقتباس:

''ہندو ہونا یا مسلمان ہونا، انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں''۔

(بحوالہ: مکمل لیکچرز اینڈ اسپیچز۔ مرتبہ امام الدین گجراتی)

لفظ قوم کے سلسلے میں سید والا گہر کا نظریہ یک دم واضح تھا۔ ان کے الفاظ میں:

''یوروپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے

ہیں، مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو ان میں دوسرے ملک کے بھی لوگ آ کر بس جاتے ہیں مگر وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلاتے ہیں۔ غرض کہ (زمانہ) قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے، گو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو و اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا (کسی) اور ملک کے رہنے والے ہو، کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو، یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے۔ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو، مسلمان اور عیسائی جو ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں۔ جب یہ سب گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدہ میں، جو ان سب کا ملک کہلاتا ہے ایک ہونا چاہیے''۔

(بحوالہ: مکمل لیکچرز اینڈ اسپیچز ۔مرتبہ، امام الدین گجراتی)

لاہور کی انڈین ایسوسی ایشن کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا:

''لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں میں لفظ 'نیشن' کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے لیے یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے... ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں۔ یہی مختلف وجوہات ہیں، جن کی بنا پر ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں، ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ 'ہندو' یعنی ہندوستان میں رہنے والی قوم، جس زمانے میں، میں قانونی کونسل کا ممبر تھا، تو مجھ کو خاص اسی قوم کی بہبودی کی دل سے فکر تھی''۔

(بحوالہ: خطبات سرسید۔ مرتبہ، محمد اسماعیل پانی پتی)

سید والا کا قوم و مذہب کے باب میں نظریہ واضح تھا۔ ان کے الفاظ میں:

''ہندو ہونا یا مسلمان ہونا انسان کا اندرونی خیال یا عقیدہ ہے، جس کو بیرونی معاملات اور آپس کے برتاؤ سے کچھ تعلق نہیں ہے''۔

(بحوالہ: مکمل لیکچرز اینڈ اسپیچز ۔از، امام الدین گجراتی)

وہ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

''دنیا میں دو قسم کے امور ہیں۔ ایک روحانی، دوسرے جسمانی، یا یوں کہو، ایک دینی دوسرے دنیاوی۔ سچا مذہب امور دنیاوی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا''۔

(بحوالہ: مقالات سرسید۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی)

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اس باب میں سید والا کے نظریات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس ضمن میں وہ رقم طراز ہیں:

''غالباً آج بھی متحدہ قومیت کا تصور، اس سے آگے نہیں پہنچا، جہاں سرسید نے پہنچا دیا تھا۔ سرسید کی بنیادی فکر میں فرقہ واریت کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ مختلف فرقوں میں اتحاد، ربط اور یگانگت کے قائل تھے... انیسویں صدی کے ہندوستان میں جس وضاحت اور پختگی کے ساتھ سرسید نے 'سیکولرازم' کا تصور پیش کیا وہ ان کے خیالات کی توانائی کو ظاہر کرتا ہے۔ جدید ہندوستان نے جن اصولوں پر اپنی تعمیر کا سامان مہیا کیا ہے۔ وہ سرسید کی فکر میں صاف شفاف نظر آتے ہیں... سرسید نے اپنی مذہبی فکر کی اساس عقلیت، تطبیق اور اجتہاد پر رکھی تھی۔ وہ اس روایتی مذہب کے، جو وراثت میں ملتا ہے، قائل نہیں تھے۔ کہتے تھے کہ 'مذہب کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کرنا بے معنی ہے'۔ مذہبی اصولوں کو فطرت انسانی کے مطابق ہونا چاہیے''۔

(بحوالہ: مضمون، سرسید کی فکر ونظر کے نئے زاویے، مشمولہ کتاب: سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے۔ از، خلیق احمد نظامی)

حقیقت یہ ہے کہ سید والا کی نظر میں مباحثہ بین المذاہب، سب سے مرغوب مشغلہ تھا، وہ ترقیم کا جواب ترقیم اور علم وفہم و دانش سے دینے کے حامی تھے۔ وہ یہودیت اور مسیحیت کو دینی اعتبار سے اسلام کے سب سے نزدیک خیال کرتے تھے۔ سید والا کی روشن خیالی اور آزادروی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ان کے اکلوتے پوتے کی رسم بسم اللہ ہوئی تو انہوں نے بچے کو اپنے غیر مسلم دوست راجہ جے کشن داس کی گود میں بیٹھایا۔ اس دلچسپ اور یادگار واقعہ کا ذکر ہارون خاں شروانی نے بڑے دل نشیں انداز میں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

''حیدرآباد کے سابق وزیر تعلیمات، میرے عزیز دوست اور مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر، سرراس مسعود مرحوم کی بسم اللہ کا کتبہ اسٹریچی ہال میں نصب ہے۔ اس مبارک موقع پر دوسرے معطیوں کی طرح سید احمد خاں نے اپنے پوتے کی تقریب پر پانچ سو روپے دے کر یہ کتبہ نصب کرایا۔ یہاں جو بات بطور خاص قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ تسمیہ خوانی کی یہ رسم جو بچے کی چار سال کی عمر میں ادا کی جاتی ہے اور جس میں بچے سے تبرکا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور قرآن (کریم) کی چند آیتیں پڑھوائی جاتی ہیں۔ یہ رسم اس انداز سے ادا کی گئی کہ مسعود اپنے دادا کے دوست راجہ جے کشن داس، رئیس مرادآباد کی گود میں بیٹھے ہیں اور مولوی صاحب انہیں بسم اللہ اور قل ہواللہ کا پہلا سبق دے رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ بہت سے بزرگ ناک بھوں چڑھائیں اور کہیں کہ سید احمد خاں کو اپنے پوتے کے بٹھانے کے لیے کسی مسلمان کی گود نہیں ملی، جو ایک ہندو کی گود میں بیٹھایا، مگر انھیں یہ نہیں معلوم کہ سید صاحب اس اعتبار سے کتنے وسیع المشرب تھے اور فرقہ واریت سے کتنے دور تھے۔''

(حوالہ: علی گڑھ میگزین، 1955، مدیر، نسیم قریشی)

مگر افسوس کہ اہل علم کے بعض حلقوں نے انغباض عدم توجہی، نیز تجاہل عارفانہ کے باہم انگیخت جذبات کے تحت سید والا کی فکر کو عمداً نظر انداز کیا۔

بہ ایں وجہ ناقدری قوم سے دل برداشتہ ہوکر سید والا گہر نے بڑی دل خستگی کے ساتھ کہا تھا:

''مجھ کو کہاں تک بچاؤ گے، میں تو ہدف تیر ہائے ملامت ہو گیا ہوں اور روز بروز ہوتا جاؤں گا۔ شاید میرے بعد کوئی زمانہ آوے، جب لوگ میری دل سوزی کی قدر کریں''۔

(بحوالہ: خطبات سرسید۔ مرتبہ، محمد اسماعیل پانی پتی)

خود سید والا کی پیش گوئی کے مطابق اب اس حکیم عصر کی قدر چہار دانگ عالم میں ہو رہی ہے۔ اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ علی گڑھ نے اپنے بانی و مربی، سید والا کے مقصد جلیل کو فراموش نہیں کیا ہے۔ کچھ عرصہ قبل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں باقاعدہ و باضابطہ ایک 'مرکز برائے بین المذاہب مطالعات'، یعنی سنٹر فار انٹر فیتھ اسٹڈیز قائم ہو چکا ہے۔

بطور اتمام گفتگو، سید والا گہر کی شان اقدس کی توصیف میں فکر کردہ خوشی محمد ناظر کا یہ شعر۔

بوسہ گاہِ قوم ہوگا تیرا سنگ آستاں
نقشِ پا پہ تیرے لاکھوں قافلے آنے کو ہیں

■

Dr. Muzaffar Husain Syed
29/11, Sir Syed Road, Darya Ganj
New Delhi - 110002
Cell: 9818827853 , 9211366940
E-mail: syedmh92@yahoo.com , syedmh92@gmail.com

نیلوفر حفیظ

مہاتما گاندھی کا تصور امن وآشتی

موہن داس کرم چند گاندھی ہمارے ملک وقوم کی ان عظیم، قدآور اور لافانی شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی جگہ آج تک ہندوستانی سیاست وقیادت کے میدان میں کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکی ہے اس بیدار ذہن، عدل پرست اور دوراندیش سیاست دان کو جو زمانہ میسر ہوا وہ ہندوستان کے لوگوں کی زندگی کے ہر شعبے میں انتشار، پراگندگی اور بدحالی کا دور تصور کیا جاتا ہے عوام وخواص دونوں ہی پریشان اور زبون حال تھے اپنے ہی وطن عزیز کی سیاست ومعیشت کی باگ ڈور غیر اقوام کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی، مذہب، اخلاق، شرافت اور انسانیت جیسی اعلیٰ اخلاقی اقدار کی کوئی اہمیت وحیثیت باقی نہیں رہ گئی تھی، امن وآشتی، اخوت وانسانیت اور محبت وشرافت جیسی بہترین انسانی صفات محض خواب وخیال کی باتیں بن کر رہ گئیں تھیں انگریزی حکومت کی حیلہ پروریوں، فریب کاریوں، سفاکانہ سازشوں اور جابرانہ فیصلوں نے ہندوستانیوں کی صفات دانشمندانہ اور جرات مردانہ کو گویا سلب کرلیا تھا ایسے نازک اور پرآشوب دور میں مہاتما گاندھی نے خواب غفلت میں پڑی ہوئی قوم کی بیداری کے لیے جو سیاسی حکمت عملیاں اختیار کیں اور کارہائے گرانقدر انجام دیے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں کہیں اور ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی ہے یوں تو کشور ہند کے عظیم جیالوں نے اس ملک کو آزاد وخود مختار بنانے میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور اپنے وطن عزیز کی آزادی کے لیے نہ صرف اپنا تمام تر سرمایہ داؤ پر لگا دیا بلکہ اس ملک پر اپنی جانوں کو قربان کر دینے میں بھی کبھی کسی قسم کی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔

گاندھی جی کا نظریہ سیاست وعمل ہمیشہ اپنی آزادی خواہ معاصرین کے طریقہ اظہار وعمل سے قدرے مختلف اور جداگانہ رہا اور ان کے یہ انفرادی نظریات وافکار ہی تھے جن کی وجہ سے اس عبقری شخصیت کے سامنے بڑے بڑے سیاست دان اور دانشوران سر تسلیم خم کرتے رہے ہیں ذیل میں ان کے ایک معاصر قومی کارکن مسٹر اندولال یاجنک کی مشہور کتاب 'گاندھی ایز آئی نو ہم' کے اردو ترجمہ کا ایک اقتباس نقل کیا جا رہا ہے جس کی روشنی میں مہاتما گاندھی کے ایک بہترین سیاسی رہنما ہونے ہی کی نہیں بلکہ شخصی اعتبار سے بھی ایک عظیم انسان ہونے کی بھی عکاسی ہوتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اپنے عہد میں گاندھی جی کی سیاسی اور عملی زندگی کے متعلق لوگوں کی کیا رائے تھی:

"وہ گاندھی جو بیک وقت درویش بھی تھا اور سیاست دان بھی دیکھنے میں سیدھا سادا اور خاکسارانہ اطوار کا حامل لیکن ایک ایسے عظیم الشان پیغام کا علمبردار جس کے بارے میں ہم سب کا خیال تھا کہ وہ ملک کی سیاسی زندگی میں ایک بہت بڑے انقلاب کا باعث ہوگا۔"[1]

مہاتما گاندھی ہندوستان کو انگریزی حکومت کی غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے انقلاب کے زبردست خواہشمند اور حامی تھے لیکن اس انقلاب کے نہیں جس میں غصہ، نفرت، خونریزی، بغاوت، لوٹ مار کو فروغ دیا جاتا ہے اور ایک دوسرے کو جانی دشمن، سفاک قاتل اور ظالم تصور کیا جاتا ہے بلکہ یہ دردمند سیاسی رہنما اور مصلح قوم اس انقلاب عظیم کا منتظر ومتمنی تھا جس کی بنیاد سچائی وایمانداری، صلح وآشتی اور انسانیت واخوت پر رکھی گئی ہو۔ گاندھی جی نے ہی اس ملک کی آزادی کے حصول کے لیے صلح وامن اور ستیہ گرہ واہنسا کا راستہ اختیار کیا اور بغیر کسی خون خرابے یا قتل وغارت گری کے آزادی حاصل کرنے کی نہ صرف پرزور وپرجوش وکالت کی بلکہ اس ملک کے لوگوں کے دلوں میں اس بات کی تشویق بھی پیدا کی کہ وہ امن وآشتی اور صداقت ودیانت کے راستے پر چل کر اپنے تمام حقوق کو حاصل کریں کیونکہ لڑائی جھگڑے اور خون خرابے کا خاتمہ صرف اور صرف ستیہ گرہ اور اہنسا کے ناقابل شکست ہتھیاروں کی مدد سے ہی ممکن ہے اور یہی وہ ہتھیار ہے جو ہندوستانیوں کو ان کی محکومیت اور تذلیل سے آزاد کرا سکتے ہے۔

یہ درست ہے کہ گاندھی جی انقلاب کو ہندوستانی عوام کا حق سمجھتے ہیں ان کے نزدیک حرکت وعمل، انقلاب کا دوسرا نام ہے

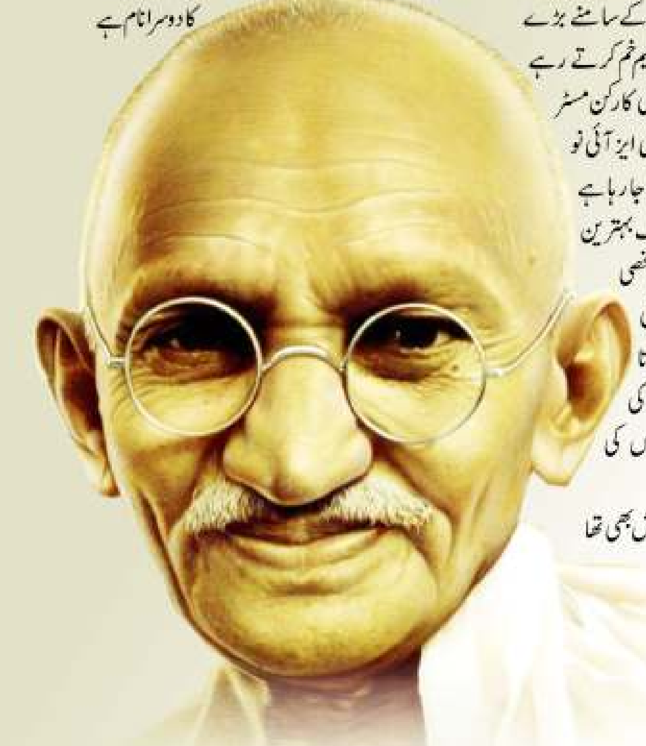

لیکن یہ حرکت وعمل کسی کی دل آزاری، بربادی اور خونریزی کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی دل سازی، غمگساری اور ملک کی ترقی کے لیے ہونا چاہیے، مہاتما گاندھی کو اس بات کا بھی پوری طرح احساس تھا کہ جب تک ہندوستان میں رہنے والے لوگ فرقوں اور ذاتوں میں خود کو تقسیم کرتے رہیں گے قومیت، مذہبیت اور وطنیت کی اہمیت کو اس کے حقیقی معنی میں سمجھنے کی کوشش نہیں کریں گے تب تک اس ملک وقوم کی آزادی کا حصول ممکن نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اپنے قول وعمل کے ذریعے وہ ملک میں اتحاد پیدا کرنے اور آپس میں مل جل کر زندگی گزارنے کی جابجا تلقین وتشویق دلاتے نظر آتے ہیں وہ کسی مخصوص

فرقے، جماعت یا مذہب کی سیاست وقیادت میں یقین نہیں رکھتے بلکہ مایوسی وقنوطیت کے دشمن، امن وسلامتی کے حمایتی اور ملک وقوم کے سچے رہنما اور مخلص دوست نظر آتے ہیں اس سلسلے میں گاندھی جی کے متعلق جواہر لال نہرو کی ایک رائے نقل کی جارہی ہے۔ نہرو جی گاندھی جی کی عظمت واہمیت کا تہ دل سے اعتراف کرتے ہوئے ان کو کچھ اس طرح خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

''اس نے تمام ملک کو زیروزبر کر کے رکھ دیا جو کسی بڑے سے بڑے انقلابی سے نہ ہو سکا.. اس نے اپنے مخصوص انداز میں بے اندازہ قوتوں کا خزانہ کھول دیا جو سطح سمندر کی ہلکی ہلکی، موجوں کی طرح پھیلتی چلی گئیں اور اپنے ساتھ کروڑوں آدمیوں کو بہا کر لے گئیں وہ رجعت پسند ہو یا انقلابی ہو لیکن یہ اسی کی ذات ہے جس نے ہندوستان کا نقشہ بدل دیا ایک پست اور بودی قوم کو عزم ووقار بخشا بیداری اور قوت پیدا کی اور ہندوستان کے مسئلے کو دنیا کا مسئلہ بنا دیا''[2]

ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں گاندھی جی پہلے ایسے شخص تھے جنھوں نے آزادی کے حصول کی جدوجہد کے لیے 'ستیہ گرہ' اور 'اہنسا' جیسے نظریات کا کافی بڑے پیمانے پر استعمال کیا ان کا ماننا تھا کہ سچ اور اہنسا کو چھوڑ کر اگر ہم کو سوراج جیسی نعمت ملے تو وہ نعمت نہیں بلکہ ایک زحمت ہے اور اس کا حاصل ہو جانا کوئی تعریف کی بات نہیں ہے اور اس طرح سوراج حاصل کرنے کے بجائے اس سے کنارہ کشی ہی زیادہ بہتر ہے' ستیہ گرہ' کا مطلب ہے دل سے، زبان سے اور عمل سے ہر حال میں سچائی کی پابندی کرنا اور اس کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب انسان نہ صرف یہ کہ خود سچائی کا پابند ہو بلکہ دوسروں کو بھی سچائی کے راستے پر چلنے کی تشویق وترغیب دلائے اور اہنسا کی اصل حقیقت یہ ہے کہ کبھی بھی اور کسی بھی قیمت پر کوئی ایسا کام انجام دینے کی کوشش نہ کی جائے جس کی وجہ سے دوسروں کو کسی قسم کی تکلیف یا رنج پہونچے یا کسی کی زندگی میں کوئی غیر ضروری رکاوٹ پیدا ہو اور یہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں یعنی سچائی کی پابندی بغیر' اہنسا' کے راستے کو اختیار کر پانا ممکن ہی نہیں ہے اور یہ ستیہ واہنسا ہی وہ نسخہ کیمیا ہیں جن کی مدد سے ناممکن کاموں کو بھی ممکن بنایا جا سکتا ہے ان اصولوں کو ہر انسان اپنی زندگی کے عملی اصول بنالے تو پورے دعوے کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کے مختلف انسانوں، جماعتوں اور قوموں کے مابین ہونے والے اختلافات واعتراضات، لڑائی جھگڑوں اور خون خرابے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فرو کیا جا سکتا ہے گاندھی جی کے ان امن پسندانہ نظریات وافکار نے نہ جانے کتنے لوگوں کو زندگی جینے کا قرینہ وسلیقہ بخشا اور بڑے بڑے سرکشوں، ظالموں، تند خو اور تنفر پھیلانے والے لوگوں کی فکر میں انقلاب عظیم برپا کر کے رکھ دیا:

''مہاتما گاندھی نے سچ اور اہنسا دونوں کو اپنی زندگی کا اصول بنایا تھا جو صرف منہ سے ہی نہیں بلکہ اپنی ساری زندگی کے ہر ایک کام سے انھوں نے اس کا سبق ہندوستانیوں اور ہر ایک انسان کو سکھایا''[3]

گاندھی جی کے نزدیک سچائی وایمانداری، صلح وآشتی اور انسانیت وشرافت کی اہمیت وافادیت سب سے بڑھ کر تھی انھوں نے ہندوستانیوں کو صرف انگریزی حکومت سے ہی آزادی دلانے کی کوشش نہیں کی بلکہ شخصی، معاشرتی اور قومی زندگی کی آزادی کی اہمیت سے بھی لوگوں کو روشناس کیا ان کا ماننا تھا کہ شخصی، سماجی اور قومی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے یعنی اگر کوئی شخص غلط کام کرتا ہے تو وہ سماج اور قوم کے حق میں بھی غلط ہی ہے جو چیز کسی انسان کے لیے انفرادی طور پر نقصان دہ ہے تو وہ چیز معاشرے اور قوم کے لیے بھی ہرگز فائدے مند نہیں ہو سکتی اس لیے ہر انسان کو پہلے انفرادی طور پر صادق، دیانتدار اور صلح جو ہونا چاہیے اس کے بعد سماج وملک کی فلاح وبہبود کی جانب توجہ کرنا چاہیے اگر انسان کا عمل خلوص، محبت اور ایمانداری جیسے جذبات سے عاری ہے تو پھر ایک بہترین معاشرے کا قیام ممکن نہیں ہے ان کے نزدیک انسانی محبت وشرافت اور سچائی وعدل کی کتنی اہمیت تھی اس کا اندازہ ان کی سوانح عمری 'حق کے ساتھ میرے تجربات کی کہانی' کی اس عبارت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

''جب میں مایوس ہوتا تو میں یاد کرتا کہ پوری تاریخ میں سچ اور محبت کے راستہ کی ہمیشہ جیت ہوتی ہے دنیا میں بڑے بڑے قاتل اور ظالم ہوئے ہیں جو ایک وقت میں نا قابل شکست لگے لیکن آخر میں وہ ہار گئے''[4]

ہندوستان کی ناسازگار فضا کو سازگار بنانے کے لیے جو دانشمندانہ، مفکرانہ اور امن پسندانہ حکمت عملیاں مہاتما گاندھی جیسے عظیم مفکر قوم وملت کے سچے رہنما کی طرف سے پیش کی گئیں اس کی مثال ہندوستان تو کیا دیگر اقوام کی تاریخی کتابوں میں بھی شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے گاندھی جی ہر اس کام کو کرنے سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں جس کے ذریعے کسی دوسرے کو معمولی سی بھی روحانی یا جسمانی تکلیف پہونچنے کا امکان ہو اور حق تو یہ ہے کہ اہنسا کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ انسان کی طرف سے کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس کی وجہ سے دوسرے رنج وغم میں گرفتار ہوں گاندھی جی نے اس زمانے سے جبکہ وہ سیاست کے میدان میں عملی طور پر داخل بھی نہیں ہوئے تھے، تبھی سے اس پر یقین رکھتے تھے کہ لڑائی جھگڑے اور خون خرابے سے کبھی کسی کا بھلا نہیں ہوا ہے اور نہ ہی مستقبل میں کبھی ہو سکتا ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ انسانیت کو تباہ کرنے والی تباہ کاریوں سے خود کو دور رکھا جائے اور سچ وشانتی کے راستے پر چلنے کی نہ صرف کوشش کی جائے بلکہ کسی بھی حال میں اس راستے کو نہ چھوڑا جائے، اور دوسروں کو بھی اس کی افادیت واہمیت کے بارے میں بتایا جائے اور ان کو عمل کرنے کی جانب مائل ومتوجہ کیا جائے گاندھی جی اپنے عدم تشدد کے اس فلسفے پر کس حد تک یقین رکھتے تھے اس کا اندازہ ان کی اس گفتگو سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے شمال مغربی سرحد کے جنگجو پٹھانوں کے متعلق کی تھی یہ پٹھان اکثر وبیشتر ہندوستانیوں پر حملہ آور ہوتے اور بے دریغ ان کا خون بہاتے تھے ان پٹھانوں کی سرکوبی کرنے یا ان کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے متعلق جب گاندھی جی سے ان کی رائے دریافت کی گئی تو انھوں نے ان ظالم لوگوں سے مقابلہ کرنے کی جو انوکھی تدبیر پیش کی اس کو سن کر سب لوگ متعجب ہو گئے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کیا اس طرح بھی دشمنوں سے جنگ جیتنا ممکن ہے ان کی کہی ہوئی یہ باتیں آج کی دنیا کے حکمرانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر اس انسان کے لیے توجہ وفکر کی متقاضی ہے جو امن وآشتی، ایثار وشرافت اور انسانیت ومحبت کو گزرے ہوئے وقت کی باتیں کہہ کر بے فکری بلکہ بے حسی کے ساتھ اپنے شانے جھٹک دیتا ہے وہ ان پٹھانوں کے خلاف بغیر کسی نازیبا کلمات کا استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''ہمیں عدم تشدد پر عمل ایک ایسی فوج تیار کرنی ہوگی جو رضا کارانہ طور پر پٹھان قبائل کے غیظ وغضب کا نشانہ بننے کے لیے آمادہ رہے اور ہندوستان کی سرزمین میں قدم رکھنے کے لیے ان پٹھانوں کو ان کی لاشوں پر سے ہو کر آنا پڑے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ بہادر لوگ اہنسا پر عامل اور مدافعت نہ کرنے والے ستیہ گروہیوں کو جان سے مارنا اور ان کی لاشوں کو پامال کرنا پسند نہ کریں گے اور ان کے دل سچائی اور پریم کی زبردست طاقت کے سامنے جھک جائیں گے چنانچہ میری رائے کے مطابق جدید اسلحہ اور مشین گنوں سے مسلح فوج کی بہ نسبت یہی ستیہ گرہ زیادہ بہتر طریقہ پر ہندوستان کا بچاؤ کر سکیں گے''[5]

گاندھی جی حکیمانہ نقطہ نظر سے ملک کے سیاسی، سماجی، اخلاقی اور مذہبی حالات کا مشاہدہ ومحاسبہ کرنے کے عادی تھے اور اس دور اندیش ہمارے سیاسی وقومی رہنما

کی دوربین اور دقیق بین نظروں نے بہت جلد یہ محسوس کرلیا تھا کہ کشور ہند کو زور زبردستی اور شدت وسختی سے انگریزی حکومت کے ظالم اور بے رحمانہ پنجوں سے نہیں چھڑایا جا سکتا آزادی چاہیے تو تمام ہندوستانیوں کو مل جل کر اس کے لیے کام کرنا پڑے گا، گاندھی جی نے انگریزی حکومت کو کمزور بنانے کے لیے ملک کے لوگوں سے غیر ملکی سامان کے بائیکاٹ کی خاص طور پر برطانوی اشیا کے استعمال نہ کرنے کی پرزور اپیل کی وہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھے کہ کوئی بھی طاقت ور قوم، کسی بھی دوسری قوم پر صرف اسی وقت تک حکومت کرسکتی ہے جب تک کہ محکوم قوم، حاکم قوم کے ساتھ تعاون وہم آہنگی کا جذبہ رکھتی ہے لیکن اگر محکوم قوم حکمرانوں کی ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف متحد ومنظم ہوکر صدائے احتجاج بلند کردے اور اس تعاون کو ترک کردے اور پھر اس پر کتنی بھی سختی اور شدت کیوں نہ کی جائے وہ چپ چاپ ان سب کو برداشت کرتی رہے تو بڑی سے بڑی مضبوط حکومت کو بھی زمین دوز ہونے میں بہت وقت نہیں لگے گا اور واقعی بہت جلد گاندھی کا یہ دعوی سچ بھی ہوگیا عدم تعاون کی اس تحریک نے ہندوستانیوں کے اذہان ودلوں میں برسوں سے قبضہ کیے ہوئے مغلوبیت، قنوطیت اور محکومیت کے جذبات کو ختم کرنے میں جو کردار ادا کیا وہ ساری دنیا کے لوگوں کے سامنے روز روشن کی طرح واضح اور صاف ہے کہ کس طرح اس مہاتما کے امن پسندانہ تصورات نے سرکش اور ظالم انگریزی حکمرانوں کو گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور ہونا پڑا اور اس ملک کو چھوڑ کر جانا ہی مناسب لگا۔

گاندھی جی نے اپنی تعلیمات وتحریکات کو کسی مخصوص مذہب، ذات یا قوم کے لیے محدود نہیں رکھا انھوں نے ہندوستان میں بسنے والے بہت سے مذہبوں کی تعلیمات کا وسیع النظری اور کشادہ قلبی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اس نتیجے کو اخذ کیا مذہب کوئی بھی ہو بنیادی تعلیمات تقریباً سب کی ایک ہی جیسی ہیں صرف خالق کائنات کی حمد وثنا کا طریقہ ایک دوسرے سے جدا ہے ان کے نزدیک ہندوستان میں رہنے والا ہر ہندوستانی اپنا دوست اور بھائی تھا ان کو اس حقیقت کا بخوبی احساس تھا کہ یہ ملک صرف اسی وقت خودمختار اور آزاد ہوسکتا ہے جب یہاں بسنے والے ہر شخص کو ایک ہی گھر اور خاندان کا فرد مان لیا جائے انھوں نے ہندو اور مسلم تہذیب میں یگانگت، ہم آہنگی اور یک رنگی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی انھوں نے دیگر مذاہب کے ساتھ ساتھ اسلام مذہب کا بھی گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کیا اور آپسی تفریق وتنفر کے جذبات کو مٹانے کے لیے کئی اہم کام کیے انھوں نے کہا کہ دونوں ہی مذاہب کی حقیقی روح بڑی حد تک ایک دوسرے سے مشابہت وہم آہنگی رکھتی ہے اپنے ان خیالات کا اظہار انھوں نے 24 جون 1934 میں پونہ میں یوم عید میلاد النبی کے موقع پر ایک جلسے میں شرکت کے دوران اپنی ایک تقریر میں کیا تھا وہ کہتے ہیں:

''آپ سب لوگ قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن تھوڑے ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں اگر آپ قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل کریں اور ہندو اپنی مذہبی کتابوں کی تعلیم کے عامل ہوں تو فرقہ وارانہ جھگڑے مٹ جائیں''[6]

مہاتما گاندھی مذہبی اعتبار سے بہت وسیع القلب اور صحیح الفکر انسان تھے۔ وہ ہندوستانیوں کے لیے محبت وآشتی اور اخوت وانسانیت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے انھوں نے جو کچھ بھی کہا پہلے اس پر خود عمل کرکے دکھایا اس کے بعد لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی تحریک دلائی ان کی شخصیت میں کچھ ایسی سحر انگیزی اور زبان میں ایسی جادو بیانی تھی کہ وہ اپنے حریفوں اور مخالفین کی تلخی ونفرت کو پلک جھپکتے ہی غائب کردیتے تھے کسی بھی انسان میں چاہے اختلاف، نفرت یا غصہ کتنا بھی شدید کیوں نہ ہو زیادہ وقت تک کے لیے ان سے ناراض نہیں رہ سکتا تھا اور یہی انسانیت اور محبت کا سبق وہ تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں بھر دینا چاہتے تھے جس میں وہ بہت بڑی حد تک کامیاب بھی تھے چنانچہ آزادی کی لڑائی میں ان کی آواز پر لبیک کہنے والوں میں بلا تفریق رنگ ونسل ومذہب کے سب لوگ شامل ہوتے تھے۔

گاندھی جی نے مارچ 1930 میں نمک پر ٹیکس لگائے جانے کی شدید مخالفت کی اور ایک تحریک چلائی جس کو نمک تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس میں تقریباً 400 کلومیٹر احمد آباد سے گجرات تک کا سفر پیدل طے کیا گیا اور ہندوستانیوں کو اس بات کی تشویق وترغیب دلائی گئی کہ وہ خود نمک کی پیداوار کریں اس تحریک میں ہزاروں ہندوستانیوں کی طرف سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا گیا انگریزی حکومت کو کمزور بنانے والی تحریکوں میں یہ سب سے زیادہ کامیاب اور طاقتور تحریک تصور کی جاتی ہے۔ گاندھی جی نے ہندوستانیوں کے دل میں جوش وہمت کے ساتھ ساتھ نازک اور پیچیدہ حالات سے مقابلہ کرنے اور اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی تلقین کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں حالانکہ اس تحریک کی شروعات میں لوگوں کی توجہ بہت زیادہ اس طرف مبذول نہیں تھی ان کا کہنا تھا کہ نمک سازی کے قانون کی خلاف ورزی کرکے ملک کی آزادی کے مقصد کو حاصل کر پانا بہت مشکل ہے لیکن گزرتے وقت وحالات نے ان کے معترضین کو بہت جلد یہ احساس کرادیا کہ گاندھی جی کا یہ قدم ایک دم درست اور صحیح تھا جس کو وہ سمجھ نہیں سکے:

''دوسرے قومی رہنما یہ سن کر حیرت زدہ رہ گئے کہ کہاں قومی جنگ اور کہاں نمک لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ نمک کا لفظ یکا یک جادو کا ایک منتر بن گیا... لوگ اس قومی فوج کے کوچ کے حالات کو روز بروز دیکھ رہے تھے جو گاندھی جی کی رہنمائی میں نمک بنانے کے لیے دھاوا کررہی تھی''[7]

گاندھی جی نے صرف نمک تحریک ہی نہیں بلکہ اپنی ہر تحریک کے ذریعے ملک کے لوگوں کو یہی پیغام دیا کہ وہ پرامن طریقے کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی پوری ہوش مندی اور عقلمندی کے ساتھ ان ابتر حالات پر قابو پانے کی کوشش کریں کیونکہ صرف سمجھداری، محبت اور صلح جوئی کے راستے پر چل کر ہی مشکل جنگوں کو جیتا جا سکتا ہے۔

اب میں بیدل عظیم آبادی کے اس فارسی شعر سے اپنے اس عظیم، معتبر اور مفکر قوم کو خراج عقیدت پیش کرتی ہوں۔

خورشید خرامید فروغی بہ نظر ماند
دریا بہ کنار دگر افتاد گہر ماند

(ترجمہ: آفتاب غروب ہو چکا ہے لیکن اس کی تابانی یادرخشندگی ابھی تک نظروں کو خیرہ کررہی ہے حالانکہ اب دریا دوسرے کنارے پر پہونچ چکا ہے لیکن ساحل پر گہر چھوڑ گیا ہے)

ماخذ ومنابع

1۔ پیر سابرمتی، مسٹر اندو لال۔ کے۔ یاجنک، ترجمہ محمد ظفر انصاری، دانش محل فیض گنج، دہلی، 1943، صفحہ نمبر 4

2۔ جواہر لال کی کہانی، محمد رحیم دہلوی، نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی، 1942، ص نمبر 365

3۔ باپو کے قدموں میں، راجندر پرشاد ترجمہ محمد عبدالغفار، انجمن ترقی اردو ہند، 1953، صفحہ نمبر 715

4۔ تلاش حق، مہاتما گاندھی مترجم ڈاکٹر عابد حسین، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرولباغ دہلی، صفحہ نمبر 40

5۔ پیر سابرمتی، مسٹر اندو لال۔ کے۔ یاجنک، ترجمہ محمد ظفر انصاری، دانش محل فیض گنج، دہلی، 1943، صفحہ نمبر 11۔

6۔ جواہر لال کی کہانی، محمد رحیم دہلوی، نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی، 1942، ص نمبر 20-419

7۔ جواہر لال کی کہانی، محمد رحیم دہلوی، نیا کتاب گھر اردو بازار دہلی، 1942، ص نمبر 169

■

Dr. Neelofar Hafeez
Asst Prof. Dept of Arabi wa Farsi
Allahabad University
Senate House, University Road, Old Katra
Allahabad - 211002 (UP)

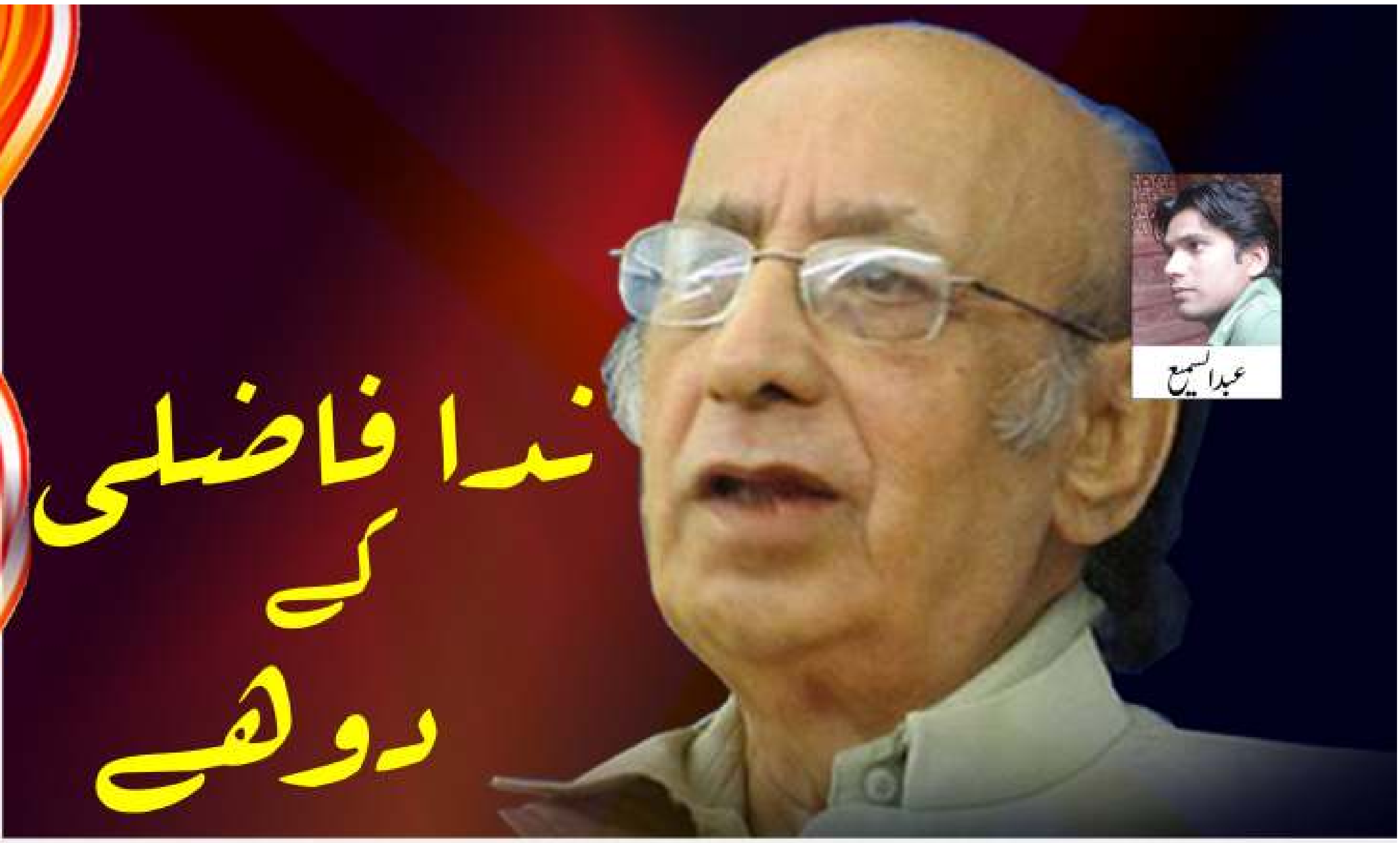

ندا فاضلی کے دوہے
عبدالسمیع

ندافاضلی کی شہرت اور مقبولیت کا دائرہ بہت وسیع ہے اگر یہ کہا جائے کہ شہرت اور مقبولیت کا سفر ندا فاضلی سے زیادہ ان کی تخلیقات نے طے کیا ہے تو کچھ بے جانہ ہوگا۔ میں نے اپنا مطالعہ ان کے دوہے تک محدود رکھا ہے۔ دوہا سنسکرت، اودھی اور ہندی کے اثر سے اردو میں آیا ہے۔ اس صنف کو کبیر، سور، تلسی، میرا، ان سے پہلے رحیم اور رسخان وغیرہ نے ایک خاص مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ ہندوستانی اصناف سخن میں دوہے کو وہی اہمیت حاصل ہے جو عربی اور فارسی میں غزل کو ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دوہا فنی اعتبار سے بھی غزل سے بہت قریب ہے۔غزل کا فنی امتیاز یہی ہے کہ اس کا ہر شعر اپنے آپ میں مکمل ہوتا ہے، اگر غزل کے مطلع کو دوہا کے مقابلے میں رکھ کر دیکھیں تو سوائے تہذیبی وراثت اور عروض و بحر کے، دونوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ دوہا ہندی عروض کے ساتھ ہندوستان کی شعری، لسانی اور تہذیبی وراثت کا پابند ہے جبکہ کلاسیکی اردو غزل کی شریانوں میں عربی اور فارسی شعروادب کا خون رواں ہے۔ موضوعاتی سطح پر دوہا کا رشتہ کبھی رباعی، کبھی قصیدہ اور کبھی شہر آشوب سے قائم ہوجاتا ہے۔ دوہا کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ابتدا سے ہی عوامی زندگی سے وابستہ رہا ہے، جس کی وجہ سے اس کی لفظیات اور تلازمات بھی عوامی زندگی سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے اس کی زبان سادہ مگر پراثر ہوتی ہے۔ یہ صنف مرصع کاری کی متحمل نہیں۔ ندافاضلی کا شعری مزاج بھی سادہ کاری سے تشکیل پایا ہے۔

دوہا ہمیشہ سے سماجی مسائل کو پیش کرتا رہا ہے۔اس کا شاعر سامنے کی باتوں کو مانوس الفاظ میں کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس میں تازگی اور انوکھا پن پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دوہا میں اشیا اور مسائل کی قلب ماہیت ہوجاتی ہے تو شاید بے جانہ ہو۔ ندافاضلی کو اپنے زمانے کے حالات اور اس کی کربناکی کا ادراک تھا، وہ اپنے دوہوں میں انسانی اور معاشرتی مسائل کو پیش کرتے ہوئے کھردرے الفاظ کو بھی رچاؤ اور خوش سلیقگی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ یہ دوہا ملاحظہ کیجیے۔

سودا لینے ہاٹ میں، کیسے جائے نار
چاقو لے کے ہاتھ میں بیٹھا ہے بازار

سودا، ہاٹ، نار، چاقو، بازار جیسے الفاظ روزمرہ کا حصہ ہیں۔ ہاٹ اور بازار میں جو نسبت ہے اس سے سبھی واقف ہیں۔ ہاٹ عام طور پر چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں شام میں لگتا ہے۔ بازار بھی اسی قسم کی چیز ہے لیکن اس کا دائرہ کچھ بڑا ہوتا ہے۔ دوہے میں لفظ 'نار' ناری یا عورت کی نمائندگی نہیں کررہا ہے بلکہ یہ لفظ ایسے تمام لوگوں کو محیط ہے جن میں معصومیت اور خارجی دنیا سے ناآشنائی ہوتی ہے۔ جو چالاکی اور عیاری سے کام لینا نہیں جانتے اور اپنی فطری معصومیت کے سبب تمام لوگوں کو اپنی طرح بے ضرر سمجھتے ہیں۔ دنیا جس تیزی سے تبدیل ہوئی ہے، اس کی اخلاقی اور تہذیبی قدریں جس طرح سے پامال ہوئی ہیں، اسے بیان کرنا بھی مشکل ہے۔ تبدیلی ایک ناگزیر عمل ہے۔ مثبت تبدیلی انسانی زندگی کو پائیدار ترقی کی طرف لے جاتی ہے جبکہ منفی تبدیلی تہذیب و تمدن کو زیربار کرتی ہے۔ ندا فاضلی نے یہاں سامنے کی مثال کے ذریعہ تبدیلی کے نظام کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مختلف مذاہب کی علامتوں اور استعاروں کی مدد سے ایک نیا جہان معنی آباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مذہب کو اس کی روحانیت کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب انسانی اقدار سے روگردانی نہیں کرتا لیکن مادہ پرستی نے مذہب کو بھی نام ونمود کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ ندا فاضلی کا یہ دوہا اسی جانب اشارہ کرتا ہے۔

بچہ بولا دیکھ کر مسجد عالیشان
اللہ تیرے ایک کو اتنا بڑا مکان

ندافاضلی جس روایت کے پاسدار ہیں اس کی فکری اساس نظیر، سور، تلسی، کبیر، وارث شاہ اور بلھے شاہ کے ساتھ ساتھ سرمد اور منصور کے افکار پر قائم ہے۔ ندافاضلی کا شاعرانہ تیور بھی وہی ہے جو مذکورہ لوگوں کے یہاں ہے۔ کبیر مسجد اور مندر کو ایک جیسا پاتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ دونوں مقامات ابتدا میں روحانیت سے عبارت رہے لیکن جب ان میں مادیت کے عناصر نمو پانے لگے تو یہ رفتہ رفتہ اپنے اساسی مقصد سے منحرف ہوگئے اور یہ صرف رسم کی صورت میں باقی رہ گئے۔ ندافاضلی کو مندر و مسجد اور دوسری عبادتگاہوں میں وہی گورکھ دھندہ نظر آتا ہے جسے کبیر نے دیکھا اور محسوس کیا تھا۔ انھیں مسجد کے عالیشان ہونے کا شکوہ اور بچے کے بے مکان ہونے کا احساس ہے تو مندر کا چڑھاوا اور نذر و نیاز بھی روحانیت

اور انسانی اقدار سے خالی نظر آتی ہے۔

اندر مورت پر چڑھے، گھی، پوری، لوبان
مندر کے باہر کھڑا، ایشور مانگے دان

ندا فاضلی کی شاعری میں مذہب کی سیاست جس طرح سے بے نقاب ہوئی وہ ہماری شعری روایت میں نئی تو نہیں ہے لیکن ان کا اسلوب کلاسیکی روایت سے الگ ہے۔ وہ قاری کو اپنی سمجھ اور اپنے تجربات و مشاہدات پر بھروسہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ندا فاضلی زندگی اور مذہب دونوں میں اجتہاد کے قائل ہیں۔ وہ کلیہ اور کلیشے کو نہ صرف رد کرتے ہیں بلکہ قاری سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات سے دنیا کو دیکھے، پرکھے پھر اس کی صداقت کو قبول کرے۔

وہ صوفی کا قول ہو یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتی آپ پر، اتنا ہی سچ مان

صوفی، قول، پنڈت، گیان یہ الفاظ مذہب سے وابستہ ہیں۔ پہلے دو الفاظ اسلامی روایت سے متعلق ہیں، ہندوستان میں یہ دونوں الفاظ مذہبی انتہا پسندی کے مقابلے میں مذہب کا متوازن سماجی اقدار پیش کرنے کی روایت سے منسلک ہیں۔ پنڈت اور گیان کا تعلق سناتن دھرم سے ہے۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیبی روایت میں پنڈت اور گیان 'صوفی اور قول' کے متوازی قرار دیے گئے ہیں۔ قول اور گیان کے دائرے میں وہ تمام ملفوظات اور اشلوک آجاتے ہیں، جنھیں مختلف مذاہب کے علما نے مختلف اوقات میں عوام کو 'راہ راست' پر لانے یا 'حصول نجات' کے لیے کچھ اصول وضع کیے تھے۔ سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان ملفوظات میں کتنی صداقت ہے۔ نیز ان کی صداقت آج کتنی معنویت رکھتی ہے۔ اگر ان کی معنویت موجودہ زندگی میں ہے تو اس کا ادراک بھی انسان کو اس کے اپنے تجربے اور مشاہدے سے ممکن ہے۔ اس دوہے میں یہ معنی بھی پوشیدہ ہے کہ خواہ مخواہ کے جھمیلوں میں پڑنے سے بہتر ہے کہ وہ خود کو اپنے مشاہدے تک محدود رکھے۔ ندا فاضلی نے مذہبی اجارہ داری اور مادہ پرستی کو کئی دوہوں میں پیش کیا ہے۔

ساتوں دن بھگوان کے، کیا منگل کیا پیر
جس دن سوئے دیر تک بھوکا رہے فقیر
سب کی پوجا ایک سی، الگ الگ ہر ریت
مسجد جائے مولوی، کوئل گائے گیت
چاہے گیتا باچیے یا پڑھیے قرآن
میرا تیرا پیار ہی، ہر پستک کا گیان

اس میں شک نہیں کہ مذہب انسان کو کئی سطحوں پر متاثر کرتا

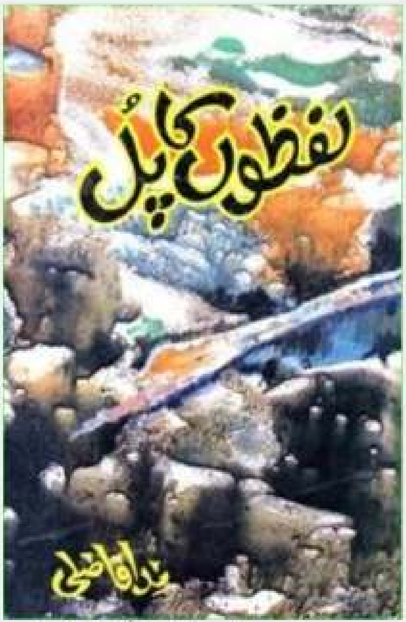

ہے۔ مذہب کے اس پہلو سے بھی انکار ممکن نہیں کہ افکار و خیالات کی بنیاد پر وہ انسان کو خانوں میں تقسیم بھی کرتا ہے۔ تقسیم کے اس عمل میں انسانی زندگی کو بہتر بنانے کا مقصد مضمر ہے۔ یہ تفریق بہتر سے بہتر زندگی کے حصول کو آسان بنانے کا ذریعہ بھی ہے لیکن تقسیم اور تفریق کے اساسی مقصد کا سہارا لے کر مذہب کی سیاست بھی ہوتی رہی ہے۔ مذہب کی صداقت اور فوائد سے انکار ممکن نہیں لیکن یہ اسی وقت کارآمد ہو سکتا ہے جب تک مذہب اپنی روحانیت کے ساتھ ہماری زندگی میں شامل رہے۔ مذہبی رسوم میں مذہب کی روح پیوست ہو ایسا لازمی نہیں۔ بہت سے رسوم جغرافیائی اثرات سے بھی مذہب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ 'رسم اذاں' رہ جاتی ہے جبکہ 'روح بلالی' ختم ہونے لگتی ہے۔ آج ہم جس ماحول میں سانس لے رہے اس میں روحانیت کی شدید ضرورت ہے۔ روحانیت کسی ایک مذہب سے مخصوص نہیں بلکہ اس کا تعلق احساسات سے ہے۔ انسان جب مذہب، نسل، رنگ اور جغرافیائی امتیاز سے بلند ہو کر انسانی اقدار کی بنیاد پر زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے یہ دیواریں پست اور بے معنی معلوم ہونے لگتی ہیں۔

ندا فاضلی کی شاعری بالخصوص دوہوں کے موضوعات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی نگاہ عرفان ذات، انسانی دکھ پر رہتی ہے ساتھ ہی وہ انسانی قدروں کی پامالی، خاندانی رشتوں کی بے حرمتی اور مذہبی اجارہ داری کے خلاف ایک محاذ قائم کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ انسان کو اپنی مٹی اور تہذیب سے جو والہانہ عشق ہو سکتا ہے اس کی بہترین صورت ندا فاضلی کی شاعری میں موجود ہے۔

ہمارے معاشرے میں مذہب کا جو مقام ہے اور اس کے نام پر جس طرح کا استحصال کیا جاتا ہے، ندا فاضلی کے دوہوں کی مدد سے اس کی ایک دھندلی تصویر پیش کی جا چکی ہے۔ انسانی زندگی میں مذہب ایک بڑی صداقت کے طور پر شامل ہے لیکن مذہب سے الگ بھی بہت کچھ ہوتا ہے جس سے انسان کی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ ضروریات زندگی میں بھوک مٹانے کے لیے روٹی اور تن کے لیے کپڑا مبادیات کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کے بعد انسان سر چھپانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ دربدری اور بے سروسامانی میں انسان جس کرب سے گزرتا ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں، ایسے حالات میں انسان خدا کو یاد تو کرتا ہے لیکن یاد کے اس اضطراری عمل میں فریاد، شکوہ اور آہ و زاری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے گھر، اپنے گاؤں اور اپنی مٹی کو کبھی نہیں بھول پاتا، اس سے الگ ہو کر اس کے حصول کی خواہش سے دل ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہوتا۔ ڈار سے بچھڑا ہوا شخص بار بار اس کی جانب لوٹ جانا چاہتا ہے۔ وہاں کی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں کشش محسوس کرتا ہے اور معمولی سی شے (جس کی موجودگی میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی) کے گم ہو جانے کا ماتم ایسے کرتا ہے جیسے کوئی بہت قیمتی شے کھو گئی ہو۔ ندا فاضلی کے یہاں اس قسم کی ناسٹلجیائی کیفیت ملتی ہے، جس میں کچھ کھو جانے کا درد محسوس کیا جا سکتا ہے۔

گھر کو کھوجیں رات دن، گھر سے نکلا پاؤں
وہ رستہ ہی بھول گیا، جس رستے تھا گاؤں
سنا ہے اپنے گاؤں میں رہا نہ اب وہ نیم
جس کے آگے ماند تھے سارے وید حکیم
بوڑھا پیپل گھاٹ کا، بتیائے دن رات
جو بھی گزرے پاس سے سر پر رکھ دے ہاتھ

گھر کو کھوجیں رات دن کا مطلب بہتر اور آسودہ زندگی کی تلاش ہے۔ تلاش ایک ایسا راستہ ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ ایک معنی میں یہ لاحاصلی کا سفر بھی ہے۔ اس سفر میں مسافر اپنے اس گھر کو بھول جاتا ہے جس میں اس نے اپنی زندگی کے خوبصورت لمحات بسر کیے۔ گھر کی تلاش میں گھر سے نکلنا دراصل لامکانی کا سفر ہے جس میں واپسی کی راہیں مسدود ہوتی ہیں۔ اسی لیے شاعر نے اس راستے کے کھو جانے کا ذکر کیا ہے جس پر چل کر پہلے گاؤں اور پھر گھر پہنچا جا سکتا تھا۔ اب جبکہ کے گاؤں کی طرف جانے والا راستہ ہی گم ہو چکا ہے تو گھر تک پہنچنا کیونکر ممکن ہے۔ یہاں احساس زیاں تو ہے لیکن اس زیاں کا تعلق انسان کی اپنی فراست سے ہے۔ ندا فاضلی

کا ایک شعری وصف یہ بھی ہے کہ وہ انسانی شکست و ریخت کے لیے قدرت یا نظامِ فطرت کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتے۔ انسانی زندگی کے تمام حادثات کی ذمہ داری خود انسان پر عائد ہوتی ہے۔

گاؤں یا بستی صرف انسانی زندگی سے عبارت نہیں ہے بلکہ اس میں چرند و پرند، راستہ، پگڈنڈی، کنواں، تالاب، پیڑ وغیرہ کے بغیر گاؤں کا تصور ممکن نہیں۔ نیم کے پیڑ کو انسانی پیکر عطا کرنے کی کوشش ہے۔ پہلے دوہے میں گھر اور گاؤں کے کھو جانے کا غم ہے تو دوسرے میں گاؤں کے نیم کی موت کا نوحہ ہے۔ گھر، گاؤں اور نیم صرف لفظ نہیں بلکہ ایک تہذیب کی علامت ہیں جن سے ہماری دیہی زندگی تشکیل پاتی ہے۔ ان سب کے کھو جانے کا ماتم دراصل ایک صحت مند تہذیب کے مٹ جانے کا دکھ ہے۔ تیسرا دوہا ہماری مشرقی روایت بالخصوص ہندوستانی تہذیب کے ایک بلیغ عنصر کا بیانیہ ہے۔ پیپل اور برگد کے درخت سایہ دار تو ہوتے ہی ہیں ان کے سایے میں نہ جانے کتنی زندگیاں نمو پاتی ہیں اور سانس لیتی ہیں۔ پیپل اور برگد شفیق بزرگوں کا استعارہ بھی ہیں۔ ہندوستانی اسطور میں ان کی جو اہمیت ہے ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسطوری اہمیت کے پیشِ نظر قابلِ احترام بھی ہیں۔ ندا فاضلی نے اسی روایت کو پیش کیا ہے۔

بوڑھا پیپل گھاٹ کا، بتیائے دن رات
جو بھی گزرے پاس سے سر پر رکھ دے ہات

ذاتی زندگی کی مصروفیات اور اپنے آپ میں گم ہو جانے کی وجہ سے انسان آس پاس کی چیزوں سے لاعلم ہوتا جا رہا ہے۔ لاعلمی کا دائرہ اشیا سے لے کر انسانی رشتوں تک پھیل چکا ہے۔ اپنی زندگی سے باہر کچھ نہ دیکھنے کا رویہ انسان کو تنہا بھی کرتا ہے۔ ندا فاضلی کے یہاں جو تنہائی ہے اس کی وجہ عالمی معاشرے کی بدلتی صورتِ حال نہیں بلکہ اس کے لیے انسان کا اپنا رویہ زیادہ ذمے دار ہے۔ مٹتی ہوئی تہذیب کے پاسداروں کی ذمے داری اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ انھیں خود کو اپنی شناخت کے ساتھ زندہ بھی رکھنا ہے اور اپنے بعد آنے والی نسل کی تربیت بھی کرنی ہے۔ ندا فاضلی کے یہاں تہذیب کی بازیافت کی کوشش ان معنوں میں نہیں ہے کہ اسے زندہ کرنے کے لیے اپنی صحت خراب کی جائے۔ اس تہذیب کی مثبت قدروں کو یادداشت کا حصہ بنانا بھی زندگی عطا کرنے کی ایک صورت ہے۔ ندا فاضلی کے یہاں یہ کوشش ان کی کئی نظموں اور غزلوں میں بھی نظر آتی ہے۔

ندا فاضلی کی شعر گوئی کا آغاز اس وقت ہوا جب فرد اپنی ذات میں گم نئی دنیا تلاش کرنے پر مجبور تھا۔ ایسے حالات میں انسانی رشتے اپنی معنویت کھو دیتے ہیں۔ ندا فاضلی نے جس معاشرے میں ہوش سنبھالا اس میں بے چہرگی ایک عام مرض تھی۔ اسی لیے ان کے یہاں رشتوں کی گم ہوتی معنویت اور فرد کی بے چہرگی کا اظہار بار بار ہوتا ہے۔ دوہے ملاحظہ ہوں۔

مجھ جیسا اک آدمی، میرا ہی ہم نام
الٹا سیدھا وہ چلے، مجھے کرے بدنام
اوپر سے گڑیا ہنسے، اندر کاٹ کباڑ
گڑیا سے ہے پیار تو کیلیں نہیں اکھاڑ
مائی مائی سے ملے، کھو کے سبھی نشان
کس میں کتنا کون ہے، کیسے ہو پہچان
دکھ تو مجھ کو بھی ہوا، ملا نہ تیرا سات
شاید تجھ میں بھی نہ ہو، تیرے جیسی بات

ندا فاضلی نے اپنی شاعری میں جسم اور دماغ کی دوری کو کئی مقامات پر پیش کیا ہے۔ دوسرا دوہا بھی اسی جانب اشارہ کرتا ہے کہ ظاہر اور باطن میں کتنا فرق اور تضاد ہوتا ہے۔ ظاہری اشیا کی اپنی جمالیات ہوتی ہے۔ انسانی زندگی میں ان کی بھی اہمیت ہے۔ اگر کسی کو کوئی چیز یا کوئی شخص اچھا لگتا ہے تو اسے اسی طرح سے قبول کر لینا چاہیے۔ اس کی جڑوں میں جانا اور اس کے باطن میں جھانکنا عام طور پر نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

ندا فاضلی کی شاعری میں ہجرت، دربدری، اور اپنوں سے جدا ہو جانے کا غم کئی سطحوں پر نظر آتا ہے۔ وہ اس کا اظہار کبھی برملا تو کبھی اشارے کنائے میں کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دکھ بانٹنے سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ دکھ کا موسم گزر جاتا ہے البتہ اس کی یادیں تازہ رہتی ہیں۔ 'ماں' معاصر اردو شاعری میں مستقل موضوع کی حیثیت رکھتی ہے۔ ماں کی ممتا اور بدلتے معاشرتی منظرنامے میں پیچیدہ ہوتے انسانی رشتوں میں ماں کی اہمیت پر نظم لکھنے کا ایک سلسلہ چل پڑا ہے۔ اس سیاق میں ندا فاضلی کی ایک غزل جس کی ردیف 'جیسی ماں' ہے، قابلِ ذکر ہے۔ یہاں کچھ دوہے ملاحظہ کیجیے، جن میں انسانی دکھ اور اس دکھ کی جمالیات کا اظہار ہوا ہے۔

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی بن چٹھی بن تار
دکھ کی نگری کون سی، آنسو کی کیا ذات
سارے تارے دور کے سب کے چھوٹے ہات
سورج سے دھرتی تپے، چھپا ڈھونڈے کاگ
تن کے اندر من جلے دھواں دکھے نہ آگ

دنیا میں ماں کی ذات ایسی ہے جسے اولاد کا غم اپنے غم سے بڑا محسوس ہوتا ہے۔ دوسرا دوہا دکھ کی شعریات سے متعلق ہے۔ دکھ کسی ایک مقام سے وابستہ نہیں ہے۔ اسی طرح آنسو کی پہچان اس کے نکلنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بذاتِ خود آنسو کی کوئی پہچان نہیں۔ دکھ اور غم انسان تک جس آسانی سے پہنچ جاتا ہے، اس سے نجات حاصل کرنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ ندا فاضلی نے تیسرے دوہے میں اسی نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا انسانوں کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس لیے اس میں موجود ہر چیز پر انسان کا اختیار ہونا چاہیے۔ ندا فاضلی کا تصورِ کائنات اس سے مختلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ دنیا انسانوں کے لیے بنائی گئی ہے لیکن اس کی ساری چیزیں سارے انسانوں کے لیے نہیں ہیں۔ یہ دنیا قدرت نے بنا کر انسانوں کے حوالے کر دیا ہے۔ انسان کی اپنی صلاحیت اور اس کی بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ اپنی دنیا کس طرح سے بناتا ہے۔ یعنی جو شخص جتنی محنت اور تگ و دو کرے گا اسے اسی مقدار میں دنیا عطا کی جائے گی۔ ندا فاضلی کا خیال ہے کہ انسان اپنی استعداد، قوت اور بصیرت میں اضافہ کرے تو منزلِ مقصود مل سکتی ہے۔

برکھا سب کو دان دے، جس کی جتنی پیاس
موتی سی یہ سیپ میں، مٹی میں یہ گھاس
سا سے سا تک سات سر، سات سروں میں راگ
اتنا ہی سنگیت ہے جتنی تجھ میں آگ
چاقو کاٹے بانس کو، بنسی کھولے بھید
اتنے ہی سر جانیے، جتنے اس میں چھید

ندا فاضلی کے دوہوں کو نظر انداز کر کے ان کی تخلیقی حسیت کو بہتر طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ اس حسیت کا تعلق ایک شعری روایت سے ہے۔ جس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم نے فاصلہ اختیار کیا ہے۔ ندا فاضلی نے اپنے طور پر اس فاصلے کو کم کرنے کی کوشش کی۔ وہ بنیادی طور پر اردو کے شاعر ہیں لیکن ہندی کا رس جس ان کے لیے کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ ندا فاضلی کی شاعری کے مطالعے سے اس حقیقت تک پہنچا جا سکتا ہے کہ ان کی غزل کا ایک رشتہ ان کے دوہے سے بھی ہے۔ فکری اور لسانی سطح پر دونوں اصناف ایک دوسرے سے گریزاں نہیں لیکن اس زاویۂ نظر سے ابھی تک مطالعہ نہیں کیا گیا۔

■

Dr. Abdus Sami
Astt. Prof. Dept of Urdu,
Banaras Hindu University (BHU)
Ajagara , Varanasi -221005 (UP)

اکتوبر کے اساطین

فکر تونسوی ایک عوامی فنکار

مہتاب امروہوی

فکر تونسوی صرف ایک نام نہیں بلکہ انھیں ایک مکمل ادبی انجمن کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا، کیونکہ انھوں نے نہ کسی کی اندھی تقلید کی اور نہ لکیر کے فقیر بنے۔ بلکہ اپنی راہ خود بنائی۔ شعری مجموعہ، ہیولے، کے علاوہ پیاز کے چھلکے، چوپٹ راجہ، فکریات، بدنام کتاب، فکر نامہ، آدھا آدمی، بات میں گھات، گھر میں چور، چھلکے ہی چھلکے، فکر بانی، میری بیوی، وارنٹ گرفتاری، ماڈرن الہ الدین، ماؤزے تنگ، آخری کتاب، پروفیسر بدھو، ساتواں شاستر، خدوخال کے ذریعے نہ صرف ہنسایا بلکہ سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کا کامیاب آپریشن بھی کیا اور سب سے اہم ان کی تخلیق چھٹا دریا ہے جس کو لکھ کر انھوں نے انسان اور انسانیت کو آئینہ دکھایا۔ ہندی میں فکر نے آٹھ کتابیں لکھی ہیں جن میں سوتنترتا کے بعد، ہم ہندوستانی اور غم شدہ کی تلاش بہت زیادہ مقبول ہوئی ہیں۔

مشہور مفکر طامس ہارڈی نے اپنے ایک ناول میں پیشین گوئی کی تھی کہ ''زمانہ مستقبل کا پختہ فکر انسان جب اپنے گردو پیش پر نظر ڈالے گا تو مسکرانا بھول جائے گا فکر زمانہ مستقبل کا ہی قلم کار اور شاعر ہے اور جب انسان کی حماقتوں اور دیوتاؤں کی بوالعجبیوں کا جائزہ لیتا ہے تو اس کے لبوں سے مسکراہٹ کافور ہوجاتی ہے اور کلیجے سے ہوک اٹھتی ہے اور وہ مسکرانا بھول جاتا ہے چہ جائیکہ ایک قہقہہ استہزا بلند کر سکے۔ فکر کی فنی عظمت اس وقت منتہائے عروج پر دکھائی دیتی ہے جب وہ موجودہ مادی تہذیب کے اس پہلو پر تازیانے لگاتا ہے جس پر دور حاضر کی گردن فرط غرور سے تن جاتی ہے فکر موجودہ تمدن کی پری کا جنون آمیز اور خونی رقص دیکھ دیکھ کر مایوس ہوجاتا ہے اور پھر نہایت ہی مایوسی کے عالم میں چاہتا ہے کہ موجودہ تہذیب، ماضی کی طرف لوٹ جائے جبکہ فکر اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہوئے کراہتا ہے، چیختا ہے مراجعت میں وہ رات کے وقت چلانے والے شیر خوار بچے کی طرح کہہ اٹھتا ہے۔

اے ساتھیو! اے آتش و آہن کے خداؤ
کچھ بھی ہو الاؤ کوئی شعلہ کوئی دیپک
اس کہرے کی سیلی ہوئی آنکھوں میں جلاؤ
ورنہ مجھے لے جاؤ انھیں خواب گہوں میں
تھیں دل سے ہم آہنگ جہاں وقت کی سانسیں

فکر اپنی شاعری میں بھی اپنے اسلوب بیان میں الفاظ کی جدت اور تازگی میں نئی تراکیب، تشبیہات کی ندرت میں کمال رکھتے ہیں کہیں کہیں انھوں نے براہ راست اس معاشرے کی نابرابری اور عدم مساوات کے نظام پر حملہ کیا ہے تو کہیں اپنی خامیوں کو بھی ظاہر کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔

ہندو پاک کے معروف طنز نگار اور صحافتی دنیا کے ممتاز کالم نگار، فکر تونسوی کی تاریخ پیدائش 7/1 اکتوبر 1918 ہے تاریخ پیدائش کے بارے میں فکر کے سب ہی محقق متفق ہیں۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی (فکر تونسوی، حیات اور کارنامے) یونس حیدر آبادی (فکر تونسوی: شخصیت اور نثر نگاری) دونوں نے ان کی تاریخ پیدائش 7/1 اکتوبر 1918 بتائی ہے اس کے علاوہ اتر پردیش اردو اکادمی سے شائع ہونے والی کتاب انتخاب مضامین مرتبہ دلیپ سنگھ نے بھی یہی تاریخ لکھی ہے۔

فکر تونسوی کا نام خاصی الجھن میں مبتلا کرتا ہے خود فکر نے بھی اپنا صحیح نام ظاہر کرنے سے گریز کیا ہے فکر صاحب کے نام کی تلاش و تحقیق جب ہم نے کی تو مختلف ذرائع سے جو نام ہمارے سامنے آئے وہ رام لال بھاٹیہ، رام نرائن بھاٹیہ، کرشن لال بھاٹیہ اور خالی نرائن شامل ہیں۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے اپنی مرتبہ کتاب 'فکر تونسوی:۔ حیات اور کارنامے' میں مختصر حالات زندگی کے تحت فکر کا نام رام لال بھاٹیہ لکھا ہے لیکن انھوں نے اپنی معلومات کا ذریعہ نہیں بتایا ہے کہ انھیں یہ نام کہاں سے حاصل ہوا۔ یونس حیدر آبادی نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم

اے کے مقالے میں فکر کا نام رام نرائن لکھا ہے۔ بوگس کا یہ مقالہ کتابی صورت میں حیدرآباد سے 'فکر تونسوی شخصیت اور طنز نگاری' کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے لیکن بوگس صاحب نے بھی فکر کے نام کے بارے میں کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا ہے صرف اتنا لکھا ہے:

"دھنپت رائے کے آخری لڑکے رام نرائن (فکر تونسوی) 7/ اکتوبر 1918 میں چار بجے صبح شجاع آباد ضلع ملتان میں پیدا ہوئے"

اتر پردیش اردو اکادمی نے انتخاب مضامین فکر تونسوی کے نام سے چند مضامین کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اس میں مرتب دلیپ سنگھ نے شروع میں فکر کے حالاتِ زندگی ''من کہ...'' فکر تونسوی کے خودنوشت حالات عنوان کے تحت فکر کا نام صرف نرائن لکھا ہے۔ دلیپ سنگھ نے فکر کے یہ حالاتِ زندگی 'ماہنامہ آجکل دہلی' کے کسی شمارے سے لیے ہیں شمارے کا نمبر سنہ اور مہینے کا نام موجود نہیں ہے۔ 'آجکل' میں غالباً فکر نے خود اپنے اور اپنے خاندان اور اپنی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بیان کیا ہے۔

خود ہماری ذاتی تحقیق کے مطابق فکر تونسوی کا نام کرشن لال بھاٹیہ ہے ہم نے یہ مقالہ لکھتے وقت فکر صاحب کا نام، جائے پیدائش اور ان کے متعلق دیگر معلومات کے بارے میں ان کی بیٹی اور بیٹے، ان کے دوستوں اور روزنامہ ملاپ دہلی، روزنامہ ہند سماچار جالندھر، روزنامہ پرتاپ دہلی، روزنامہ قومی آواز سے رجوع کیا تھا بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو کے اس عظیم طنز و مزاح نگار کے بارے میں جواب آیا لیکن وہ جواب خود اتنا ناکافی اور نامکمل ہے کہ اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ روزنامہ ملاپ میں کام کرنے والے کسی صاحب نے ہمارے ہیں خط کے ایک گوشے پر ذرا سی جگہ میں اصلی نام 'کرشن لال بھاٹیہ' کے الفاظ لکھ کر ان تینوں لفظوں کے نیچے بہت خفی خط میں شاید اپنا نام (بیر) لکھا تھا اور ہمارا خط ہمارے لکھے پتے پر واپس لوٹا دیا گیا۔ لہٰذا ایسی صورت میں جب تک کہ ہمیں جواب دینے والے کا اصلی نام، روزنامہ ملاپ میں اس کی حیثیت اور کرشن لال بھاٹیہ نام کے ماخذ کا علم نہ ہو ہمارے لیے کرشن لال بھاٹیہ بھی غیر مصدقہ نام ہے خود فکر تونسوی نے ڈاکٹر مظفر حنفی کو انٹرویو دیتے وقت اپنے اصلی نام کی گفتگو کو مزاح میں اڑا دیا تھا یہ کہہ کر کہ میرا نام تو فکر تونسوی ہے جو اصلی ہے اور جو نقلی تھا وہ والد نے رکھا تھا۔

فکر تونسوی کا مقام پیدائش شجاع آباد ضلع ملتان ہے لیکن درحقیقت وہ غیر منقسم ہندوستان کے ضلع ڈیرہ

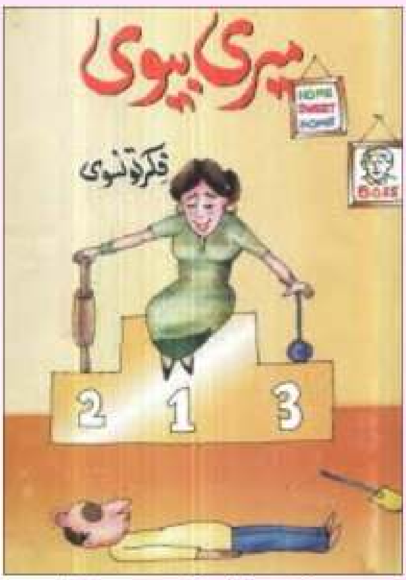

غازی خاں کے گاؤں تونسہ کے رہنے والے تھے۔ ڈیرہ غازی خاں ہندوستان کا آخری سرحدی ضلع تھا اور تونسہ ڈیرہ غازی خاں تین کوس کی دوری پر آخری گاؤں تھا جس کے دو تین میل بعد ہی افغانستان کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ تونسہ کی سیاسی صنعتی یا تجارتی اعتبار سے کبھی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن فکر تونسوی کی پیدائش کے بعد بقول کنہیا لال کپور فکر تونسوی نے اردو ادب میں ایک لفظ تونسے کا اضافہ کیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ فکر کی وجہ سے تونسے کو ادبی اور صحافتی دنیا میں وہ عزت حاصل ہوئی کہ آج ادب اور اخبار کا مطالعہ کرنے والا شخص چاہے تونسے کا جغرافیہ نہ جانتا ہو لیکن اتنا ضرور بتا دے گا کہ تونسہ وہ مقام ہے جہاں فکر تونسوی پیدا ہوئے۔

فکر تونسوی کی جائے پیدائش تونسہ کے بارے میں معلومات کے دیگر ماخذ اولیا کرام کے تذکروں پر مشتمل کتب مثلاً خاتم سلیمانی، نافع السالکین، ملفوظاتِ حضرت پیر صدر شاہ جلال پوری اور مشاہیر اسلام وغیرہ ہیں جن میں تونسہ کی تاریخ وہاں کی علمی تعلیمی اور مذہبی سرگرمیوں سے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ تونسہ کے بارے میں ہماری معلومات کا قریب ترین ماخذ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی 'تاریخ مشائخ چشت' ہے جس میں انھوں نے تونسہ کے اس وقت کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جب تونسہ کو حضرت شاہ محمد سلیمان صاحب نے مرکزِ رشد و ہدایت بنایا تھا۔

فکر تونسوی اور دیگر کالم نگار

فکر تونسوی نے مختلف اصناف ادب میں خامہ فرسائی کی ادبی حیثیت کالم نگاری کے بعد ہی مستحکم ہوئی، فکر غالباً واحد شخص ہیں جنھوں نے سنجیدہ شاعری سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اور اختتام کالم نگاری پر ہوا۔ اردو ادب کی تاریخ میں ایسی مثالیں تو ملتی ہیں کہ کسی نے سنجیدہ شاعری سے ابتدا کر کے مزاح گوئی اختیار کر لی یا شاعری سے شروع کر کے نثر نگاری یعنی ''ناول، افسانہ، یا تنقید نگاری اختیار کر لی لیکن ایسا شاذ ہی ہوا ہوگا کہ سفر کا آغاز تو سنجیدہ شاعری سے ہوا اور اختتام طنز و مزاح کے کالموں پر، لیکن جیسا کہ پیچھے فکر کی شاعری کے بیان میں عرض کیا کہ ان کے یہاں شروع سے ہی طنز کا رجحان اتنا غالب تھا کہ لامحالہ انھیں کالم نگاری کی طرف آنا ہی پڑا۔ وہ اگر طنز و مزاح نگار نہ ہوتے تو شاید انھیں اتنی شہرت و مقبولیت نہ ملتی اگر ملتی تو ان کی شہرت صرف ادبی حلقوں تک محدود رہتی۔ صحافتی و ادبی حلقوں میں آج جوان کے نام کا سکہ چلتا ہے وہ محض طنز نگاری کی وجہ سے ہے۔ یہاں ہم ان کی طنز و مزاح نگاری کا جائزہ فکر و فن کے روشنی میں لیں گے۔

ہمارا مقصد ان ان کی طنز و مزاح نگاری کا اس حیثیت سے تجزیہ کرنا ہے کہ ان کی طنز نگاری کس حد تک مفید اور کارآمد رہی ہے اور اس نے سماجی برائیوں اور معاشرے کی ناہمواریوں کے کن گوشوں کو کیسے بے نقاب کیا ہے اور اس کوشش میں ان کا نقطۂ نظر معروضی رہا ہے یا موضوعی؟ فکر کی تحریروں یا کالموں میں طنز کے ساتھ مزاح کی آمیزش ہے۔ لہٰذا یہ دیکھنا بھی لازمی ہو جاتا ہے کہ طنز کے ساتھ مزاح کی ظرافت کی ملاوٹ کس حد تک ہے اور یہ کہ ظرافت کی یہ ملاوٹ زبردستی کی کوشش تو نہیں ہے۔ ظرافت اپنے اصلی رنگ یعنی واقعہ یا کردار کے مضحکہ خیز پہلو پر روشنی ڈال رہی ہے یا اس میں تمسخر، پھکڑ پن یا تضحیک کے عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں۔ فکر تونسوی کے کالموں کا تجزیہ ان سبھی سوالات کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اردو میں کالم نگار تو بہت گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو اچھا پڑھ لکھ رہے ہیں لیکن جو خصوصیات فکر کی کالم نگاری میں پائی جاتی ہیں وہ کم لوگوں کے یہاں ملیں گیں۔ اردو کالم نگاری کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلا اردو کا باقاعدہ کالم نگار منشی سجاد حسین کو تسلیم کرنا ہوگا۔ ان کا اخبار 'اودھ پنچ' کالم نگاری کا نقطۂ آغاز تھا۔ اودھ پنچ نے جس ظرافت اور طنز کا آغاز کیا وہ منشی صاحب کی مرہونِ منت تھی۔ حالانکہ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اودھ پنچ کی ظرافت میں پھکڑ پن کا عنصر بہت کم تھا۔ سجاد حسین نے اپنے دور کے مختلف مسائل کو اپنا نشانہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے برطانوی دور استبداد کے خلاف بھی جم کر لکھا۔ خود فکر نے سجاد حسین کی

تحریروں کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

''ان تحریروں کا تاریخی رول یہی ہے کہ وہ معاشرے کو ایک نیا موڑ دے جاتی تھی۔ مزاحیہ لباس پہنا کر جس کی سڑاند کی اطلاع دینا۔۔۔ نیک وشوخ ایڈیٹر منشی سجاد حسین کا مقصد حیات تھا۔''

زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو سجاد حسین اور فکر تونسوی کے دور میں خصوصیات اور مسائل کے اعتبار سے زیادہ فرق نہیں ہے۔ سجاد حسین کا دور برٹش سامراج کے پنجے جمانے اور مشرقی تہذیب کے ختم ہونے کا زمانہ تھا۔ فکر تونسوی کا دور برٹش سامراج کے خاتمے اور ہندوستانی تہذیب کی واپسی کا زمانہ تھا۔ دونوں دور اپنے اندر بے شمار سماجی، سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور علمی مسائل رکھتے تھے۔ جس کی نوعیت تقریباً یکساں تھی۔ بلکہ اگر زیادہ باریکی سے جائزہ لیا جائے فکر کو اپنے زمانے میں مذکورہ بالا مسائل کے علاوہ کچھ نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا، یعنی تقسیم ملک کا مسئلہ اور اس کے بعد پیدا ہونے والے مسائل جو یقیناً نہ صرف کربناک تھے بلکہ نہایت پیچیدہ بھی اتنے پیچیدہ اور نفسیاتی کہ انھوں نے اس زمانے کے سبھی ادیبوں اور شاعروں کی نفسیات کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ دونوں ادوار کے مسائل اور ان کو برتنے کے طریقے پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ سجاد حسین اور 'اودھ پنچ' والوں کی بہ نسبت فکر کے یہاں سماجی شعور اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ انھوں نے سماج کی خامیوں، غلط رسم ورواج، بیورو کریسی کی بے حسی، سیاسی کرپشن اور جس جس مسئلہ کو اٹھایا ہے اس پر نہایت سنجیدگی سے طنز کیا ہے۔ اس طنز کے پیچھے ان کا باریک بینی سے مشاہدہ بھی نظر آتا ہے۔ بے باکی اور بے خوفی فکر کی تحریر کا امتیاز ہے۔ جبکہ سجاد حسین اور ان کے معاصرین نے اپنے سماج کی برائیوں کو یا تو دیکھا ہی نہیں یا دیکھا تو بہت ہی سطحی طور پر۔ ہمیں 'اودھ پنچ' والوں کے یہاں سماجی شعور کی وہ گہرائی اور سنجیدگی نظر نہیں آتی جو ان کے بعد والوں اور فکر کے یہاں پائی جاتی ہے۔

فکر کے معاصرین میں امتیاز علی تاج، کنہیا لال کپور، شوکت تھانوی، شفیق الرحمان، مشتاق احمد یوسفی، ابن انشا، کرنل محمد خاں، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا، تخلص بھوپالی، نریندر لوتھر، خواجہ احمد عباسی وغیرہ۔۔ ایک لمبی صف طنز ومزاح نگاروں کی نظر آتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام ظرافت نگار اردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب میں اپنا مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ کسی کے یہاں ظرافت زیادہ پائی جاتی ہے کسی کی تحریر میں طنز کی کثرت ہے۔ فکر تونسوی بھی ان کامیاب طنز نگاروں میں شامل ہیں۔ فکر کا طنز ان میں سے کسی سے بھی ہلکا نہیں ہے۔ بلکہ شاید طنز نگاری میں فکر کا پلہ ہی بھاری نکلے گا ہی ظرافت نگاری۔ تو ظرافت اور مزاح میں بھی فکر کا اپنا مخصوص انداز اور اپنی طرز ہے۔ ابن اسماعیل کی رائے ملاحظہ ہو:

''فکر غضب کے ذہین تھے ان کی ہر تحریر سے ذہانت جھلکتی ہے۔ تہہ در تہہ طنز کی جو مثال انھوں نے اپنے تمام مضامین میں برقرار رکھی ہے اسی ذہانت کا نتیجہ ہے۔ بات میں بات پیدا کرنے میں فکر کو کمال حاصل تھا وہ بسیار نویس تھے۔ لیکن یہ بسیار نویسی ان کے فن کی تھکن اور بڑھانے کا باعث نہ بن سکی۔ بلکہ ان کا فن اور زیادہ نکھرتا، سنورتا اور جوان ہوتا چلا گیا۔''

کالم نگاری کا امتیاز: ہم فکر کے کالموں اور دیگر تحریروں کا جب جائزہ لیتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی کالم نگاری کو ہر قسم کی جانب داری اور اپنی ذاتی پسند ناپسند سے بالکل پاک وصاف رکھا ہے۔ دراصل ان کا مقصد نیک تھا یہ نیک مقصد سماج کی اصلاح وفلاح اور انسان کے غموں کے بوجھ کو ہلکا کرنا تھا۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا وہ حالات کا ردعمل کہا جا سکتا ہے۔ فکر کا یہ ردعمل تنہا ان کا نہ ہو کر سارے سماج کا ہوتا تھا۔ اسی سماجی ردعمل کے اظہار کے لیے انھوں نے ملاپ کے کالموں کا انتخاب کیا۔ ملاپ کے روز مرہ کالم فکر تونسوی کے ذاتی کالم نہیں تھے۔ یہ کالم اس کثیر تعداد رکھنے والے طبقہ کی میراث تھے جو سماج کا کمزور اور استحصالی طبقہ کہا جاتا ہے اور یہ وصف یا امتیاز صرف فکر کے یہاں ہی پایا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے کالموں میں صرف اور صرف سماجی مسائل کو ہی اٹھایا ہے۔ سماجی مسائل سے مراد یہ ہے کہ فکر کے کالم عوام کے روز مرہ کے مسائل سے متعلق رہے ہیں۔۔

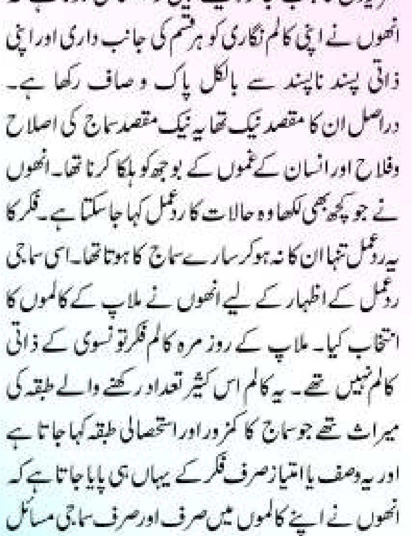

انھوں نے اپنے کالموں میں بھاری بھرکم ادبی مسائل یا پیچیدہ سیاسی معاملات پر لکھنے سے گریز کیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ ان مسائل ومعاملات کا براہ راست تعلق عوام سے نہیں ہے۔ ان کا قلم ہمیشہ عوام کے لیے وقف رہا۔ فکر نے گہرے اور پیچیدہ مسائل وموضوعات سے گریز کیا ہے انھوں نے صرف انھیں سیاسی موضوعات کو چھوا ہے جن سے ان کا اور عوامی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ مثلاً انھوں نے الیکشن، اسمبلی پارلیمنٹ اور لیڈروں اور ان کے جلسے جلوسوں پر خوب کھل کر لکھا ہے۔ کیونکہ یہ باتیں ہماری سماجی اور عوامی زندگی کا حصہ ہیں۔ انھوں نے اگر ادبی موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے تو اس پر بھی اس لحاظ کے ساتھ لکھا ہے کہ صرف ایسی بات کے متعلق خامہ فرسائی کی جائے جو عوام سے متعلق ہو۔ مثلاً مشاعرے یا کسی جلسہ اور مشاعرہ کا خطبۂ صدارت پڑھنا وغیرہ۔

یہ فکر کا ہی امتیاز ہے کہ انھوں نے اپنے قلم کو غیر عوامی مسائل اور موضوعات سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ اور جیسا کہ انھوں نے ایک بار مظفر حنفی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے سوچا کہ عوام سے رابطہ رکھنا ہے اور عوام کے مسائل کو پیش کرنا ہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے قول کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیشہ عوام کے مسائل پر ہی لکھا۔ عوام کے مسائل میں بھی انھوں نے کوئی بہت بڑے بڑے مسائل نہیں لیے بلکہ روزانہ زندگی میں پیش آنے والے معاملات، مسائل اور مشکلوں کو ہی اپنے کالم کی زینت بنایا۔ انھوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بیروزگاری، دودھ کی ملاوٹ، مکانوں کی قلت، نوجوان لڑکیوں کا غیر شادی شدہ رہنا، جہیز کی لعنت، بلیک مارکیٹ، روزانہ استعمال کی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی وغیرہ وغیرہ پر خوب جم کر لکھا لہٰذا یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فکر ایک عوامی فنکار یا قلم کار تھے اور یہ وصف یا امتیاز صرف انھیں کا ہے کہ انھوں نے عوامی زندگی سے ہٹ کر کچھ نہیں لکھا۔ فکر نے جس مشن کا آغاز 'نیا زمانہ' جالندھر سے کیا تھا، اس نیک مشن کو انھوں نے زندگی کے آخری لمحات تک جاری رکھا حقیقت یہ ہے کہ ان کے اندر ایک مشنری جیسا جذبہ اور اسپرٹ تھی اور اس جذبے کے خلوص نے ہی ان کو 'صحافت کا مجاہد' کا مقام عطا فرمایا۔ اگر چہ وہ خود کو قلم کا مزدور کہتے تھے۔

■

Dr. Mehtab Amrohvi
Cheif Proctor/HOD, Journalism
Nayab Abbasi, P.G College
Kailsa Road
Amroha - 224221 (UP)

محمد جابر حمزہ

حافظ محمود خاں شیرانی

حافظ محمود خاں شیرانی 5/اکتوبر 1880 میں راجستھان کے ٹونک شہر کے محلہ مہندی میں پیدا ہوئے تھے۔ان کے آباواجداد غزنوی عہد میں افغانستان سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے تھے۔ان کے والد کا نام اسماعیل خاں شیرانی تھا۔شیرانی صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی اردو اور عربی کی کتابیں گھر پر ہی استادوں سے پڑھتے اور اسی کے ساتھ قرآن مجید حفظ بھی کرلیا۔ اردو اور فارسی میں جب مہارت پیدا ہوگئی تو ان کے والد نے ٹونک کے دربار ہائی اسکول میں داخل کردیا۔جہاں انھوں نے مڈل تک تعلیم حاصل کی۔محمود شیرانی کی پسندیدہ زبان فارسی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیااور 1898 میں منشی، 1899 میں منشی عالم اور 1901 میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیااور یہیں پر انھیں انگریزی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔جس کے سبب یہ شوق پیدا ہوا کہ لندن جاکر بیرسٹری کے امتحان کو کامیاب کیا جائے۔والد کی حوصلہ افزائی سے 4/اکتوبر 1904 کو تعلیم کی غرض سے لندن پہنچ گئے۔ 1913 میں وطن واپس آئے۔ 1913 کے شروع میں ہی اسلامیہ کالج لاہور میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ 1927 میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں تدریسی ذمے داری سنبھالی۔ 1940 میں ملازمت سے فارغ ہوکر واپس ٹونک (راجستھان) چلے گئے اور فروری 1946 میں اس دارفانی کو خیر باد کہہ دیا۔

حافظ محمود شیرانی کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

(1) پنجاب میں اردو، انجمن ترقی اردو لاہور -1928

(2) تفاسیر قرآن (فارسی میں تفسیر ہے،صرف دیباچہ اُردو میں لکھا گیا ہے۔دیوان پریس دہلی، 1932

(3) مجموعۂ نغز (ترتیب اور تدوین)، نیشنل اکاڈمی دریا گنج دہلی -1933

(4) سرمایۂ اردو -1935

(5) تبصرہ میر خزائن الفتوح امیر خسرو -1935

(6) مثنوی عروۃ الوثقیٰ ،امیر شہاب الدین حکیم کرمانی، ماخوذ از روداد اجلاس دوم ادارۂ معارف اسلامیہ، 1936

(7) فردوسی پر چار مقالے -1942

(8) تنقید شعرالعجم ،انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی- 1942

(9) تنقید پرتھی راج راسا، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، 1943

(10) خالق باری (مرتب)،انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی 1944

پنجاب میں اردو

لسانیات کے میدان میں شیرانی صاحب کا ایک بڑا کارنامہ 'پنجاب میں اردو' ہے۔پنجاب میں اردو اسلامیہ انٹر کالج کے پرنسپل کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔پنجاب میں اردو پہلی بار 1928 میں شائع ہوئی۔

پنجاب میں اردو صحیح معنوں میں اردو لسانیات کے موضوع پر اہم کتاب ہے۔اس موضوع پر لکھنے کے لیے نہ صرف زبان کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر رکھنا ضروری تھا بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ سے واقفیت بھی ضروری تھی۔خوش قسمتی سے شیرانی صاحب مسلمانان ہند کی تاریخ کا رچا ہوا شعور رکھتے تھے اور اس بارے میں جس ماخذ تک ان کی دسترس تھی دوسرے محققین اس سے محروم تھے۔محمود شیرانی کے مطابق اردو کی تہہ میں جو بنیادی بولی ہے اس کا تعلق سرزمین پنجاب سے ہے۔

محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں لکھا ہے کہ:

"اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کرکے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے"[1]

فردوسی پر چار مقالے

فردوسی اور اس کا شاہکار 'شاہنامہ' محمود شیرانی کے دل پسند موضوعات تھے۔محمود شیرانی نے فردوسی پر چار مقالے لکھے ہیں۔اس کو عبدالحی صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا:

"شیرانی صاحب کا ایک معرکتہ الآرا مقالہ رسالہ 'اردو' اورنگ آباد نے 'شاہنامہ کی نظم کے اسباب اور زمانہ' کے نام سے شائع کیا۔ان کا دوسرا مقالہ فردوسی کی طرف منسوب ہجویہ اشعار کی تحقیق ہے۔ حافظ صاحب نے روایت کردہ واقعات کی تحقیق کی اور تاریخی حقائق کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ یہ واقعہ درست نہیں ہے۔شیرانی صاحب کا تیسرا مقالہ 'فردوسی کا مذہب' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ چوتھا مقالہ 'یوسف زلیخا' کے قصہ کا فردوسی کی طرف انتساب کو رد کرنے کے سلسلے میں ہے"[2]

تنقید شعرالعجم

شعرالعجم علامہ شبلی کی فارسی شاعری کی تاریخ پر بہترین کتاب ہے۔شعرالعجم فارسی زبان وادب کی تاریخ سے وابستہ مختلف شعراء، ان کا عہد، ان کی سوانح، ان کے کلام پر نقد وتبصرہ، اور فارسی شاعری کے بدلتے ہوئے ادوار میں بدلتے ہوئے رنگ روپ کی تحقیق جتنی گہرائی سے کی ہے وہ شعرالعجم کی مختلف جلدوں میں ہمارے سامنے آئی۔شعرالعجم 5 جلدوں میں ہے۔ تحقیق میں کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوتی اسی کی روشنی میں محمود شیرانی نے شعرالعجم کا ناقدانہ اور محققانہ جائزہ لیا۔ جو قسط وار مضامین کی شکل میں سہ ماہی رسالہ 'اردو' اورنگ آباد میں اکتوبر 1922 سے 1927 تک شائع ہوتا رہا۔جواب 'تنقید شعرالعجم' کے نام سے شائع ہوچکا ہے۔محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ:

''میرا یہ مضمون روایت پرستی کے خلاف ایک پر زور احتجاج ہے اس بات کے لیے کہ اس روایت پرستی کے احساس سے باہر نکلا جائے۔''

محمود شیرانی نے یہ بتایا ہے کہ شعرالعجم میں بہت سے ایسے فارسی شاعروں کا ذکر کیا ہے جو فارسی کے ہیں ہی نہیں اور ان کے شعر بھی نہیں ہیں۔محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ علامہ شبلی نے شاعری کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر فارسی کے چہار مقالے سے لیا گیا ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ کوئی نئی بات شاعری کے متعلق شعرالعجم میں نہیں ملتی ہے سوائے اس کے کہ فصاحت و بلاغت اور محاکات کا جو ذکر علامہ نے شعرالعجم میں کیا ہے وہی اہم ہے۔محمود شیرانی آگے لکھتے ہیں کہ علامہ فارسی سے اچھی طرح واقفیت رکھنے کے باوجود یہ نہیں کر پائے کہ اپنی طرف سے کوئی ایسی بات شاعری کے متعلق کرتے جو دل میں چبھتی اور ہم محسوس کرتے کہ علامہ کا ایک نیا نظریہ شاعری سے متعلق ہمارے سامنے آیا۔

تنقید آب حیات

'آب حیات: محمد حسین آزادؔ کی ایک اہم ترین کتاب ہے۔جو 1880 میں چھپ کر سامنے آئی۔'آب حیات' میں پہلی بار تنقیدی نظریاتی مباحث کی طرف اشارے کیے گئے اور عام تذکروں کے برخلاف شاعروں کی انفرادیت کا پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔تاریخی اور ادبی حوالے سے اس کتاب میں بہت ساری کمیاں بھی ہیں جس کی نشان دہی حافظ محمود شیرانی کرتے ہیں:

''بلاشبہ آب حیات تذکروں سے آگے قدم ہے لیکن آزاد نے وہ محنت اور زحمت نہیں اٹھائی جو ایک ادبی مورخ کا لازمہ ہے۔ان کی یہ تصنیف نامکمل اور ناقص قرار پاتی ہے۔یہ کمی تاریخی حوالے سے ہے۔جبکہ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ آزاد کی انشاء پردازی کا اچھوتا نمونہ ہے۔''[3]

تنقید پرتھی راج راسا

محمود شیرانی کا ایک اور بڑا کارنامہ جو میری نظر میں اردو والوں سے بالکل جدا ہے۔پرتھوی راج چوہان پر لکھی گئی کتاب جس کا نام 'پرتھی راج راسا' ہے جو چندر بردائی نام کے شخص سے منسوب کی جاتی ہے۔ہندی میں 'پرتھوی راج راسو' کے نام سے جانی جاتی ہے۔یہ کتاب راجستھانی زبان میں راجپوتانہ خاندان سے متعلق لکھی گئی ہے۔اس میں جو کچھ بھی لکھا ہے وہ راجپوتانہ خاندان سے متعلق ان کے رہن سہن، رسم و رواج اور ان کے مذہب کے متعلق ہے۔اس کتاب پر انگریزوں نے بھی مضامین لکھے ہیں اور ہندی والوں نے بھی لیکن اردو والوں کی نگاہ اس کتاب پر نہیں پڑی۔

محمود شیرانی جب لاہور سے ٹونک آتے تھے تو گھر پر کم رہتے تھے زیادہ تر ان کا گھومنا پھرنا راجاؤں کے یہاں، ٹھاکروں کے یہاں اور جاگیرداروں کے یہاں رہا کرتا تھا اور ان کے یہاں رکھی چیزوں سے استفادہ کرتے۔ ایسے ہی انھیں پرتھی راج راسا مخطوطے کی شکل میں ملی تھی۔انھوں نے پرتھی راج راسا کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے شروع نہیں کیا کی اس کتاب کی اچھائی اور برائی کی نشاندہی کریں۔اس کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے شروع کیا تھا کہ دیکھا جائے کہ اردو کی تعمیر اور تشکیل میں راجستھانی زبان میں لکھی گئی اس کتاب کا کیا کردار ہوسکتا ہے۔جیسے جیسے اس کتاب کو پڑھا اس میں کچھ چونکا دینے والی باتیں سامنے آئیں مثلاً تمنچے کا ذکر اور ایک خاص قسم کے سکے (جیتل) کا استعمال وغیرہ اور یہ بتایا کہ جس چیز کا ذکر اس کتاب میں ہے اس کا تعلق پرتھی راج چوہان کے عہد سے نہیں ہے۔اور جس عہد کی تصنیف ہے اس عہد میں چندر بردائی نام کا کوئی شخص تھا ہی نہیں۔اس کتاب سے اردو زبان کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوا لیکن اردو ادب میں ایک اضافہ ضرور ہوا۔

بطور مدون

تحقیق کے دائرہ کار میں ایک شعبہ تدوین متن کا ہے۔ہر تحقیقی کام کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اسے اصول تحقیق سے پوری طرح واقفیت ہونی چاہیے۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ:

''تدوین دراصل تحقیق سے آگے کی منزل ہے۔جو شخص شرائط تحقیق کو پورا کرتا ہے اور ساتھ ہی اصول تدوین سے پوری طرح واقف ہو اور اس کا تجربہ بھی رکھتا ہو''۔[4]

بدقسمتی سے اردو ادب میں ایک عرصے تک یہ خیال عام تھا کہ تدوین ایک معمولی کام ہے۔ادبی تحقیق کے مقابلے اسے کم سمجھا جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کی اردو میں اس جانب تاخیر سے توجہ کی گئی۔اس ضمن میں سب سے پہلے محمود شیرانی کا نام آتا ہے۔محمد انصاراللہ صاحب فرماتے ہیں کہ:

''اردو میں قدیم متون کے تحقیقی مطالعے کے بعد مدلل طور پر قطعی نتائج تک پہنچنے کی جن علما نے شعوری کوشش کی اور اپنی ساری عمر اس کوشش میں صرف کر دی ان میں حافظ محمود خاں شیرانی کا نام سرفہرست ہے''۔[5]

طرز املا اور تاریخ خط سے واقفیت، لسانی اختلافات اور تغیرات سے آگاہی، کاغذ، روشنائی، فنون شعر پر عبور وغیرہ پر اگر کسی کی گہری نظر تھی تو حافظ محمود شیرانی تھے۔شیخ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ:

''ایک بات جس میں ان کی نظیر مشکل سے ملے گی، یہ تھی کہ آپ ہر نوشتہ، ہر کاغذ، اور رسم الخط کو دیکھ کر یہ بتا دیتے تھے کہ اس کا زمانہ کیا ہے اور یہ کس ملک یا سلطنت سے تعلق رکھتا ہے''۔[6]

خلیق انجم اپنے مقالے 'ہندوستان میں اردو تحقیق و تدوین کا کام' میں لکھتے ہیں کہ:

''وہ اردو کے واحد شخص ہیں، جنھیں تحقیقات پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔مرحوم سکہ شناسی، مہر شناسی، تصویر شناسی، کتب شناسی، قدیم کاغذ، روشنائی، صفحات کی آرائش، نقش و نگار اور علم خط کے زبردست ماہر تھے''۔[7]

ڈاکٹر ہنری سٹب (Henry Stube)

محمود شیرانی نے اپنے قیام لندن کے دوران ہی تدوین کا کام شروع کر دیا تھا۔ ڈاکٹر ہنری سٹب (Henry Stube) کی اسلام کے موضوع پر ایک انگریزی کتاب کو 1907 میں لندن کی ایک فرم برٹریم ڈوبیل (Bertaram Dobell) سے خریدا تھا۔اس کے علاوہ محمود شیرانی نے اس کے تین اور نسخے تلاش کیے۔ان میں سے ایک نسخہ نہ صرف ناقص تھا بلکہ دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔اور دو الگ الگ نمبروں (1709-1786) میں تھا۔دوسرا نسخہ مکمل تھا تیسرے نسخے پر کتاب کا نام موجود نہ تھا اور اسے کسی دوسرے مصنف کے نام سے درج فہرست کیا گیا تھا۔اس کے بعد اس کے دو اور نسخے ملے لیکن ان سے صرف مختصر تعارف ہو سکا۔

محمود شیرانی نے جس نسخے کو بنیاد بنایا تھا۔اس کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ Italian زبان میں بہت خوبصورت لکھا ہوا تھا۔اس میں کل 169 pages ہیں اور یہ دس ابواب میں بٹا ہوا تھا۔محمود شیرانی نے اس کے مصنف کی سوانح دریافت کی اور اس میں جو ردو بدل تھے اس کو صحیح کیا اور کتاب کو اس کے اصل مصنف کے نام کیا۔

اس کتاب سے اردو ادب میں کوئی اضافہ نہیں ہوا لیکن اس سے محمود شیرانی کے تدوینی سفر کا آغاز ضرور ہو گیا۔

مجموعۂ نغز (ترتیب اور تدوین)

تدوین کا دوسرا کام 'حکیم قدرت اللہ قاسم' کا تذکرہ 'مجموعۂ نغز' ہے جو پنجاب یونیورسٹی سے 1933 میں شائع کیا گیا تھا۔'مجموعۂ نغز' کا بنیادی نسخہ محمد حسین آزاد کے پاس تھا جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری کے قبضے میں آیا۔اس کا ایک نسخہ کلکتہ میں بھی تھا جو مل نہ سکا۔ایک اور نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ملا۔ایک نسخہ برلن میں تھا جس تک رسائی نہ ہو سکی تاہم انھیں دو نسخوں سے

کام چلانا پڑا۔

محمود شیرانی نے جس نسخے کے متن کو بنیادی نسخہ بنایا ہے۔اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مصنف کا اصل مسودہ معلوم ہوتا ہے۔اس بیان کی تائید میں کوئی تحریری ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں کیونکہ خاتمہ سے جس تاریخ کتابت و نام و کاتب و مصنف پر روشنی پڑتی ہے، درج نہیں ہے مگر ایسے آثار اور علامت کافی موجود ہیں جو اس کی کتابت کو مستقلاً مصنف سے وابستہ کرتے ہیں''۔[8]

مزید آگے لکھتے ہیں کہ:

''دوسرا نسخہ کثرت سے غلط اور سقیم ہے۔اور وہ کسی کم سواد کاتب کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے''۔[9]

'مجموعہ نغز' کے اساسی نسخے کے تعارف میں شیرانی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''جس مخطوطے پر متن مبنی ہے وہ مجموعہ کتب مولانا محمد حسین آزاد سے تعلق رکھتا ہے جو اب پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ کی ملکیت ہے۔متعدد مقامات پر مولانا آزاد نے اس پر مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے۔اور سرخ رنگ کی سیاہی استعمال ہوئی ہے اور خط نستعلیق رواں شکستہ مائل ہے''۔[10]

اس نسخے کے مصنف کا اصل مسودہ ہونے کے فاضل مدون نے بڑے واضح دلائل پیش کیے ہیں:

''(i) جملے اور فقرے مختلف مقامات پر کاٹے گئے ہیں اور ان کی بجائے نئے جملے اصلاح شدہ شکل میں لکھے گئے ہیں۔

(ii) مصنف نے نظر ثانی کرتے وقت بے شمار موقعوں پر حاشیہ میں نئے اضافے داخل کیے ہیں۔

(iii) الفاظ میں حک و ترمیم سیکڑوں موقعوں پر نظر آتی ہے۔

(iv) شعرا کے درج متن کلام سے نظر ثانی کے وقت موقع بموقع بہت سے شعر غالباً بنظر اختصار کاٹ دیے ہیں۔

(v) بعض شعرا کا ذکر اصل کتاب سے خارج کر کے تکملہ میں داخل کیا گیا ہے۔

(vi) مصنف نے نسخے کی تسوید کے وقت آئندہ اضافوں کے خیال سے متعدد مقامات پر جگہ خالی چھوڑ دی ہے''۔[11]

خالق باری (مرتب)

محمود شیرانی کا ایک اور اہم کارنامہ امیر خسرو سے منسوب 'خالق باری' ہے۔ یہ ایک لغت ہے اور اس میں فارسی کے ہندوی الفاظ نظم کیے گئے ہیں۔شیرانی

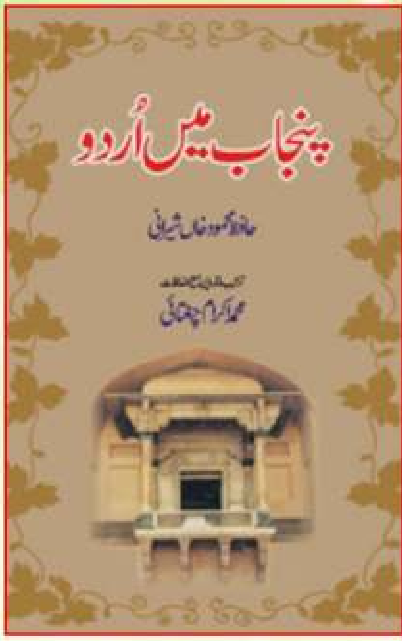

صاحب نے اس پر اپنے طور پر غور کیا اور بتایا کہ امیر خسرو سے منسوب یہ کتاب دراصل جعلی ہے اس کا اصل مصنف 'ضیاء الدین خسروؔ' ہے۔

محمود شیرانی نے اس کتاب کو مرتب کر کے 1944 میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام شائع کیا۔ یہ کتاب بہت دن تک نصاب میں شامل رہنے کی وجہ سے اس کے نسخے خواہ قلمی ہوں یا مطبوعہ کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔خود محمود شیرانی کے مجموعہ کتب میں 16 قلمی نسخے اور 39 مطبوعہ نسخے موجود تھے۔اس کے علاوہ انھوں نے دوسرے نسخے سے بھی مدد لی۔اس بڑی تعداد میں مخطوطات و مطبوعات کا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے ان میں سے ترتیب کی غرض سے صرف 6 نسخے ہی منتخب کیے۔ان میں سے کئی میں دیباچے بھی لکھے گئے ہیں۔ان 6 نسخوں میں سے ایک نسخہ جو انجمن ترقی ہند (اردو) کے مطبوعہ مخطوطات سے تعلق رکھتا ہے۔'سید یٰسین' نامی کاتب نے 1187 ہجری میں اس کی کتابت کی تھی۔ یہ 223 اشعار پر مشتمل اور اس نسخے کے آغاز میں ایک دیباچہ بھی لکھا ہوا ہے۔ بقول محمود شیرانی اس نسخے کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ اس میں مصنف کا نام 'ضیاء الدین خسروؔ' لکھا ہوا ہے۔محمود شیرانی نے امیر خسرو کے سو سال بعد کے ایک مصنف کی سوانح مرتب کی۔اس کے حوالے تلاش کیے اور اس کا تخلص دریافت کیا۔اور یہ بتایا کہ امیر خسرو سے منسوب یہ کتاب دراصل جعلی ہے اور اس کا اصل مصنف 'ضیاء الدین خسروؔ' ہے۔ضیاء الدین خسرو سے متعلق جو تفصیلات مرتب کی اس سے یہ طے ہوا کہ امیر خسرو اس کے مصنف نہیں ہیں کیونکہ اس کی زبان اردو ہے اور اس حیثیت سے کہ اس میں فارسی، عربی کے اس زمانے کے مشتمل الفاظ کے ہندوی معنی دیے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس کا تعلق عموماً اردو زبان اور ادب کے بتدریج ارتقاء سے ہے۔

گیان چند جین لکھتے ہیں کہ:

''محمود شیرانی کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے امیر خسرو سے منسوب خالق باری سے بے دخل کیا''

مختصراً یہ کہ اردو کے بتدریج ارتقا میں محمود شیرانی ایک بڑا نام ہے۔ انھوں نے لسانیات، تنقید، تحقیق اور تدوین کے میدان میں اپنی بہترین تصنیفات چھوڑی ہیں۔شیرانی صاحب کے زمانے میں ہمارے یہاں تحقیق ابتدائی مرحلے میں تھی۔محمود شیرانی نے اردو میں تحقیق کے معیار کو بلند کیا۔انھوں نے اس میں جدید مغربی اصولوں کا رواج قائم کیا، بہت سے غلط نظریات، مسخ شدہ تاریخی حقائق کو درست کیا۔ان کو تدوین متن سے کافی دلچسپی تھی۔مختلف کتابوں کے زمانہ تالیف اور ان کے اصل خالق کا تعین کرنا ان کا خاص میدان تھا۔شیرانی صاحب نے مسلسل کوششوں اور جستجو سے قلمی کتابوں کا ذخیرہ بھی تیار کیا تھا۔جو اب 'پنجاب یونیورسٹی لائبریری' کی زینت ہے۔

حوالہ جات:

1۔ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، اشاعت اول، لاہور، 1928، ص 25
2۔ شائستہ حمید خان، ماہنامہ، اخبار اردو، اسلام آباد، ستمبر 2008، ص 34
3۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات، جلد اول، 1993، ص 190
4۔ رشید حسن خاں، ادبی تحقیق، علی گڑھ، 1978، ص 9
5۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات، جلد اول، 1993، ص 481، مشمولہ: خالق باری اصول و تدوین، مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، شیرانی نمبر 1980
6۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی و ادبی خدمات، جلد اول، 1993۔ 481، مشمولہ: اورینٹل کالج میگزین، شیرانی نمبر۔ فروری۔ 1947
7۔ شائستہ حمید خان، حافظ محمود شیرانی بطور محقق و مدون، ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد، ستمبر 2008، مشمولہ: ڈاکٹر خلیق انجم، ہندوستان میں اردو تحقیق و تدوین
8۔ محمود شیرانی، مجموعہ نغز، جلد اول، دیباچہ مرتب، 1933، ص یج
9۔ محمود شیرانی، مجموعہ نغز، جلد اول، دیباچہ مرتب، 1933، ص کا
10۔ محمود شیرانی، مجموعہ نغز، جلد اول، دیباچہ مرتب، 1933، ص یج
11۔ محمود شیرانی، مجموعہ نغز، جلد اول، دیباچہ مرتب، 1933، ص یج

■

Mohd Jabir Hamza
Resear Scholar, Dept of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob.:9198329043
E-mail: mohdjabir786@gmail.com

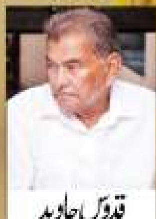

قدوس جاوید

شاعر کشمیر مہجور اور اردو غزل

ظفر اقبال نے کچھ عرصہ قبل لکھا تھا:

''میرے سمیت، غزل کے نام پر جو کچھ تخلیق کیا جا رہا ہے، ٹریش، بکواس اور محض خانہ پری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹریش لکھنے والے ہر دور میں موجود رہے ہیں کیونکہ انھیں ٹریش پسند کرنے والے بھی دستیاب تھے۔ تاہم ہر دور میں، ایک آدھ ایسی آواز بھی موجود رہی ہے، جو دوسروں سے الگ اور صاف پہچانی بھی جا سکتی تھی''

(ظفر اقبال 'غزل میں کایا کلپ کی ضرورت 'مشمولہ 'دنیا زاد' پاکستان۔ اکتوبر 2011، ص 552)

ریاست جموں و کشمیر میں اردو غزل کے حوالے سے مہجور کے یہاں بھی ایک ایسی آواز تھی جو اپنے دور میں دوسروں سے الگ بھی تھی اور صاف پہچانی بھی جاتی تھی۔ میر رسوا کو اردو کا پہلا کشمیری شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ رسوا، فانی اور قبول سے لے کر حشمت اور محشر وغیرہ نے جموں و کشمیر میں اردو غزل کی بنیادیں مستحکم کیں لیکن فارسی غزل اور کشمیری غزل، گیت اور دوہوں کی شعریات کی آمیزش و آویزش سے، اس غیر اردو منطقے میں اردو غزل کو نئے امکانات سے روشناس کروانے کا فریضہ اول اول مہجور نے ہی انجام دیا۔

اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شاعر کشمیر مہجور (پیدائش: 12 شوال 1305ھ، وفات: 1952) فارسی اور کشمیری کے ساتھ ساتھ ایک عرصہ تک اردو شاعری کو بھی سیراب کرتے رہے۔ کشمیری زبان کے مستند محقق، نقاد، شاعر اور مہجور کے ہمعصر دوست عبدالاحد آزاد نے 'کشمیری زبان اور شاعری' میں لکھا ہے:

''1912 میں مہجور کو محسوس ہوا کہ اب فارسی کا مذاق ملک میں روز بروز ختم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جگہ اردو لے رہی ہے تو آپ نے بھی اردو میں شعر کہنے شروع کیے جس کی ابتدا یوں ہوئی کہ 1912 کے آغاز میں لداخ کی ملازمت کے بعد مہجور موسم سرما میں پھر پنجاب گئے، وہاں امرت سر سے لدھیانہ جانا پڑا۔ ان دنوں لدھیانہ میں ایک انجمن 'بزم ادب' کے نام سے حضرت آفت لدھیانوی کی سرپرستی میں قائم تھی، جس کے تحت پندرہ روزہ مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا۔ مہجور کو بھی شمولیت کی دعوت دی گئی... ایک غزل کہنا پڑی۔ مصرعہ طرح یہ تھا۔

طائر دل کے پھنسانے کو یہ دام اچھا ہے

قوافی سے قطع نظر، غالب سے مستعار زمین پر مہجور نے مشاعرہ میں 19 اشعار کی غزل سنائی۔ حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ خصوصاً اس شعر کی آفت صاحب نے بڑی داد دی۔

اجڑے غاروں میں رہا کرتے ہیں رہزن چھپکے
دل مضطر ہی میں دلبر کا قیام اچھا ہے

جموں و کشمیر کے ممتاز دانشور موتی لال ساقی نے اپنے مضمون 'مہجور... تازہ معلومات کی روشنی میں' میں مذکورہ غزل کے حوالے سے لکھا ہے:

''بقول آزاد، مہجور نے 1912 کے بعد فارسی کو ترک کر کے اردو میں شعر گوئی شروع کی۔ لیکن ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ، 1912 سے قبل بھی اردو میں شعر کہتے تھے کیونکہ ان کی ایک غزل پر، 10 مارچ، 1911 کی تاریخ درج ہے۔ بقول آزاد، مہجور کی یہ غزل، 19 اشعار پر مشتمل ہے لیکن اس کے صرف چھ شعر مل سکے ہیں جو یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

تشنۂ غم کے لیے وصل کا جام اچھا ہے
عندلیبوں کے لیے گل کا پیام اچھا ہے
در دولت پہ گئے بار نہ پایا اے دل
تو ہے بیکس تجھے عزت کا مقام اچھا ہے
راز سربستہ کی دل میں ہے حفاظت لازم
مال رکھنے کے لیے مال گودام اچھا ہے
اجڑے غاروں میں رہا کرتے ہیں رہزن چھپکے
قلب مضطر میں ہی دلبر کا قیام اچھا ہے
دل سے بہتر ہے کہ آنکھوں پر بٹھائیں ان کو
اوج پر ہووے اگر طالع، تمام اچھا ہے
زلف اور خال کو مہجور یہ سمجھا میں نے
طائر دل کے پھنسانے کو یہ دام اچھا ہے

آزاد کے مطابق ''اس پذیرائی کے بعد مہجور کی جھجک دور ہوئی اور آپ نے بارہ سال یعنی 1924 تک اردو زبان کو اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا۔ اس عرصے میں کبھی کبھار فارسی شعر بھی کہتے رہے مگر اکثر اردو ہی ذریعہ اظہار ہوا کرتی تھی۔ اگر آپ کا اردو اور فارسی کلام جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ترتیب دی جا سکتی ہے حالانکہ بہت سا کلام ضائع بھی ہوا ہے۔ بہت سا اخبار و رسائل میں شائع ہو

چکا ہے کچھ غیر مطبوعہ ہے۔غزل، مناقب،قومی اور تاریخی نظمیں لکھی ہیں اور ہر صنف کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔''

(عبدالاحد آزاد: کشمیری زبان اور شاعری، حصہ سوم، ص 274)

مہجور نے اردو میں شعر گوئی کا آغاز کب سے کیا؟ اور اپنی فارسی شاعری کو حاشیے میں رکھنے کے بعد مہجور نے پہلے اردو میں شاعری شروع کی یا کشمیری میں، اس پر محققین کے درمیان اختلاف ہے۔موتی لال ساقی نے اس ضمن میں اپنے مذکورہ مضمون میں ہی دعوی کیا ہے:

''مجھے مہجور کی ڈائری میں ان کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ایسے مادہ ہائے تاریخ ملے ہیں جن سے ان کی شاعری کی ابتدا کے بارے میں گرہیں کھل جاتی ہیں اردو میں شاعری کی ابتدا کے بارے میں مادہ تاریخ یوں ہے'سخن دان کشمیر'۔ 1335 ہجری۔

کشمیری شاعری کی ابتدا کی نسبت ماد تاریخ اس طرح ہے''کشمیری سخن دان 1345 ہجری حساب لگانے سے 1335ھ 1916اور 1345ھ 1926 بنتا ہے۔اس طرح انھوں نے اردو میں شاعری کی ابتدا، 1916 میں اور کشمیری شاعری کی ابتدا، 1926 میں کی ہے۔''

لیکن موتی لال ساقی نے مہجور کے اس دعوے کو کہ انھوں نے 1916 سے اردو شاعری کی ابتدا کی، مہجور کا مغالطہ قرار دیتے ہوئے مہجور کی 1911 کی سات اشعار پر مشتمل ایک اردو غزل نقل کی ہے جو مہجور نے ترال کے راجہ عبدالرحمن صاحب فارسٹر محکمہ جنگلات کی خاطر کہی تھی۔یہ غزل شیرازہ کے مہجور نمبر میں صفحہ 71 پر اس طرح شامل اشاعت ہے۔

آہ مجھ پر پھر ستم ہونے لگا
دور جب سے وہ صنم ہونے لگا
حال زار قلب مضطر سینے پر
خون دل سے اب رقم ہونے لگا
گلرخوں کی بے وفائی دیکھ کر
بارغم سے سرو، خم ہونے لگا
جب سے وہ دلبر جدا مجھ سے ہوا
ہم نشین رنج و الم ہونے لگا
یارمن محفل میں کچھ رونق نہیں
شربت غم جام جم ہونے لگا
وصل کی شب قہر میں ساری کٹی
مہر ہوتے صبح دم ہونے لگا
دیر سے رخ پھیر کر مہجور آج
داخل بیت الحرم ہونے لگا

موتی لال ساقی کا مزید کرم ہے کہ انھوں نے مہجور کی سات اشعار کی ایک اور غیر مطبوعہ اردو غزل قارئین کی نذر کیا ہے، جو غالباً مہجور کے ابتدائی دور کی تخلیق ہے۔اس غزل کے اشعار اس طرح ہیں۔

عاشق بیداد ہیں پر قیس بیاباں اور ہیں
شیر قالیں اور ہیں شیر نیستاں اور ہیں
قتل کا فتوی دیا قاضی نے اس سے کیا ہوا
نیم بسمل جس سے ہوں وہ تیغ براں اور ہے
باغ شالامار کا سودا مرے سر میں نہیں
جس چمن میں ہے مرا گل، وہ گلستاں اور ہے
طعنہ اغیار جسم ناتواں پر تیر ہیں
جس سے زخمی دل ہوا وہ تیر مژگاں اور ہے
دلبر طناز کی اس خاک پر منزل نہیں
شاہ خوباں کے لیے اک کاخ وایواں اور ہے
مثل اسکندر نہیں ظلمات کا سودا مجھے
جس کا ہوں میں تشنہ لب وہ آب حیواں اور ہے
نالہ مہجور سن کر، بن کے بولا وہ صنم
شعر کہتے ہو اچھے پر داغ سخنداں اور ہے

مہجور فارسی چھوڑ کر اردو شاعری کی جانب کیوں کر راغب ہوئے اس کی ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔در اصل مہجور کی اردو شاعری کا یہ دور علامہ اقبال کی شاعری اور ابوالکلام آزاد کی نثر کی سحر کاری کا دور ہے۔جموں وکشمیر میں شخصی ڈوگرہ حکومت کے خلاف بغاوت کی تخم ریزی کا زمانہ بھی یہی ہے۔انھیں دنوں کشمیری الاصل علامہ اقبال کشمیریوں کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے شاعری کی شکل میں تکبیریں بلند کر رہے تھے۔

پنجہ ظلم و جہالت نے برا حال کیا
بن کے مقراض ہمیں بے پر و بے بال کیا
توڑ اس دست جفا کیش کو یا رب جس نے
روح آزادئ کشمیر کو پامال کیا

علامہ اقبال نے محض درد کی نشاندہی ہی نہیں کی، دوا بھی بتائی۔

سو تدابیر کی اے قوم یہی ہے تدبیر
چشم اغیار میں ملتی ہے اسی سے توقیر
در مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رہو مثل حروف 'کشمیر'

دوسری جانب لاہور کے اخبارات، کوہ نور، زمیندار، اخبار عام اور پیسہ اخبار، کے علاوہ ابوالکلام آزاد کا 'الہلال' وغیرہ جموں وکشمیر میں سیاسی بے داری کے شعلوں کو ہوا دینے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔محمد یوسف ٹینگ کے مطابق''مولانا ابوالکلام آزاد کا 'الہلال' بجلی کا کڑکا تھا جس نے سارے ہندوستان کی طرح کشمیر کے اہل دل اور اہل دول حضرات کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا، الہلال کی زبان اردو تھی اس نے کشمیر میں اردو نوازی کے ہی نہیں حریت پسندی کے تخم بھی بوئے۔''

(محمد یوسف ٹینگ، پیش گفتار، کشمیر میں اردو، ص 19)

15 ستمبر 1934 کو سرینگر کی نمائش گاہ میں کشمیری، پنجابی اور اردو کا ایک ملا جلا مشاعرہ کرنل بھولا ناتھ صاحب کی صدارت اور خوشی محمد ناظر کی سرپرستی میں منعقد ہوا۔مہجور بھی شامل ہوئے۔پہلے مہجور نے اپنی مشہور کشمیری غزل''باغ نشاط کے گلو......... ''اپنے ذاتی مغنی (پرانی اصطلاح میں راوی) لحن داوودی سے سرفراز، محمود شہری سے پڑھوا کر کھچا کھچ بھرے ہوئے مشاعرہ گاہ میں موجود سامعین کو مسحور کیا اور پھر اپنی اردو غزل پیش کی۔اردو غزل کے لیے مصرعہ طرح یہ تھا۔

''گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو''

یہ مصرعہ غالب کی اس غزل سے لیا گیا تھا جس کا مطلع ہے۔

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منھ میں زباں کیوں ہو

مہجور نے اس پر جو اردو غزل پڑھی اس کے چند اشعار اس طرح ہیں۔

دل درد آشنا میرا، کسی کا ہم زباں کیوں ہو
عیاں انجام ہو جس کا وہ میری داستاں کیوں ہو
نہ سوچو پہلے کیا انجام ہوگا دل کے سودا کا
دم ہنگامہ آرائی، غم سود و زیاں کیوں ہو
کیا باد صبا نے حسن کا ہر چار سو شہرہ
چمن میں آج گلچیں کو ہراس باغباں کیوں ہو
نکالا گوشہ عزلت سے اس کو، میرے نالوں نے
مری آہ و فغاں سن کر وہ مجھ پر مہرباں کیوں ہو
بدل دی رخ کی زردی غازہ مغرب کی سرخی نے
قدیمی وضع کا پابند اب ہندوستاں کیوں ہو
نیاز و ناز کی باتیں، تکلف سے ہیں بالا تر
تکلم میں گل و بلبل کے مالی ترجماں کیوں ہو
بہا ہے اشک کے ہمراہ، میر کارواں ہو کر
جو سرمہ کی طرح ہو بے وفا وہ رازداں کیوں ہو
رہ کوئے صنم، گوشہ نشیں زاہد بتائے کیا
جو منزل سے ہو ناواقف وہ میر کارواں کیوں ہو
پئے تسکین دل لازم ہے اے مہجور خاموشی
خیال بیش و کم، تا کے، گماں ایں و آں کیوں ہو

اسی سال ہولی کے ایام میں نوروز اور عید الفطر کے تہوار پڑتے تھے مہجور صاحب نے نشاط باغ میں بیٹھ کر ایک اردو غزل لکھی جو مارتنڈ میں، 4 چیت 1991 بکرمی کے شمارے

میں شائع ہوئی، چار اشعار پر مشتمل اس غزل کے اشعار اس طرح ہیں۔

اب کے آیا موسم گل لے کے پیغام نشاط
عید ہے نوروز ہے ہولی ہے انجام نشاط
آنکھ نرگس کی کھلی سنبل نے زلفیں کھول دیں
ہے گل بادام مست لذت جام نشاط
سبزۂ نوخیز پر رقص عروس نوبہار
جھومتا پھرتا ہے گویا بادہ آشام نشاط
اے خوشا روزیکہ خوش دل ساکنان کاشمر
عید اور ہولی منائیں مل کے باہم بے خطر

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مہجور کی اردو اور کشمیری غزلوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں انھوں نے فارسی اور اردو کے متعدد ممتاز شعرا مثلاً عرفی شیرازی، خان خاناں، غنی کاشمیری، غالب، ذوق اور امجد حیدرابادی کے متون کی کہیں تجدید کی ہے تو کہیں تحدید۔ کہیں متن پر متن قائم کیا ہے تو کہیں متن میں معنی و مفہوم اور کیفیت و تاثر میں ایسی تہہ داری اور حسن خیزی پیدا کی ہے کہ مہجور کے اشعار، اصل اشعار سے بلند ہوتے نظر آتے ہیں۔ ایسے کشمیری اشعار سے قطع نظر اردو سے صرف دو مثالیں دیکھیے۔

استاد ذوق کا شعر ہے۔

پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسمان
کھائے اگر ہزار برس چکر آسمان

مہجور کہتے ہیں۔

نظیر اس کی دکھا سکتا نہیں یہ چرخ دولابی
اگر لاکھوں برس کرتا رہے گا چرخ گردانی

امجد حیدرابادی کا بڑا عمدہ سا شعر ہے۔

نہ سمجھا تم نے کچھ انجام پہلے دل لگانے کا
ذریعہ اب نہیں ہے کوئی دل کے واپس آنے کا

مہجور نے اپنے شعر میں اس مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

نہ سوچا پہلے کیا انجام ہوگا دل کے سودا کا
دم ہنگامہ آرائی غم سود و زیاں کیوں ہو

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مہجور اقبال سے بھی بے حد متاثر تھے۔ اس کے بارے میں عبدالاحد آزاد نے تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مہجور نے علامہ اقبال کی وفات پر مادہ تاریخ بھی نکالا تھا، 23 اپریل 1938 کو مہجور نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے "سنا گیا علامہ سر محمد اقبال فوت ہوا ہے۔" اس عبارت کے نیچے یہ مادہ تاریخ درج ہے،

آہ اقبال؛ آفتاب آسمان شاعری
1357 ہجری

اقبال اور مہجور کے مابین مراسلت بھی تھی۔ 'اقبال نامہ' اور 'انوار اقبال' میں، علامہ اقبال کا مہجور کے نام 1922 کا وہ خط شامل ہے جس میں اقبال نے 'تذکرہ شعرائے کشمیر' لکھنے کے ارادے پر مہجور کو مبارک باد پیش کی ہے اور تذکرہ لکھنے کے لیے بعض مشورے بھی دیے ہیں۔ پاکستان کے کلیم اختر نے اپنے ایک مضمون میں مہجور کو اقبال کا کشمیری ترجمان قرار دیا ہے۔ مہجور نے اردو میں جو چند ایک قومی، وطنی اور انقلابی نظمیں لکھی ہیں ان میں علامہ اقبال کی نظموں کی طرح جوش و ولولہ اور تفکر و تفلسف کی حرارت کے ساتھ ساتھ تغزل کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ اس ضمن میں مہجور کی ایک نظم 'خطاب بہ مسلم کشمیر' خاص طور پر مشہور ہے جو 6 جون 1924 کو لاہور کے ''اخبار کشمیر میں شائع ہوئی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ نظم علامہ اقبال کی نظم 'خطاب بہ مسلم' کے زیر اثر لکھی گئی تھی۔ ریاست جموں و کشمیر کی موجودہ صورت حال میں مہجور کی اس نظم کی عصری معنویت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔ تبرکاً اس نظم کے ایک دو شعر پر نظر ڈال لیں۔

بتا اے مسلم کشمیر کبھی سوچا بھی ہے تو نے
تو ہے کس گلشن رنگیں کا برگ شاخ عریانی
ترے اسلاف وہ تھے جن کے علم و فضل کے آگے
ادب سے جھکتے تھے دانشوران ہند ایرانی

عبدالاحد آزاد نے 'کشمیری زبان اور شاعری' میں اس نظم کے نو (9) اشعار نقل کیے ہیں لیکن موتی لال ساقی نے شیرازہ مہجور نمبر میں شامل اپنے مذکورہ مضمون میں ایک نایاب مخطوطے کی بنیاد پر، اس نظم کے گیارہ اشعار پیش کیے ہیں۔ پھر بھی قیاس ہے کہ اس نظم میں کچھ اور اشعار بھی ضرور ہوں گے جن کا منظر عام پر آنا ابھی باقی ہے۔ مہجور کی اردو نظم نگاری ایک الگ مطالعے کا موضوع ہے اس لیے گریز اختیار کرتے ہوئے یہاں گفتگو کو صرف مہجور کی اردو غزل گوئی تک ہی محدود رکھا جاتا ہے۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ مہجور کی شہرت عرف عام میں کشمیری زبان کے شاعر اعظم کے بطور ہے لیکن انھوں نے فارسی کے بعد جموں کشمیر میں اردو غزل کے فروغ و ارتقا میں وہی کردار ادا کیا جو ولی دکنی (گجراتی) نے دکن اور شمالی ہند میں اردو غزل کو عروج پر پہنچانے کے لیے کیا تھا۔ دکن میں بھی (دکنی) اردو غزل کے ابتدائی نمونے تو محمود، فیروز، محمد قلی قطب شاہ اور حسن شوقی وغیرہ کے یہاں ملتے ہیں لیکن غزل کو جدید رنگ و آہنگ ولی دکنی نے ہی دیا۔ اسی طرح جموں کشمیر میں (ریختہ) اردو غزل کی شروعاتی کوششیں، ملا محسن فانی، عبدالغنی قبول، وغیرہ کے یہاں ملتی ہیں لیکن زمانی تقدم اور فنی، لسانی اور جمالیاتی خوبیوں کی بنا پر میر کمال الدین رسوا جموں و کشمیر کے پہلے اردو غزل گو قرار دیے جانے کا پورا حق رکھتے ہیں کیونکہ رسوا ہی ہیں جن کے یہاں اردو غزل کا وہ ترقی یافتہ روپ نمایاں ہوتا ہے جو اٹھارہویں صدی کی اردو غزل کا خاصہ ہے لیکن اب اس کو کیا کہیے کہ اب تک رسوا کی گنی چنی اردو غزلیں ہی دستیاب ہو سکی ہیں رسوا کے چند معاصرین اور بعد میں آنے والے شاعروں نے بھی اردو

کہنے کی ضرورت نہیں کہ مہجور کی شہرت عرف عام میں کشمیری زبان کے شاعر اعظم کے بطور ہے لیکن انھوں نے فارسی کے بعد جموں کشمیر میں اردو غزل کے فروغ و ارتقا میں وہی کردار ادا کیا جو ولی دکنی (گجراتی) نے دکن اور شمالی ہندمیں اردوغزل کو عروج پر پہنچانے کے لیے کیا تھا۔ دکن میں بھی (دکنی) اردو غزل کے ابتدائی نمونے تو محمود، فیروز، محمدقلی قطب شاہ اور حسن شوقی وغیرہ کے یہاں ملتے ہیں لیکن غزل کو جدید رنگ و آہنگ ولی دکنی نے ہی دیا۔

میں غزلیہ اشعار کے چند ایک ہی نمونے چھوڑے ہیں اس صورت حال میں تاریخی حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ اردو غزل کے ہند ایرانی مزاج و منہاج، رواج و رسومات اور خالص کشمیری ارضیت کے ساتھ جموں و کشمیر میں جدید اردو غزل کی جتنی بھی موضوعی، لسانی، فکری اور اسلوبیاتی جہتیں ملتی ہیں ان میں سے بیشتر کے سوتے شاعر کشمیر پیر زادہ غلام احمد مہجور کی اردو (بشمول فارسی، کشمیری) غزلوں سے ہی پھوٹے ہیں مہجور کی غزل کی شعریات کے عناصر روایتی اردو غزل کے عناصر سے قدرے الگ ہیں۔ ان عناصر کی جڑیں، رودکی اور سعدی، عرفی اور شیرازی اور شیخ العالم کی فارسی غزل کی شعریات کے علاوہ، لل عارفہ، شیخ نورالدین ریشی، حبہ خاتون اور محمود گامی سے لے کر درویش عبد لقادر قادری اور رسول میر تک کی کشمیری شاعری کی شعریات میں بھی پیوست ہیں۔ مہجور، رسول میر کے تئیں کچھ زیادہ ہی عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک کشمیری شعر میں یہاں تک کہا ہے کہ "دراصل یہ رسول میر ہی ہیں جو میری ذات کے حوالے سے درد و سوز کے جوت جلا رہے ہیں"۔ غزل کے حوالے سے خاص طور پر حبہ خاتون کے غزل نما کشمیری 'لولوگیت' کشمیر میں

غزل کے لیے میدان ہموار کر چکے تھے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ جموں کشمیر میں غزل کی صنف فارسی سے کشمیری میں اور کشمیری سے اردو میں آئی۔ علی جواد زیدی نے لکھا ہے :

''غزل کا مختصر سا سانچہ اور ہلکے پھلکے جذبات اور خیالات، جو فارسی کی وساطت سے کشمیر آئے تو لوک ادب سے اس کے سلسلے جا ملے اور 'لولوگیت' وغیرہ کے زیر اثر کشمیری غزل ہر ٹوٹے مکان تک پہنچ گئی۔''

(علی جواد زیدی: مقدمہ کشمیری زبان اور شاعری، حصہ دوم، ص 72)

محمد دین فوق نے 'خواتین کشمیر' میں لکھا ہے:

''حبہ خاتون نے اپنی کشمیری غزلیں، جو کہ فارسی طرز پر تھیں اس فارسی موسیقی کے اصول وقواعد میں شامل کرلیں۔''

پروفیسر محب الحسن نے بھی Kashmir under the Sultans میں لکھا ہے:

''ایک صوفی سید مبارک شاہ کے مشورے پر اس (حبہ خاتون) نے فارسی بحور میں تجربے شروع کیے۔''

فارسی کی بعض روایات واقدار کے پیش نظر شاعری میں نئے تجربے کرنے کے عمل کو تقلید یا پیروی کی بجائے اجتہاد کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا اور حبہ خاتون نے اپنی کشمیری غزلوں میں اجتہاد ہی کیا ہے فارسی غزل کے اوزان وبحور کی من وعن تقلید نہیں کی ہے۔ روش عام پہ چلنا حبہ خاتون کا مزاج ہی نہیں تھا عبدالاحد آزاد بھی کہتے ہیں کہ ''لل عارفہ کے دل و دماغ میں دوسرے صوفی شعرا سے گریز کا جوش اور جذبہ نسبتاً تیز اور گہرا ہے'' امین کامل نے بھی اپنی تصنیف 'حبہ خاتون' میں اور علی جواد زیدی نے کشمیری زبان اور شاعری کے مقدمے (ص 76) میں یہ مانا ہے کہ 'فارسی طرز' حبہ خاتون کے گیتوں پر صادق نہیں آتی.... ہاں فارسی غزل کے چند اثرات ابھرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ نقش بہت ہی دھندلا ہے اور دقت نظر کے بغیر محسوس نہیں ہو سکتا۔'' یہی بات مہجور کی کشمیری اور اردو غزلوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، مہجور اگر اپنی اردو غزلیہ شاعری میں بھی ممتاز و افضل ثابت ہوتے ہیں تو اسی وجہ سے کہ انھوں نے فارسی اور کشمیری شعریات سے رنگ وروغن لے کر اپنی اردو غزل کو ایک نیا روپ دیا ہے۔ مہجور کی جو اردو غزلیں اب تک سامنے آسکی ہیں ان کی داخلی ہیئت میں کشمیری شعریات کی حرارت صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ مہجور کی غزلوں میں کشمیر کے تاریخی اور دیومالائی واقعات، کردار تلمیحات اور استعارات کے استعمال سے ایک طرف جہاں ان کی غزلوں میں تخلیقی وجمالیاتی تہ داری پیدا ہوتی ہے وہیں رومانی اور عشقیہ مضامین میں خیالی اور تصوراتی کی جگہ جیتے جاگتے زندہ ومتحرک کردار تراشنے کا عمل ان کی غزلوں میں ارضیت پیدا کرتا ہے اس دوآتشہ کیفیت کے سبب مہجور کی غزل سنتے یا پڑھتے ہی دل میں اتر جاتی ہے۔ یوں تو مہجور کی غزل میں تصوف و اخلاق، احتجاج و انقلاب، فطرت پسندی اور وطنیت وغیرہ کے متعدد دائرے اور زاویے ملتے ہیں لیکن اکثر ناقدین نے مہجور کی غزل میں عشق و رومان کو ان کی شناخت قرار دیا ہے۔ ٹیگور کا مہجور کو، کشمیر کا ورڈسورتھ قرار دینا اسی بنا پر ہے۔ حالانکہ ورڈسورتھ کے 'لیریکل بیلیڈس' اور مہجور کی عشقیہ غزل یا لولوگیت میں زمین آسمان کا فرق ہے دراصل مہجور کی عشقیہ شاعری میں، ورڈسورتھ کی عشقیہ شاعری کے برعکس روحانیت اور ارضیت کی تہذیب وتطہیر کا غلبہ ہے، حامدی کاشمیری اس کی تصدیق ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ان (مہجور) کے یہاں ذاتی نوحہ فریاد بن کر نہیں رہ جاتا، بلکہ اپنی تشکیلی صورت میں جذباتی وفور کی تہذیب کا باعث بن جاتا ہے.... عشق ان کے پورے تخلیقی وجود کو متحرک کرتا ہے اور تخلیق شعر کا بنیادی محرک بن جاتا ہے..... عشقیہ جذبہ مہجور کی داخلی زندگی کی گہرائیوں میں اتر کر شعور اور لاشعور کی حد فاصل کو پگھلا دیتا ہے، اور تخلیقی سوتوں کو جگاتا ہے وہ.... اس جذبے سے نہ جانے اور کتنے خوابیدہ یا بیدار جذبوں کو متحرک کرتے ہیں اور ایک وحدت میں سمو دیتے ہیں وہ تخلیق شعر کے عمل میں جذبے کے بجائے وقوعوں اور پیکروں سے زیادہ نسبت رکھتے ہیں جو جذبے کے متنوع رنگوں کی تجسیم کاری کرتے ہیں اور قاری کو حیرت اور مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں۔''

(مہجور کا ایک وژن- تجزیاتی مطالعہ: حامدی کاشمیری، شیرازہ، مہجور نمبر، ص 224)

اسی لیے مہجور کی غزل (فارسی، کشمیری اور اردو) کی شعریات، جموں وکشمیر کی اردو غزل کے لیے امکانات کے نئے دروازے وا کرتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کشمیر کی اردو غزل (شاعری) نے فارسی اور اردو شعریات کے بعض ہیئتی، فنی، لسانی۔ اسلوبیاتی اور کرداری عناصر ضرور اپنائے ہیں لیکن اردو غزل میں خالص کشمیری شعریات اور ارض کشمیر سے مخصوص سماجی و ثقافتی اسما، علائم، پیکر، محاورات، ضرب الامثال، تلمیحات اور اساطیر بھی شامل کیے ہیں۔ کشمیر کی اردو غزل کو یہ بالخصوص مہجور اور مہجور کے اثر سے بالعموم دبستان جموں وکشمیر کے اردو شعرا کی دین ہے، مہجور، نازکی، رسا، حکیم منظور، حامدی کاشمیری، عرش صہبائی، شبیب رضوی، فاروق نازکی، ہمدم کاشمیری اور سلطان الحق شہیدی جیسے اساتذہ سے قطع نظر ریاست کے معاصر اردو شعرا، رفیق راز، خالد بشیر، ایاز نازکی، احمد شناس، شفق سوپوری، اور نذیر آزاد سے آگے لیاقت جعفری اور خالد کرار وغیرہ تک کے یہاں اس کی مثالیں بھری پڑی ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ جموں کشمیر کی اردو غزل میں کشمیری شعریات، بلکہ یوں کہیں کہ 'کشمیریت' کی رنگ آمیزی کی ایسی ساری ادائیں اول اول مہجور کی غزلوں میں ہی نمایاں ہوتی ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ مہجور کی اردو غزل (شاعری) پر اب تک خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اور تو اور مہجور کا اردو کلام بھی ابھی تک یکجا اور محفوظ نہیں کیا گیا ہے۔

شیرازہ کے مہجور نمبر میں اور غلام نبی خیال کی ذاتی لائبریری میں مہجور کی متعدد غزلیں محفوظ ہیں۔ مہجور کے پوتے ابدال مہجور کہتے تو ہیں کہ ان کے پاس مہجور کی سو سے زائد اُردو غزلیں ہیں لیکن نہ تو وہ انھیں کسی کو دکھاتے ہیں نہ شائع کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ بات طے ہے کہ مہجور کے زمانے تک آتے آتے کشمیر میں اُردو غزل کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ مہجور کی غزلوں میں روایتی واردات و کیفیات کے بجائے موضوعی جدت ہے لیکن ساتھ ہی تغزل کے ماہرانہ برتاو کے اعلیٰ نمونے بھی ہیں۔ ان کی غزل یہ احساس دلاتی ہے۔ کہ غزل سے بھی انسانی سوچ فکر اور نفسیات کو خوبصورت تعمیری موڑ دیا جا سکتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو مہجور نے جموں وکشمیر میں اُردو غزل کو ایسے باوقار فنی و فکری، لسانی اور جمالیاتی امتیازات سے مالا مال کیا کہ بعد میں بہت دور تک، اُردو کے دوسرے مراکز کی طرح کشمیر کی غزل، کسی بھی زاویے سے بے راہ روی کا شکار نہیں ہوئی۔ مہجور کے بعد غلام رسول نازکی رسا جاودانی، نندلال کول طالب، شہہ زور، اور مہندر رینہ سے لے کر رفیق راز، ایاز نازکی اور شفق سوپوری کے بعد کی نسل میں بھی ایسے کئی شعرا ہیں جن کی غزلوں کو کسی بھی زاویے سے ٹریش نہیں کہا جا سکتا۔ آج کی تاریخ میں جموں وکشمیر کی اردو غزل نے وقت کے ساتھ، برصغیر کے دوسرے مراکز کی غزل کی، نہ صرف ہمسری کی ہے بلکہ اردو دنیا سے اپنے مخصوص ومنفرد تشخص کا اعتراف بھی کروایا ہے لیکن نہیں بھولنا چاہیے کہ جموں وکشمیر کی اردو غزل کو یہ سعادت اگر حاصل ہوئی ہے تو اس میں شاعر کشمیر میر غلام احمد مہجور کے زور قلم کا نمایاں کردار رہا ہے۔

■

Prof. A.Q. Jawaid
Baitul-Zehra, 27, Green Hills Colony
Near Govt. Higher
Secondary School, Bhatindi
Jammu - 181152 (J&K)

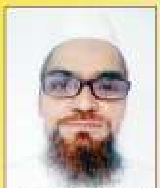

محمد مشتاق تجاروی

طامس ہڈرلی طامس

اردو کا پہلا روزنامچہ نویس

تھامس ہڈرلی (Thomas Heatherly) اردو کے مشہور انڈو یوروپین شاعر اور مرزا غالب اور عارف کے شاگرد کپتان الیگزینڈر ہڈرلی کے بڑے بھائی تھے۔ اردو میں وہ اپنا نام طامس لکھتے تھے اور یہی ان کا تخلص بھی تھا۔ ان کے والد جیمس ہڈرلی بھی مشہور آدمی تھے اور مرزا غالب کے دوست تھے۔ نواب جھجر کے یہاں ملازم تھے۔ طامس ہڈرلی اردو اور فارسی کے اچھے عالم تھے اور انگریزی تو ان کی مادری زبان تھی۔

اردو ادب میں طامس کی اہمیت دو وجہ سے زیادہ ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی الگزینڈر ہڈرلی آزاد کا دیوان مرتب کر کے شائع کیا جو اردو کے انڈو یوروپین شعرا کی صف اول کے شاعر تھے۔ دوسری اہمیت یہ ہے کہ اب تک کی دریافت کے مطابق وہ اردو کے سب سے پرانے روزنامچہ نویس ہیں۔ انھوں نے 1843 سے 1853 تک روزنامچہ لکھا۔ ان کا روزنامچہ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے شائع کر دیا ہے۔ اس کا اصل نسخہ دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی کے مطابق اردو کا سب سے پرانا روزنامچہ مولوی مظہر علی سندیلوی کا ہے۔ اس سے قبل جو روزنامچے لکھے جاتے تھے وہ فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ حتی کہ 1857 میں جیون لال، معین الدین اور عبداللطیف کے روزنامچے بھی فارسی میں لکھے گئے۔ اس اعتبار سے طامس کے روزنامچے کی خاص اہمیت ہے۔ ساتھ ہی اس سے نہایت اہم تاریخی اور ادبی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ یہ روزنامچہ بالکل ذاتی نوعیت کا ہے اور اس میں اپنے ذاتی مسائل کا ہی بیان ہے لیکن ضمناً تاریخی معلومات آگئی ہیں مثلاً ماہ اپریل 1849 میں کوہ نور ہیرا کے ولایت جانے کا تذکرہ ہے۔ اسی طرح لاہور کی جنگ کا تذکرہ ہے وغیرہ۔

طامس ہڈرلی کی صحیح تاریخ پیدائش تو نہیں معلوم لیکن وہ 1874 میں ریٹائرڈ ہوئے تھے اگر ان کی عمر اس وقت 55 سال مانی جائے تو ان کی ولادت 1819 کے قریب ہوئی ہوگی۔ اس طرح وہ اپنے چھوٹے بھائی الیگزینڈر ہڈرلی سے دس سال بڑے تھے۔

طامس کے والد جیمس ہڈرلی نواب جھجر کے معتمد خاص تھے۔ اس لیے ان کو بھی آسانی سے نواب صاحب کے یہاں ملازمت مل گئی۔ 50 روپیہ مہینہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ 1843 میں وہ اسی ملازمت پر تھے۔ پھر بعد میں 18، مارچ 1845 کو وہ کل ریاست کے منصرم خزانہ مقرر ہو گئے۔[1]

رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے کہ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز نواب فیض علی خاں کے بیٹے یعقوب علی خاں کے تحویل دار خزانہ کی حیثیت سے کیا تھا اور سو روپیہ ان کا مشاہرہ تھا۔[2] لیکن طامس کی ڈائری سے اس کی بہت تائید نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

1845 میں جولائی کے مہینہ میں نواب صاحب نے ان کو بڈھوانہ کا تحصیل دار مقرر کرنا چاہا۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا جس کی وجہ سے نواب صاحب خفا ہو گئے۔[3]

نواب صاحب کی ناراضگی کے ایام میں طامس نے ایک مہینہ کی رخصت لی اور الور چلے گئے۔[4] الور میں وہ کم و بیش ایک ماہ رہے۔ اور یہاں اپنے لیے ایسی جگہ بنالی کہ پھر ان کے خاندان کے متعدد لوگ الور میں ملازم رہے۔ اپنے سفر الور کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے:

''بباعث قبول نہ کرنے تحصیل داری بڈھوانہ کے نواب صاحب خیلے آزردہ خاطر ہو گئے۔ چوں کہ ہم بھی ان کی عنایت پر ناز کرتے تھے لہذا ہم نے ایک ماہ کی رخصت سرکار سے لی اور ارادہ الور جانے کا کیا اور والد بزرگوار سے بھی اجازت حاصل کر لی۔''

طامس نے اپنے سفر الور اور وہاں ایک مہینہ قیام کے حالات اس طرح لکھے ہیں:

''13 اگست دو روز میں انتظام دیہات مستاجروں کا کر کے آج بطرف الور روانہ ہوا اور براہ گریانی، ریواڑی، باول اور پیپل کھیڑہ 17/ تاریخ کو الور آکر

سرائے میں فروکش ہوا۔

19 اگست کو لال دروازہ میں ایک مکان کرائے کا لیا اور مرزا اسفندیار بیگ صاحب سے ملاقات حاصل کری۔

22 سے 23 اگست کو پیٹر بٹری (شاید صحیح ہنسلی ہے) کپتان پلٹن اور جان رسّل صاحب اور جناب آغا صاحب سے ملاقات کری۔

5 ستمبر کو ٹھاکر گلاب سنگھ کیسرولی والا اور ٹھاکر لکھدیر سنگھ جی سے ملاقات کری۔ یہ اول ملاقات لکھدیر جی سے ہوئی۔

10 ستمبر کو مہاراجہ نے سنگھ بہادر سے معرفت اسفندیار بیگ صاحب ملاقات ہوئی۔

12 ستمبر کو والد صاحب کا خط آیا کہ نواب صاحب بہت بیمار ہیں۔

13 ستمبر کو مہاراؤ راجہ صاحب کے محل میں لڑکا پیدا ہوا یعنی شیودان سنگھ جی پیدا ہوئے۔ ہم نے راؤ راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر نذر گذرانی اور مبارک بادوی نذر منظور ہوئی چار گھڑی تک محفل رقص میں حاضر رہا۔ عبداللہ کا ناچ تھا۔

15 ستمبر کو والد کا خط قاصد لایا کہ نواب فیض علی خاں صاحب بہادر نے وفات پائی۔ اسی روز راؤ صاحب کے پاس جا کر رخصت ہوا۔ راؤ صاحب نے خلعت دے کر فرمایا کہ جب چاہو آؤ تمہارا گھر ہے۔"[5]

اس اندراج سے اندازہ ہوتا ہے کہ طامس 17 اگست سے 15 ستمبر تک الور میں رہے۔ الور سے متعلق ان کی ڈائری اہم حوالہ ہے اس لیے اس کی متعلقہ عبارت پوری نقل کردی۔ اتفاق یہ کہ الور کے مشہور حکم راں مہاراجہ شیودان سنگھ کی پیدائش انھیں دنوں میں ہوئی اس طرح مہاراجہ کی تاریخ پیدائش کے لیے یہ ایک معاصر دستاویز بن گئی۔

نواب صاحب کی وفات کے بعد طامس پھر اپنی ملازمت پر واپس چلے گئے۔ لیکن اس کے بعد جلد ہی 9 مئی 1846 کو طامس نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنی جگہ اپنے بھائی الگزینڈر ہڈرلی کو ملازم کروا دیا۔[6] اور خود دوسرے علاقوں میں روزگار تلاش کرنے لگے۔ طامس کا اپنا مستاجری کا کام تھا، اس کے سلسلے میں جھجر آنا رہتا تھا۔ ایسے ہی کسی سفر میں ایک مرتبہ جھجر آئے تو یہاں نواب صاحب نے ان کی منصرمی کے زمانے کا حساب مانگ لیا۔ لیکن طامس پہلے ہی حساب کر کے صافی نامہ لے چکے تھے اس لیے کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوا۔[7]

طامس نے ملازمت کی تلاش میں اپنی جد و جہد کا اپنی ڈائری میں تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ وہ نوکری کی تلاش میں کئی جگہ گئے، دہلی میں نواب اکبر علی خاں کے ذریعہ بھی کوشش کی لیکن انھیں ملازمت کی جگہ نئے نئے تجربات ہی ملتے رہے۔ آخر ایک مرتبہ مایوسی کے عالم میں لکھا کہ "مگر ہمارے مقسوم آج کل کوئی روزگار نہیں"۔[8]

کافی دن کی تلاش و جستجو اور بڑی تگ و دو کے بعد بھی ان کو کوئی معقول روزگار نہ مل سکا آخر پھر جھجر میں ہی نوکری کرنی پڑی اور اس دفعہ وہی نوکری کرنی پڑی جس سے انکار کر کے مرحوم نواب صاحب کو پہلے ناراض کر چکے تھے یعنی بڈھوانہ کی تحصیل داری۔ 6 مارچ 1848 کو اسی بڈھوانہ میں تحصیل داری کی نوکری کر لی۔ ڈائری میں لکھا ہے "6 مارچ کو نواب صاحب نے ہم کو تحصیل دار بڈھوانہ کا کیا۔ شکر خدا کا بعد مدت روزگار کی صورت نظر آئی۔"[9]

طامس کے لیے یہ ملازمت کافی مشکل ثابت ہوئی۔ آئے دن سازشیں اور الزامات کا سلسلہ تھا۔ ایک مرتبہ تو نواب صاحب خود تحقیقات کے لیے بڈھوانہ آئے۔ طامس کی گرفتاری کا بھی حکم دیا۔ باضابطہ فوجی پہرہ میں حساب ہوا۔ طامس کے بقول وہ اس میں بچ گئے لیکن ان پر 24 ہزار روپیہ ہرجانہ عائد ہوا۔[10] اس واقعہ کے بعد 17 فروری 1851 میں طامس نے اس ملازمت سے دوبارہ استعفیٰ دے دیا۔ نواب صاحب ان کا استعفیٰ منظور نہیں کر رہے تھے لیکن طامس صاحب دہلی آ کر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب کو مجبوراً ان کا استعفیٰ قبول کر کے ان کو صافی نامہ دینا پڑا۔ اس وقت نواب صاحب کسی وجہ یا غالباً کسانوں کی بچول (دھرنا یا ہڑتال) کی وجہ سے دباؤ میں تھے طامس نے اس کا فائدہ یہ اٹھایا کہ اپنے والد کے لیے تاحیات پنشن لکھوالی۔[11]

15 جولائی 1852 کو طامس پھر جھجر میں ملازم ہوئے اور اس دفعہ باول کے تحصیل دار مقرر ہوئے۔ طامس کی ڈائری میں لکھا ہے کہ

"شکر اس خالق اور رزاق کا کہ آج مدت کے بعد صورت روزگار نظر آئی۔ یعنی نواب صاحب نے ہم کو تحصیل دار پرگنہ باول کا کیا۔"[12]

17 مئی 1854 میں طامس نے جھجر کی ملازمت ترک کردی اور جے پور کے قریب کھیتڑی کے مختار ہو گئے۔ 1855 میں لارڈ لارنس نے ڈھائی سو روپیہ ماہوار پر انھیں گوپال گڑھ (علاقہ میوات) کا تحصیل دار مقرر کیا گیا۔ 1862 میں وہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے اور ان کا تبادلہ الور ہو گیا۔ پھر اسی عہدے پر بھرت پور پہنچے اور یہاں مہتمم مال گذاری میں صدر مقرر ہوئے 400 روپے تنخواہ مقرر ہوئی۔ 1874 میں رٹائرڈ ہوئے اور میرٹھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی وہیں 1891 میں ان کی وفات ہو گئی۔ جارج پیش شور جوان کے بہنوئی بھی تھے انھوں نے قطعہ تاریخ وفات کہا۔

طامس اردو کے بہترین نثر نگار تھے جس کا ثبوت ان کی ڈائری ہے۔ وہ اردو کے شاعر بھی تھے نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ وہ عارف کے شاگرد تھے لیکن اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔[13] البتہ ان کی ڈائری میں عارف سے ملاقات کا تذکرہ ہے۔ لکھا ہے: "22 اکتوبر 1847، کو سوار ہو کر دہلی آیا اور لالہ اجودھیا پرشاد کے مکان پر قیام کیا اور نواب زین العابدین خاں عارف سے ملاقات

نواب صاحب کی وفات کے بعد طامس پھر اپنی ملازمت پر واپس چلے گئے۔ لیکن اس کے بعد جلد ہی 9 مئی 1846 کو طامس نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اپنی جگہ اپنے بھائی الگزینڈر ہڈرلی کو ملازم کروا دیا۔[6] اور خود دوسرے علاقوں میں روزگار تلاش کرنے لگے۔ طامس کا اپنا مستاجری کا کام تھا، اس کے سلسلے میں جھجر آنا رہتا تھا۔ ایسے ہی کسی سفر میں ایک مرتبہ جھجر آئے تو یہاں نواب صاحب نے ان کی منصرمی کے زمانے کا حساب مانگ لیا۔ لیکن طامس پہلے ہی حساب کرکے صافی نامہ لے چکے تھے اس لیے کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوا۔

17 مئی 1854 میں طامس نے جھجر کی ملازمت ترک کردی اور جے پور کے قریب کھیتڑی کے مختار ہو گئے۔ 1855 میں لارڈ لارنس نے ڈھائی سو روپیہ ماہوار پر انہیں گوپال گڑھ (علاقہ میوات) کا تحصیل دار مقرر کیا گیا۔ 1862 میں وہ ڈپٹی کلکٹر ہو گئے اور ان کا تبادلہ الور ہو گیا۔ پھر اسی عہدے پر بھرت پور پہنچے اور یہاں مہتمم مال گذاری میں صدر مقرر ہوئے 400 روپیے تنخواہ مقرر ہوئی۔ 1874 میں رٹائرڈ ہوئے اور میرٹھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی وہیں 1891 میں ان کی وفات ہو گئی۔ جارج پیش شور جو ان کے بہنوئی بھی تھے انہوں نے قطعہ تاریخ وفات کہا۔

طامس ھڈرلی اردو کے نثر نگار ہونے کے ساتھ اردو کے شاعر بھی تھے۔کسی تذکرہ نگار نے بطور شاعر ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ان کی ڈائری کے ساتھ ان کا ایک انتخاب کلام بھی شائع کیا ہے جو کسی انگریز نے کیا تھا لیکن ان کا نام درج نہیں ہے۔ان کی شاعری کے بارے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ان کے کلام میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔اس کی اہمیت یہی ہے کہ وہ ایک اینگلو انڈین شاعر کا کلام ہے۔اور اس کی دریافت سے ان شاعروں کی فہرست میں اضافہ ہو جاتا ہے جو غیر ملکی خمیر کے تھے مگر انہوں نے ہندستان میں رہ کرایسی محنت اور محبت سے اردو زبان کی تحصیل کی تھی کہ اس میں بے تکلف شعر کہہ سکتے تھے۔

کی۔''14

مرزا غالب سے بھی یقیناً تعلق تو رہا ہوگا چونکہ ان کے والد مرزا کے پرانے دوست تھے۔15 اور چھوٹے بھائی ان کے شاگرد بھی تھے اور باہم خط وکتابت بھی تھی اور یہ خود نواب زین العابدین خاں عارف سے ملنے بھی جاتے تھے جس کا ذکر ان کی ڈائری میں بھی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب کی ان سے زیادہ قربت نہیں تھی اس لیے غالب نے یوسف مرزا کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

''خدا کی قسم طامس ہڈرلی صاحب سے میری ملاقات نہیں ہے۔ہاں الک صاحب سے ہے سو ان کے نام کا خط کھلا ہوا تم کو بھیجتا ہوں۔پڑھ کر بند کر کر ان کو دو اور ان سے ملو اور جو کچھ وہ کہیں مجھ کو لکھو۔''16

طامس ہڈرلی اردو کے نثر نگار ہونے کے ساتھ اردو کے شاعر بھی تھے۔کسی تذکرہ نگار نے بطور شاعر ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ان کی ڈائری کے ساتھ ان کا ایک انتخاب کلام بھی شائع کیا ہے جو کسی انگریز نے کیا تھا لیکن ان کا نام درج نہیں ہے۔ان کی شاعری کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ان کے کلام میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے۔اس کی اہمیت یہی ہے کہ وہ ایک اینگلو انڈین شاعر کا کلام ہے۔اور اس کی دریافت سے ان شاعروں کی فہرست میں اضافہ ہو جاتا ہے جو غیر ملکی خمیر کے تھے مگر انھوں نے ہندستان میں رہ کر ایسی محنت اور محبت سے اردو زبان کی تحصیل کی تھی کہ اس میں بے تکلف شعر کہہ سکتے تھے۔17

دل چسپی کے لیے ان کے چند اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں ان میں معنی آفرینی کی کمی تو ہے لیکن لطف زبان قابل قدر ہے۔

بنا لیتے ہیں دیوانہ کوئی کیسا ہی عاقل ہو
وہ کیا جادو بھرا ہے شہر حسن آباد کیا جانے
مثل مشہور ہے طامس کہ جی خوش تو جہاں خوش ہے
خوشی گر سارا عالم ہو دل ناشاد کیا جانے
چاہ کے تم کو یہ طامس نے نتیجہ پایا
ہوئے عزت کے کئی، جان کے خواہاں کتنے
مت جا طیش میں پیارے، نازک بدن ہے تیرا
ڈھلتا ہے دن ٹھہر جا، ہے آفتاب منہ پر
دانتوں پہ تیرے اختر قربان لاکھ دل سے
صدقے ہزار جاں سے ہے ماہ تاب منہ پر
میرے پہلو سے جو اٹھ کر وہ دل آرام گیا
صبر وہوش وخرد وطاقت و آرام گیا
طرفہ دکھلائی یہ پستی و بلندی اس نے
ہم گھر اس کے گئے وہ لب بام گیا
ٹوکتا ہے تو مجھے کس لیے ہر بار رقیب
اس کے کوچے میں گیا میں، تجھے کیا کام، گیا
باغ ہستی میں یہ مخلوق ثمر ہیں طامس
پختہ و تر کوئی پژمردہ و خام گیا
اڑ گئی نیند کہ ایک پل نہیں لگتی ہے پلک
جا لڑی آنکھ یہ کس طالع بے دار سے آج
دل کو توڑا میرے، گھر تھا یہ ترا، خوب کیا
اپنے گھر کا تو مختار، برا کیا مانوں
اور جی چاہے تو دوچار سنالے پیارے
تیری الفت سے ہوں لاچار، برا کیا مانوں
نہ پھر تو مانگ کے کوچے میں آدھی رات کو اے دل
زبان شانہ سے آتی ہے یہ صدا تو کون ہے
لالہ چمن میں کشتہ ہے تیرے دہان کا
لاکھا جما ہے کیا ہی غضب رنگ پان کا
چکر میں ہیں جسے مہ و خورشید دیکھ کر
ہوں گے بڑے ستم جو یہ بالا ہے کان کا
اوڑھا ہے چاند تارے کا اودا دوپٹہ آج
پیارے زمیں ہو کیوں نہ جواب آسمان کا
کیا ہی لسانی سے باتوں میں وہ الجھاتا ہے
اللہ اللہ رے کافر تری تقریر کے پیچ
عقل کہتی ہے میں حیران ہوں جاؤں تو کدھر
عشق لینے نہیں دیتا مجھے اوسان کہیں
صدمہ عشق سے سب ہو گئے درہم برہم
دل کہیں، ہوش کہیں، عقل کہیں، جان کہیں
چھوڑ کر یار کے کوچے کو پھروں صحرا میں
کوئی مجنوں کی طرح میں بھی ہوں نادان کہیں
تاخت تاراج کیا تیغ نگہ نے دل کو
کچھ ہمیشہ سے نہ تھا ملک یہ ویران کہیں
عاشق ہوں ایک ایسے دل ربا پر
الفت جسے، نہ ڈھب دل بری کا
دن کو بھی وہی ذکر وہی شب کو تصور
اے دل تو عجب ذاکر و شاغل نظر آیا
شرم کب تک بس خدا کے واسطے توڑو حجاب
یہ بھی کوئی بات ہے صاحب تکلم زیر لب
فقیری بھیس، طامس نام، عرب کا یا عجم کا ہے
مگر ہندوستاں کا ہے نہ یاں کا ہے نہ واں کا ہے

حواشی

(1) اردو کا ایک ہند برطانوی شاعر اور اس کا روزنامچہ، از نثار احمد فاروقی، مشمولہ مجلّہ نقوش، لاہور، فروری 1961، ص 27
(2) رام بابو سکسینہ: یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین، نول کشور پریس، 1941، ص 70
(3) اردو کا ایک ہند برطانوی شاعر اور اس کا روزنامچہ، ص 25
(4) ایضاً، ص 25
(5) ایضاً، ص 25-24
(6) ایضاً، ص 27
(7) ایضاً، ص 27
(8) ایضاً، ص 29
(9) ایضاً، ص 30
(10) ایضاً، ص 33
(11) ایضاً، ص 33
(12) ایضاً، ص 35
(13) یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین، ص 70
(14) ایضاً، ص 29
(15) مرزا غالب: غالب کے خطوط، مرتبہ خلیق انجم، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی ص 781-2/2
(16) ایضاً، ص 2/782
(17) اردو کا ایک ہند برطانوی شاعر اور اس کا روزنامچہ، ص 13

■

Dr. Mufti Mohammad Mushtak
Asst. Prof. Dept of Islamic Studies
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

نقد و نگاہ

اردو شاعری میں فارسی الفاظ و تراکیب کا تصرف

محمد زبیر

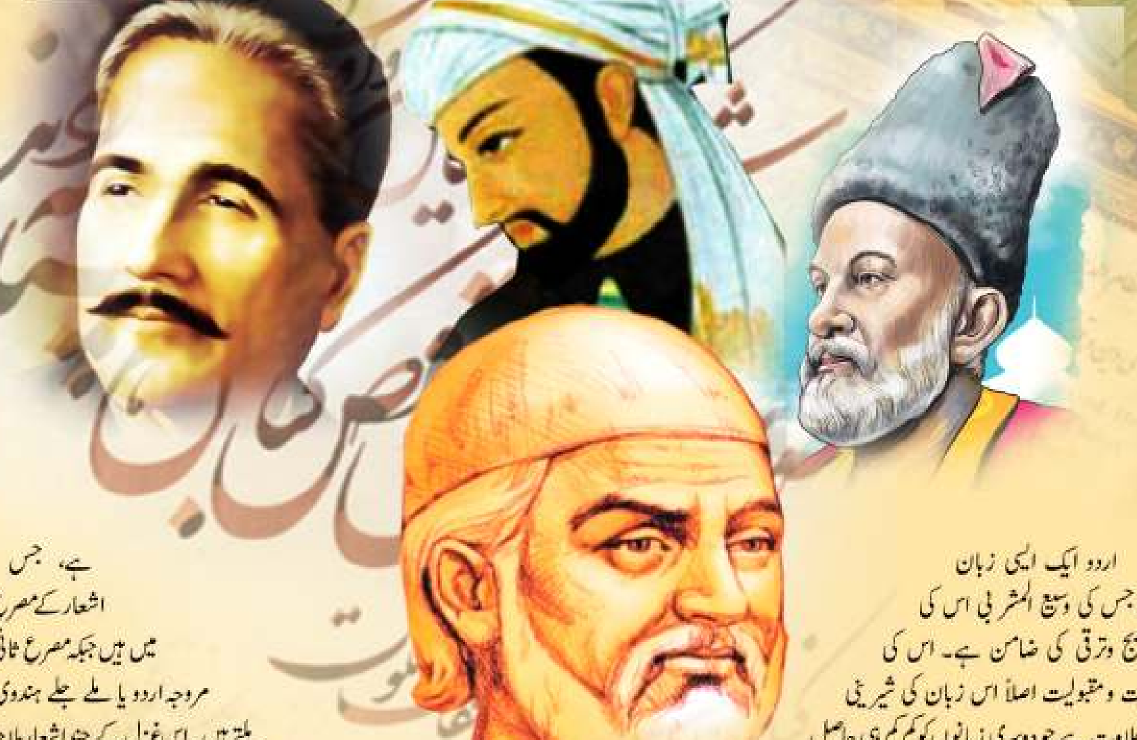

اردو ایک ایسی زبان ہے جس کی وسیع المشربی اس کی ترویج وترقی کی ضامن ہے۔ اس کی اہمیت و مقبولیت اصلاً اس زبان کی شیرینی اورحلاوت ہے جو دوسری زبانوں کو کم کم ہی حاصل ہے۔ یہ ایک مرکب زبان ہے جو مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ اس میں دیگر زبانوں کے الفاظ کو اپنانے اور جذب کر لینے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس زبان کو شیریں ودلکش اسلوب اور شگفتہ طرزِ ادا فارسی وعربی الفاظ سے میسر آئے ہیں۔ اردو کی عمر نسبتاً کم ہے لیکن ایک زمانہ تھا جب ہمارے ملک میں ہر طرف فارسی کا بول بالا تھا اور دربار سے لے کر بازار تک ہر خاص وعام کی زبان فارسی تھی۔ اطرافِ دہلی، علاقائی اور عربی وفارسی زبانیں مخلوط ہو کر ایک نئی زبان (اردو) وجود پذیر ہو رہی تھی۔ اس نئی زبان کی آمد سے فارسی زبان رفتہ رفتہ اپنا وجود کھوتی جا رہی تھی اور اردو غالب آ رہی تھی نتیجتاً اردو نے فارسی کے سیکڑوں الفاظ، اصولِ شعریات، پیرایۂ اظہار اور تلمیحات واصناف کو اپنے اندر ضم کر لیا۔

اوّل اوّل اردو زبان دہلی کے آس پاس بولی جا رہی تھی۔ جب یہاں کے شعرا فارسی کے بجائے اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے تو اپنے فن کو آب وتاب عطا کرنے کے لیے فارسی کے سبک اور شیریں الفاظ بکثرت استعمال کیے جس سے اردو شاعری میں نکھار تو پیدا ہوا اور زبان کا دائرہ بھی وسیع تر ہوتا گیا۔ اردو شاعری کی داغ بیل ڈالنے والوں میں امیر خسرو کا نام پیش پیش ہے۔ انھوں نے نظم میں برج بھاشا کی ترکیب سے انشاپردازی کا ایک نادر نمونہ پیش کیا، مکرنی، انمل، دوسخنی اور پہیلیاں ان کی خاص ایجادات ہیں۔ ان کے کلام میں فارسی وہندوی زبان کے اثرات نمایاں ہیں۔ اردو کی پہلی غزل جو امیر خسرو سے منسوب ہے، جس کے تمام اشعار کے مصرع اولیٰ فارسی میں ہیں جبکہ مصرع ثانی اس دور کی مروجہ اردو یا ملے جلے ہندوی الفاظ میں ملتے ہیں۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چوں شمع سوزاں، چوں ذرہ حیراں زمہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں، نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں
بحق روزِ وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسرو
سپیت من کے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

اردو زبان کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر زبانوں کی طرح اردو نے بھی دوسری زبانوں کے اثرات قبول کیے اور بے شمار عربی، فارسی، اور ترکی الفاظ اردو کے اپنے الفاظ ہو گئے۔ حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری کے یہ جملے اردو اور فارسی کے لسانی رشتے کے تعلق سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں:

''اصل زبان اردو کی، بھاشا ہے اور حلاوت وتمکینی فارسی وعربی سے ملی ہے۔ سنہ گیارہ سو اکیانوے میں سلطان محمد شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر چڑھائی کی اور یہاں کے آخری راجہ پرتھوی راج کو شکست دے

کر اپنا تسلط کیا اور رفتہ رفتہ بخوبی قبضہ سلاطینِ اسلامیہ کا ہو گیا تو شعرائے نامدار اور ادیبان بلاغت شعار فارس سے ہندوستان آئے اور کچھ عرصے تک اپنی اصلی زبان میں شعر کہے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کی زبانِ قدیم میں الفاظ عربی و فارسی اور ترکی ملتے گئے۔“

(بحر الفصاحت: از حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری، جلد اول، ص 37)

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے قدیم ادبی سرمایے کا بیشتر حصہ شاعری پر مشتمل ہے۔ چنانچہ اردو شاعری پر فارسی کے لسانی اثرات نے شعرائے اردو پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ شاہی دور میں درباری شعرا انعام واکرام کی غرض سے باشاہوں اور نوابین کی شان میں قصیدے کہا کرتے تھے۔ جب اردو زبان کا رواج بڑھا تو فارسی کے زیر اثر اردو قصیدے بھی کہے جانے لگے گویا اردو قصیدہ بھی بعض دوسری اصناف کی طرح فارسی سے مستعار ہے۔ آگے چل کر اس صنف میں مدحیہ کے ساتھ ہجو یہ اور نعتیہ قصیدے بھی لکھے گئے۔ اردو میں محمد قلی قطب شاہ نے کئی قصیدے لکھے لیکن ان کی زبان میں دکنی الفاظ کی بھرمار تھی اور وہ دکنی ماحول کی بھول بھلیوں سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ دکن میں دوسرا اہم نام نصرتی کا ہے ان کے قصائد بھی فارسی گو شعرا کے ہم رتبہ ہیں۔ نصرتی کی زبان نسبتاً نہایت بلیغ اور فارسی آمیز ہے۔ شمالی ہند میں اردو کا عبقری اور نابغۂ روزگار قصیدہ نگار مرزا محمد رفیع سودا پہلے صرف فارسی میں شعر کہتا تھا، جب اہل زبان فارسی کے بجائے ریختہ گو شعرا کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرنے لگے تو سودا بھی اردو شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے نہ صرف اس صنف میں طبع آزمائی کی بلکہ اسے معراج کمال تک پہنچا دیا یہاں تک کہ اس کے بعض قصائد عربی و فارسی کے ہم پلہ قرار پائے۔

اردو غزل اور نظم کے حوالے سے جن اہم شعرا کے یہاں فارسی الفاظ کا استعمال واضح طور پر ہوا ہے۔ اس میں میر تقی میر، خواجہ میر درد، مرزا غالب، الطاف حسین حالی، علامہ اقبال اور اقبال سہیل کے نام خصوصیت کے ساتھ آئیں گے۔

اردو شاعری کے دور اول میں میر کا نام سرفہرست ہے۔ انھیں شعر گوئی سے فطری مناسبت تھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ اپنی شاعری کا آغاز انھوں نے ریختہ گوئی سے کیا اور اپنے کلام میں فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال کثرت سے کیا۔ اس سلسلے میں اپنی کتاب 'نکات الشعرا' میں لکھا ہے:

”چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند۔ اکثر ترکیب

اردو میں محمد قلی قطب شاہ نے کئی قصیدے لکھے لیکن ان کی زبان میں دکنی الفاظ کی بھرمار تھی اور وہ دکنی ماحول کی بھول بھلیوں سے باہر نہیں نکل سکے تھے۔ دکن میں دوسرا اہم نام نصرتی کا ہے ان کے قصائد بھی فارسی گو شعرا کے ہم رتبہ ہیں۔ نصرتی کی زبان نسبتاً نہایت بلیغ اور فارسی آمیز ہے۔

کہ مناسب زبان ریختہ می افتد، آں جائز است۔ واین را غیر شاعر نمی داند۔ وترکیبے کہ نامانوسِ ریختہ می باشد آں معیوب است۔ ودانستن نیز موقوفِ سلیقۂ شاعری است۔ ومختار فقیر ہم ہمین است۔ اگر ترکیب فارسی موافقِ گفتگوئے ریختہ بود مضائقہ ندارد۔ ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم وآں محیط ہمہ صنعتہا است۔ تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادابندی، خیال وغیرہ۔“

(نکات الشعرا، ص 87-186، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، سنہ ندارد)

میر کے مطابق ایسی فارسی ترکیبیں اردو شاعری میں لائی جائیں جو ریختہ کے مناسب حال مستعمل ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ انھوں نے فارسی الفاظ وتراکیب کے ساتھ فارسی صنعتوں کے استعمال پر بھی زور دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارسی لوازمات ان کی شاعری میں بڑی برجستگی کے ساتھ ادا ہوئے ہیں۔ اس نوع کے چند اشعار دیکھیں:

چارہ گری بیمارئ دل کی رسم شہر حسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارہ جانے ہے
تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میر بھی ناداں تلخی کش
دم دار آب تیغ کو اس کے آب گوارا جانے ہے

ان میں چارہ گری (علاج)، بیماری، دل، شہر، دلبر ناداں (محبوب)، درد، تشنۂ خوں (خون کا پیاسا)، ناداں، تلخی کش (تلخی اٹھانے والا)، دم دار (مضبوط، طاقتور)، آب تیغ (تلوار کی کاٹ) اور آب گوارا یہ سب فارسی الفاظ ہیں۔ میر نے ان فارسی الفاظ کی مدد سے عشق، جمالیات اور عصری آگہی کے تصورات کو جس چابک دستی اور فنکاری سے پیش کیا ہے وہ میر کی اپنی زندگی کے نشیب وفراز کا اشاریہ ہیں۔ میر کے یہاں فارسی الفاظ کے ساتھ فارسی تراکیب بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ بیمارئ دل، دلبر ناداں، تشنۂ خوں، تلخی کش، آب تیغ اور آب گوارا وغیرہ فارسی تراکیب کا ہی نشانِ امتیاز ہیں۔

اردو میں بحیثیت صوفی شاعر خواجہ میر درد کو اولیت حاصل ہے۔ درد کے لیے اکثر تذکرہ نگار متفق ہیں کہ 'کلامش ہمہ تصوف است'۔ ایک خصوصیت جو غالب اور درد میں مشترک ہے وہ دونوں کے کلام میں فارسی پیرایۂ اظہار اور الفاظ وتراکیب ہیں۔ درد تصوف کے اس میدان میں غالب کے ہم رتبہ تو نہیں لیکن دوسرے اردو غزل گو اساتذہ سے کسی طور کم بھی نہیں ہیں۔ بطور مثال چند اشعار دیکھیں:

لے کر ازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے
گر درمیاں حساب نہ ہو ماہ و سال کا
مژگانِ تر ہوں یا رگِ تاک بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

خواجہ میر درد پہلے شعر میں زمانے کے ناقابلِ تقسیم ہونے کو بیان کر رہے ہیں اور ازل سے ابد تک ایک ہی زمانہ گردانتے ہیں۔ اس میں تا، بہ، گر، درمیاں، ماہ وسال فارسی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جبکہ ازل، ابد اور حساب عربی ہیں۔ دوسرے شعر میں مژگاں، تر، رگ، بریدہ اور رسیدہ فارسی الفاظ ہیں۔

مرزا غالب اردو کے نابغۂ روزگار میں سے ہیں۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں جابہ جا زندگی کے گوناگوں مسائل اس خوبصورتی سے ملتے ہیں کہ انھیں ایک فلسفی اور مفکر سمجھا جانے لگا ہے۔ ان کی نظر حکیمانہ ہے، اسی حکیمانہ نظر نے ان کی عظمت کو کہیں افزوں کر دیا ہے اور انھیں عظیم شعرا کی صفِ اول میں اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا ہے۔ انفرادیت ان کا وصفِ خاص ہے اور تہہ داری ان کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ نئی تراکیب، نئی تشبیہات اور الفاظ کے انتخاب واستعمال اور ان کی ہم آہنگی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کے کلام میں جو شعریت اور صوتی حسن ہے وہ دوسروں کے یہاں اکثر مفقود ہے۔ ان کے کلام کی اصل روح فارسی تراکیب والفاظ ہیں، ان کے استعمال سے اپنی شاعری میں اس طرح جان ڈالتے ہیں کہ ایک لفظ کے کئی معنی ومفہوم برآمد ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

ہنوز اک پرَتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

ہنوز، پرتو، یار، دل، افسردہ، گویا اور زنداں فارسی الفاظ ہیں اور نقش، خیال اور حجرہ عربی الفاظ ہیں جن کے زیر اثر شعر کا حسن دوبالا ہوگیا ہے۔ پرَتوِ نقشِ خیالِ یار کو باقی رکھنے کے لیے لفظِ ہنوز زور دیتا ہے یعنی خیال بھلانے پر بھی محبوب کا کچھ عکس باقی رہ جاتا ہے۔ یہاں لفظ افسردہ ذومعنی ہے، ایک دل کا حجرہ ہونا اور دوسرا خیالِ یار کے بھلانے کا سبب ہونا۔

غالب کا شمار ہر چند صوفی شعرا میں نہیں ہوتا لیکن ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ اور نظریاتِ تصوف کا عکس ضرور دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنے صوفیانہ کلام میں عربی و فارسی الفاظ کو اس خوبصورتی سے برتا ہے کہ نامانوس نہیں معلوم ہوتے۔ دیوانِ غالب میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ تصوف کی گونج سنائی نہ دیتی ہو۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اس کے الفاظ آرائش، ہنوز، پیش اور آئینہ فارسی سے آئے ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی علوم مشرقیہ کے جید عالم، ادب کے گرویدہ، شعروسخن کے جوہر شناس اور انتقادی بصیرت کے علم بردار تھے۔ انھیں اردو فارسی اور عربی تینوں زبانوں سے گہرا شغف تھا۔ انھوں نے شاعری میں سادگی وسلاست، جوش اور اصلیت وصداقت پر زور دیا۔ الفاظ کی جادوگری سے بچنے کی تلقین کی اور معیاری شاعری کے لیے تجاویز پیش کیں۔ مرزا غالب کی تاریخ وفات سے متعلق حالی نے تاریخ کہی ہے۔ اس حوالے سے ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

تھا گو وہ اک سخنورِ ہندوستاں نژاد
عرفی و انوری کا مگر ہم نبرد تھا
اس قافلہ میں آکے ملا گو وہ سب کے بعد
اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا

یہاں میرا مقصود مرزا غالب کی وفات کے متعلق نہ مادۂ تاریخ نکالنا ہے اور نہ بحث وتجزیہ، صرف فارسی الفاظ وتراکیب کی نشاندہی مراد ہے۔ ان اشعار میں فارسی لفظ 'گو' ہر چند یا اگرچہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے علاوہ ازیں سخنور، ہندوستاں، نژاد، فارسی الفاظ ہیں۔ لفظ 'ہم نبرد' (فارسی صفت) سے غالب کو عرفی اور انوری (دونوں فارسی کے بڑے شاعر گزرے ہیں) کے مدمقابل اور حریف ٹھہرایا ہے۔

آخری مصرع میں رہ (فارسی اسم مذکر) راہ کا مخفف بمعنی راستہ، اور لفظ 'نورد' فارسی مصدر نوردن کا اسم فاعل بمعنی سفر کرنے والا (چلنے والا) کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

اقبال اردو کے عظیم شاعر ہیں۔ اردو شاعری میں انھوں نے مناسبتِ لفظی کے اعتبار سے عربی اور فارسی کے بے شمار الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اقبال اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ ان کے یہاں مناسبتِ الفاظ تسلسل کا کام کرتی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے کہیں عربی اور کہیں فارسی کے الفاظ کا انتخاب کر کے آنے والے الفاظ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس مشاہدے کی ایک اچھی مثال ان کی نظم 'ذوق وشوق' ہے جس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب
کوہ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا، برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

پہلے شعر میں فارسی کے الفاظ، سرخ، کبود، شب، کوہ اور رنگ برنگ استعمال ہوئے ہیں۔ سحاب (بادل یا ابر گھٹا)، اضم اور طیلساں (رنگین ریشمی نرم رومال جو عربی لوگ کاندھے پر ڈالتے ہیں اور بہ معنی لسان، بولنے میں ماہر) عربی الفاظ ہیں۔ اقبال نے ان الفاظ کی رعایت سے کوہ اضم اور گردونواح کی فضا کو اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ یہ پوری فضا آگے کے ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ دوسرے شعر میں گرد، برگ، ریگ (ریت، سراب) اور پرنیاں (پھولدار ریشمی کپڑا) فارسی الفاظ آئے ہیں۔ یہ اپنے پہلے شعر سے وابستہ ہوکر مناظر فطرت اور پورے ماحول کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کے یہاں عربی کے ساتھ فارسی الفاظ مل کر لفظی دروبست اور رعایت کا ایک نظام بن جاتا ہے جو ان کی نظموں کو شاعری کے اعلی معیار پر پہنچا دیتے ہیں۔

بعینہ اقبال سہیل نے نعتیہ قصیدے میں بڑی فنکاری کے ساتھ اپنے فضل وکمال کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری میں عربی کے ساتھ فارسی الفاظ کو جس فنی بصیرت کے ساتھ داخل کیا ہے ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

تراشا جس کے ناخن کا ہلالِ آسماں منزل
غسالہ جس کے تلووں کا زلالِ آبِ حیوانی
نہیں مہر درخشاں اس کے فیضِ جبہ سائی سے
چمک اٹھا ہے چرخِ چہارمیں کا داغ پیشانی

اس میں الفاظ تراشا، آسمان، آب، مہر، درخشاں، چرخ، چہار، داغ اور پیشانی فارسی سے مستعار ہیں۔ اقبال سہیل نے اپنے ان نعتیہ اشعار میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان

شمالی ہند میں اردو کا عبقری اور نابغۂ روزگار قصیدہ نگار مرزا محمد رفیع سودا پہلے صرف فارسی میں شعر کہتا تھا، جب اہل زبان فارسی کے بجائے ریختہ گو شعرا کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرنے لگے تو سودا بھی اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوگئے۔

الفاظ کو برتا ہے اپنے موضوع اور الفاظ کی مناسبت سے یہ اشعار نہ صرف معیاری ہوگئے ہیں بلکہ پوری نعتیہ شاعری میں ایسی مثال مشکل سے ملے گی۔

'اردو شاعری میں فارسی الفاظ وتراکیب کا تصرف' کے ضمن میں دور اول سے بیسویں صدی تک صرف چند شعرا کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ گو اردو کے بیشتر شعرا کے یہاں بھی اس نوع کی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے فارسی الفاظ وتراکیب اور پیرایۂ اظہار کی عمدہ جستجو سے اپنی شاعری کو فارسی کے سانچے میں ڈھال کر خوب سے خوب تر کی سعی کی ہے۔ روز اول سے اردو زبان میں تصرف کا عمل جاری رہا ہے اور جوں جوں یہ زبان ترقی کے مدارج طے کرتی گئی اس میں مزید اضافے ہوتے گئے۔ کھڑی بولی کی بنیاد پر دیگر زبانوں کے اشتراک سے جب اردو کا ہیولی تیار ہوا تو بڑی تعداد میں فارسی الفاظ بھی شامل ہوئے۔ تصرف ایک غیر شعوری فطری عمل ہے اور دنیا کی ہر وہ زبان، جس میں دیگر زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں، تصرف کرتی رہتی ہے اردو میں یہ عمل فزوں ہے۔ لہذا اردو نے، بیان، بدیع، عروض، شاعری کی صنفیں، شاعرانہ تخیل، شاعرانہ بیان، اصطلاحیں، تشبیہیں، استعارے، تجنیسیں اور بعض صرفی ونحوی صورتیں فارسی سے مستعار لے کر اپنی شاعری کے دروبام میں غیر معمولی آرائش وزیبائش کی ہے۔

■

Dr. Mohammad Zubair
Dept of Persian, Arabic & Urdu
M.S. University of Baroda
Bhasha Sahitya Bhavan
Vadodara-390002 (Gujarat)
Mob: 9265554078
Email: m.zubair.mau@gmail.com

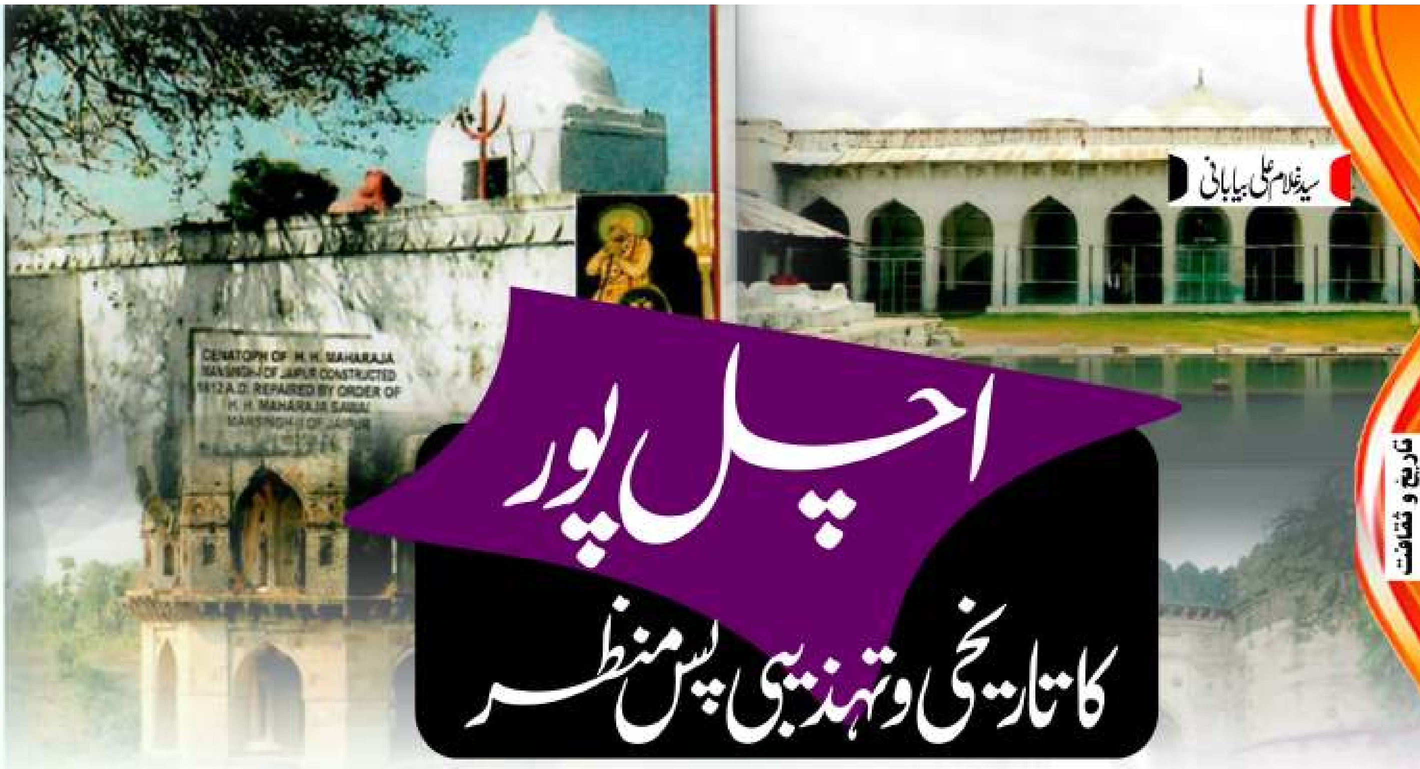

اچل پور
کا تاریخی و تہذیبی پس منظر

سید غلام علی بیابانی

آج اچل پور آزاد بھارت میں صوبہ مہاراشٹر کے ضلع امراوتی کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے لیکن اس کا ماضی گوناگوں تاریخی، ثقافتی اور شہرۂ آفاق تہذیبی کارناموں سے لبریز ہے۔ اسی لیے تاریخ ہند میں اسے خصوصی مقام حاصل ہے۔ یہ ایک نہایت قدیم شہر ہے جس کا ذکر ہند و مذہب کی رزمیہ داستانوں، پورانک گاتھاؤں میں بھی شامل ہے۔

آج اس کا نام اچل پور ہے لیکن مختلف زمانوں میں اس کے نام مختلف رہے ہیں۔ پورانک گاتھاؤں کی رو سے اس کا سب سے پہلا نام 'ارلکاوتی' اور 'ارلک پور' سامنے آتا ہے۔ عہدِ وسطیٰ میں اسے اڑچ پور، ایرچ پور، اور ایلچ پور بھی کہا گیا۔ چوتھی صدی عیسوی میں جین مذہب کی ایک مقدس کتاب 'نروان بھگتی' میں درج ایک سنسکرت شعر میں اس علاقے کے شمال میں واقع مکتا گری، پہاڑی کے محل وقوع کا ذکر کرتے ہوئے اس مقام کو 'اچل پور' کہا گیا ہے۔

برار کے معروف مراٹھی مورخ یادو مادھو کاڑھے نے اپنی مشہور تالیف وراڑ ھاچا اتہاس (1923) میں اس سنسکرت شعر کا مطلب مراٹھی زبان میں تحریر کیا ہے۔

اچل پور کے شمال مشرق میں مدھی گری (مکتا گری) پہاڑی واقع ہے جس پر تین کروڑ زائرین نے نجات حاصل کی۔ انھیں بھی سلام، لہٰذا آزادی ہند کے بعد اس کا نام اچل پور کردیا گیا۔

اچل پور کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لینے پر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ علاقہ دور قدیم سے آج تک بے شمار راجاؤں، حکمرانوں، بادشاہوں، ناظمان سلطنت اور نوابان حکومت کے زیر فرمان رہا ہے جنھوں نے یہاں بڑے دبدبے اور شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی ہے۔ ان سب کا نہایت مختصر تاریخ وار تذکرہ پیش خدمت ہے:

دور قدیم

خاندان ستواہن: 223 قبل مسیح
خاندان شترپ: دوسری اور تیسری صدی عیسوی
خاندان واکاٹک: چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی
خاندان کلبھی: چھٹی صدی عیسوی نصف اوّل
خاندان چالوکیہ: 567ء تا 753 عیسوی
خاندان راشٹرکوٹ: 753 تا 1187 عیسوی
خاندان چالوکیہ: دوبارہ برسراقتدار
خاندان یادو: 1178 تا 1271 عیسوی

وسطی دور — مسلم حکمران

خاندان خلجی: 1294 تا 1320 عیسوی
خاندان تغلق: 1320 تا 1413 عیسوی
خاندان بہمنی: 1413 تا 1490 عیسوی
خاندانِ عمادشاہی: 1490 تا 1575 عیسوی
(فتح اللہ عمادالملک عماد شاہ والی برار، علاؤالدین عمادشاہ، دریا عمادشاہ، برہان عمادشاہ)
خاندان نظام شاہی 15755 تا 1596 عیسوی
خاندانِ مغلیہ: 1596 تا 1724 عیسوی
حکومتِ آصف جاہیہ حیدرآباد دکن: 1724 تا 1853 عیسوی
نواب اسماعیل خان پنی ناظم برار: 1178ھ تا 1189ھ بمطابق 1764 تا 1775 عیسوی
برہان الدولہ سید عاقل خان بہرام جنگ، احتشام: 1189ھ تا 1198ھ بمطابق 1775 تا 1783 عیسوی
نواب محمد صلابت خاں پنی آخری ناظم برار: 1198ھ تا 1205 بمطابق 1783 تا 1790 عیسوی

آخری ناظم برار نواب محمد صلابت خاں کے بعد ان کے اہل خاندان کے جن افراد کو جاگیریں عطا کی گئیں ان کے اسمائے گرامی:

(1) نواب محمد نامدار خاں پنی: 1240ھ تا 1261ھ بمطابق 1824 تا 1845
(2) نواب ابراہیم: 1251ھ تا 1266ھ بمطابق 1845 تا 1850
(3) نواب غلام حسن خاں (داماد ابراہیم خاں): 1266ھ تا 1269ھ بمطابق 1850 تا 1853 عیسوی

(اچل پور تاریخ وثقافت از خواجہ ربانی ص 33 تا 35)

1853 سے 1947 تک یہ علاقہ حکومتِ برطانیہ، انگریزی حکومت کے زیر نگرانی رہا اور 15 اگست 1947 کے بعد سے آزاد بھارت کا حصہ بنا۔

اچل پور کو تقریباً 500 برسوں تک صوبۂ برار کی راجدھانی، دارالحکومت رہنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ یہ ایک زمانے تک دکنی سلطنتوں کے زیر اثر رہا ہے۔ لہٰذا قدیم دکنی زبان و ادب اور تہذیب و تمدن کی جڑیں اس علاقے میں بڑی گہرائی تک پیوست رہی ہیں۔ یہ علاقہ حیدرآباد دکن اور دہلی کے تقریباً وسط میں واقع ہونے کے سبب ماضی میں اہم ترین گزرگاہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے۔ اسی راستے سے بے شمار بادشاہوں، سلاطین وقت، وزرا، صوفیا، علما، فضلا، شعرا، ادبا اور فوجیوں کی آمد و رفت، شمالاً جنوباً اور جنوباً شمالاً ہمہ وقت جاری رہتی تھی۔ اسی لیے یہ سرزمین ہر دور میں گہوارۂ علم وفن اور ماہرین علم و

ادب کی آماجگاہ بنی رہی ہے۔ عہد حاضر میں اس کی ادبی، تہذیبی اور ثقافتی زرخیزی کا ثبوت موجودہ دور کے وہ فنکار بھی فراہم کررہے ہیں جو آج اپنی تابناکی سے زمانے بھر کی آنکھوں کو خیرہ کیے ہوئے ہے۔

چونکہ پورانک گاتھاؤں، رزمیہ داستانوں کے دور سے آج تک ہزار ہا سال پرانی تہذیب وثقافت اور تاریخ یہاں اپنے وجود میں رچی بسی ہوئی ہے۔ قدیم دور کے بے شمار راجاؤں کے علاوہ وسطی دور میں خلجی، تغلق، بہمنی، عمادشاہی، نظام شاہی، مغلیہ خاندان، آصف جاہی خاندان اور نوابان اچل پور نے سیکڑوں برسوں تک یہاں شاندار حکومت کی ہے۔ لہٰذا ان کے دور کی کئی تاریخی یادگاریں آج بھی یہاں قائم ہیں۔ جو اپنے دیرینہ جاہ وجلال اور عظمتِ رفتہ کا ثبوت زبان حال سے ظاہر کررہی ہیں۔ صرف چند اہم ترین تاریخی اور تہذیبی یادگاروں کا مختصراً احوال پیش خدمت ہے۔

(1) درگاہ شاہ عبدالرحمن غازی:

شاہ عبدالرحمٰن غازی کی عالی شان درگاہ اچل پور شہر کے شمال میں بچھن ندی کے کنارے واقع ہے۔ علاقہ برار کے معروف مورخ خطیب امجد حسین صاحب مرحوم نے اپنی ایک معرکتہ آلارا اردو، فارسی زبان میں تحریر کردہ مشہور تالیف تاریخ امجدی میں غزنی سے شاہ عبدالرحمٰن غازی کی اچل پور آمد اور راجہ ایل سے معرکہ جہاد کی مکمل تفصیل بیان کی جس کے مطابق شاہ عبدالرحمٰن غازی اور ان کے رفقا کی شہادت کا سنہ 392 ھ بمطابق 1002 بیان کیا جاتا ہے۔ معرکۂ جہادِ رحمانی کے تقریباً تین سو سال بعد اس علاقہ دکن میں ایک نہایت طاقتور سلطنت عروج پذیر ہوئی جس کا والی راجہ رام دیو، اور اس کی راجدھانی دیوگیری تھی۔ راجہ رام دیو کی حکومت دیوگیری کی دولت مندی اور خوش حالی کی خبریں شمالی ہند تک گردش کرنے لگیں۔ اسی سے متاثر ہوکر 694ھ بمطابق 1294 میں ملک علاؤ الدین خلجی حاکم کڑہ مانک پور، دکن کی اس دولت مند ریاست کو زیر فرمان کرنے کے ارادے کو خفیہ رکھتے ہوئے دیوگیری کے راستے میں واقع علاقہ برار کے شہر ایلچ پور (اچل پور) آٹھ ہزار سواروں کے ساتھ چند روز قیام پذیر ہونے کے بعد راتوں رات کوچ کرکے دیوگیری پر اچانک حملہ آور ہوا۔ راجہ رام دیو کو شکست فاش ہوئی اور علاؤ الدین نے حسب منشا مال و دولت حاصل کیا نیز صلح نامے کی رو سے علاقۂ اچل پور کو قبضے میں لے کر یہاں اپنا ناظم مقرر کردیا اور دو روز قیام پذیر ہونے کے بعد واپس لوٹ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ علاؤ الدین خلجی نے اچل پور قیام کے دوران سیکڑوں برس قبل ظہور پذیر معرکۂ جہادِ رحمانی کے شہدائے موصوف کی بے نام ونشان ہوتی قبروں کو نشان دہی کے بعد از سر نو تعمیر کروایا۔ اس کے بعد شاہان بہمنیہ کے زمانے میں ناظمِ برار صفدر خان سیستانی نے شاہ عبدالرحمٰن غازی کا موجودہ مقبرہ اور عالیشان گنبد 772 ھ بمطابق 1370 میں تعمیر کروایا اور درگاہ مسجد کی مشرقی جانب کے گنبد میں خود مدفون ہے۔ اس کے بعد مختلف ادوار میں کئی راجاؤں، بادشاہوں، فرماں رواؤں اور ناظمان برار نے یہاں کئی عمارتیں بنوائیں۔ ناگپور کے راجہ مودھاجی بھونسلہ نے بھی اس کے پانچ بڑے بڑے عالی شان دروازے اور بارہ دریاں بنوائیں۔ احاطہ کا کام راجہ رگھوجی بھونسلہ کے دور میں تکمیل کو پہنچا۔ برار کے بادشاہوں اور نوابوں نے بھی درگاہ کی تعمیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ہر سال ماہ ربیع الاوّل میں شاہ عبدالرحمٰن غزنی کا عرس بڑی دھوم دھام اور نہایت تزک واحتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے جس میں ہندو مسلم تمام قوموں کے افراد کثیر تعداد میں عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں یہ عرس ہندو مسلم اتحاد کا بے نظیر مظاہرہ اور سرودھرم سمبھاؤ کا بے مثال نمونہ پیش کرتا ہے۔

(2) عیدگاہ

اچل پور کی وسیع وعریض، خوب صورت اور تاریخی عیدگاہ، سلطان پورہ کے قریب قائم ہے جسے بادشاہ محمد تغلق کے داماد عماد الملک کے مشیر سرتیز کمان نے 748ھ بمطابق 1347 میں تعمیر کروائی۔ بعد میں محمد عزیز الدین کی مدد سے اس کی مرمت فرمائی۔ یہاں شہر اور قرب و جوار کے مسلمان کثیر تعداد میں عیدِ رمضان اور بقرعید کی نماز ادا کرتے ہیں۔

(3) جامع مسجد

اچل پور کے محلہ قلعہ میں ایک نہایت شاندار وسیع و عریض، اور خوبصورت مسجد ہے جسے بادشاہ محمد تغلق کے داماد عماد الملک کے مشیر سرتیز کمان نے 748ھ بمطابق 1347 میں تعمیر کروایا۔ بعد ازاں حاکم برار علی مردان خان نے 1108ھ مطابق 41 جلوسِ عالم گیری 1696 میں اس کی مرمت کروائی اور حوض کھدوایا۔ 1296ھ بمطابق 1853 میں نواب حسن خاں نے اس کے ایک گنبد کی مرمت کروائی جو مسجد کے پاس موجود 'بھڑکل' کا بارود خانہ پھٹنے پر گر چکا تھا۔ یہاں شہر کے مسلمان کثیر تعداد میں نماز ادا کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ اچل پور میں کئی تاریخی مساجد موجود ہیں جنھیں مختلف حکمرانوں نے اپنے اپنے دور میں تعمیر کروایا جن میں مسجد دارالشفا (863ھ بمطابق 1459)، مسجد نظامت (1051ھ بمطابق 1641)، چاولمنڈی کی مسجد (1070ھ بمطابق 1659)، چوک کی مسجد (1120ھ بمطابق 1709)، درگاہ کی مسجد (1130ھ بمطابق 1718)، بدھوارہ کی مسجد 1134ھ بمطابق 1721)، منظور پورہ کی مسجد (1130ھ بمطابق 1718)، فضلو میاں کی مسجد (1178ھ بمطابق 1764)، تھڑی کی مسجد (1186ھ

بمطابق 1772)، بیابانی کی مسجد (تعمیر کردہ نواب محمد صلابت خاں بہادر)، اشرف پورے کی مسجد (1255ھ بمطابق 1839)، پیر چندہ قاصد پور کی مسجد (مرمت: 1260ھ بمطابق 1824)، مسجد تیر گراں، مسجدِ شاہ بایزید اور مسجد چار مینار بیگم پورے کی مسجد، جوہری پورے کی مسجد وغیرہ وغیرہ۔ بادشاہوں، حکمرانوں اور نوابوں کے دور کے بعد کی عوامی طور پر تعمیر کردہ بھی شہر میں بے شمار مساجد قائم اور آباد ہیں۔

(IV). اَشٹما سِدّی

یہ مقام اچل پور کے مشرق میں چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اچل پور کے جن آٹھ مقامات پر مہانو بھو پنتھ کے بانی شری چکردھر مہاراج نے تپسیا کی تھی 'اشٹما سدی' ان میں سے ایک اہم استھان ہے۔ یہاں ایک قدیمی کنواں ہے۔ مشہور ہے کہ اس کنوئیں کے پانی سے اشنان کرنے (نہانے) پر بہت ساری بیماریاں دور ہوجاتی ہیں۔ شردھالو)(عقیدت مند افراد)، دور دراز سے یہاں آکر اپنے دکھ دور کرتے ہیں۔

(v) حوض کٹورہ:

اچل پور سے چند کلومیٹر کی دوری پر شمال مغربی سمت میں حوض کٹورہ نامی پرفضا مقام واقع ہے۔ یہاں احمد شاہ بہمنی کے زمانے میں (829ھ بمطابق 1426) ایک کنواں کھدوایا گیا تھا جس کی تہہ سے پانی خود بخود اچھل اچھل کر سطح زمین پر آتا تھا اور ایک پختہ نالی کے ذریعے ایک تالاب میں داخل ہوتا تھا جو اچل پور کے نوباغ ریلوے اسٹیشن کے قریب واقع ہے۔ اسی تالاب میں 'گاول گڑھ' کے دیوتالاب سے نہر کے ذریعے پانی پہنچتا تھا۔ علاقہ نوباغ میں اسی سے کاشت بھی کی جاتی تھی۔ عماد شاہی وزیر تفال خاں کے محل میں بھی اسی نہر سے پانی پہنچتا تھا۔ اس تالاب کے وسط میں ایک پختہ آٹھ پہلو چار منزلہ خوبصورت مینار بنا ہوا ہے جسے حوض کٹورہ کہا جاتا ہے۔ مینار کے کھلے ہوئے منزلے، کھلے ہوئے کشادہ کمرے اور خوبصورت طاق و رواق (چھجے سائبان اور کمرے) آج تک موجود ہیں لیکن تالاب سوکھ چکا ہے۔

(vi) مہاراجہ مان سنگھ کی سمادھی اور ان کی دو 'ستی' رانیوں کی گمٹیاں

مغلیہ دور میں ابوالمظفر نورالدین محمد جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے بعد راجہ مان سنگھ کو 1027 ہجری میں علاقہ برار (ایلچپور) کا حاکم مقرر کیا تھا۔ راجہ موصوف کی وفات ایلچپور (موجودہ اچل پور) میں ہوئی تھی لہٰذا آخری رسومات میں ان کے ساتھ ان کی دو رانیاں بھی یہیں ستی ہوئی تھیں۔ چھتری والے مزرعے میں راجہ کی چھتری اور رانیوں کی دو گمٹیاں جے سنگھ پورہ اچل پور میں اب تک باقی ہیں۔ (تاریخ امجدی اردو، مصنفہ خطیب سید امجد حسین مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر خطیب سید ابرار حسین قادری ونقشبندی صف 308)

مہاراجہ مان سنگھ کی سمادھی پر کندہ لوح سنگ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجہ مان سنگھ (جے پور) کا مقبرہ (سمادھی) 1612 میں تعمیر ہوا اور اس کی درستی H.H مہاراجہ سوائی مان سنگھ دوم (جے پور) کے حکم سے 1935 میں کروائی گئی۔

Cenatoph of H.H Maharaja Mansingh of Jaipur Constructed 1612 A.D. Reparied by Order of H.: Maharaja Sawai Mansingh II of Jaipur in 1935 AD

(vii): فصیل شہر (حصارِ بلدہ):

علاقۂ برار کے معروف ناظم برار نواب اسماعیل خاں بہادر پنی نے اپنے زمانہ نظامت میں (1180ھ تا 1187ھ بمطابق 1766 تا 1773 کے درمیان) شہر کے اردگرد ایک مضبوط حصار بلدہ (فصیل) تعمیر کروائی۔ اس میں چار بڑے دروازے اور دو دریچے (کھڑکیاں) ہیں۔ فصیل کے دروازوں پر قطعاتِ تاریخ اور تعمیر کی تاریخیں کندہ ہیں۔

VIII۔ بے بہا باغ:

اچل پور میں محلہ سرمست پورہ میں پرانی پولس چوکی کے پاس بے بہا باغ بہت مشہور مقام ہے۔ باغ میں داخل ہونے کے لیے ایک بلند رفیع الشان دروازہ ہے۔ جہاں پانچ وقت نوبت بجتی تھی اور صبح شام غریبوں کو لنگر تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہاں حکمرانوں نوابوں کی قبریں اور عالی شان گنبد ہیں۔ قبروں اور دیواروں پر قطعاتِ تاریخ کندہ ہیں۔ اس باغ کو نواب نامدار خاں پنی بہادر نے 1256ھ بمطابق 1840 میں تعمیر کروایا تھا۔ بڑے دروازے سے مشرقی جانب ایک بہت چوڑی اور بلند و بالا دیوار تھی جس میں خوش نما بارہ دری بنی ہوئی تھی جس میں بیٹھ کر امرا، وزرا اور روسا باہر کا تماشہ دیکھتے تھے۔ اب یہ بارہ دری منہدم ہو چکی ہے اور باغ کا نشان بھی مٹ چکا ہے۔ اس کی جگہ قبرستان بڑھ رہا ہے اور دنیا کی بے ثباتی زبان حال سے عیاں ہے۔ بقول شاعر

جن کی نوبت کی صدا سے گونجتا تھا آسماں
دم بخود ہیں مقبروں میں، ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں

کتابیات:

(1) ضلع امراوتی گزیٹیر 1968
(2) تاریخ فرشتہ از محمد قاسم فرشتہ
(3) وراڑھاچا اتہاس (مراٹھی) از یادو مادھو کاڑے
(4) تاریخ امجدی از خطیب سید امجد حسین (اردو)
(5) چراغ برار از خطیب سید امجد حسین، مرتبہ: ڈاکٹر عبدالرحیم
(6) برار کی تمدنی و علمی تاریخ، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
(7) تذکرۂ رحمانی، محمد مہتاب خاں
(8) تذکرہ مشاہیر برار، ڈاکٹر سید عبدالرحیم
(9) اچل پور، تاریخ وثقافت، ڈاکٹر غلام السیدین ربانی
(10) تاریخ دکن، ہارون خاں شروانی
(11) جنگ نامہ غازی اچل پوری، مرتبہ: ڈاکٹر عبدالرحیم
(12) لیلا چرتر، مرتبہ: ڈاکٹر کولتے

Syed Ghulam Ali Biyabani C/o Ali Hospital
Achalpur City
Dist: Amravati - 444806 (MS)

جوزف کانراڈ

مہم جو سامراج شکن ناول نگار

احمد سہیل

میرا جوزف کانراڈ سے تعلق اور تعارف عجیب انداز سے ہوا۔ وہ اس طرح کہ غالبا 1965 میں کراچی کی بمبینو سینما میں ہدایت کار رچرڈ برک کی فلم 'لارڈ جم' دیکھی اور والد صاحب نے بتایا کہ یہ فلم ایک انگریزی ناول پر مبنی ہے۔ اس وقت کراچی میں اس فلم میں طوفان میں گھرے ہوئے بحری جہاز کے عرشے پر باجماعت نماز کا منظر بہت مشہور ہوا تھا جس میں پیٹر وٹول نے معرکے کی اداکاری کی تھی۔ کچھ دنوں بعد ہم اس فلم کو بھول گئے۔ ستر (70) کی دہائی میں جب ہماری دلچسپیاں ادبی نظریات کے مطالعوں میں بڑھیں تو ایک دن پڑھتے پڑھتے یہ معلوم ہوا کہ مشہور فلسطینی نژاد امریکی دانشور، ادیب اور نقاد ایڈورڈ سعید نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ 'جوزف کانراڈ اور فکشن کی سوانح عمری' پر لکھا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ جوزف کانراڈ کے جتنے بھی ناول میسر آئے پڑھ ڈالے۔ ایڈورڈ سعید کو کانراڈ کا سامراج شکن نظریہ پسند تھا۔

جوزف کانراڈ پولستانی نژاد انگلستانی ناول نگار اور کہانی کار ہیں۔ ان کو انیسویں صدی اور بیسویں صدی کا اہم فکشن نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ 3/دسمبر 1857 میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 3، اگست 1924 کو ہوا۔ ان کا نام رومانیت پسند پولش ناول نگار ہنرک سینکوچ، لیو ٹالسٹائی اور دوستفسکی کے بعد لیا جاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں بیسویں صدی کی فنکارانہ حسیت اور جمالیات تو ہے جو حقیقت پسند' جدیدیت' سے قریب ہے۔

جوزف کانراڈ برڈیچیو کے قصبے 'کریں' میں پیدا ہوئے۔ نجیب الطرفین زمیندار کنبے سے تعلق تھا۔ ان کے والد محب وطن شاعر تھے۔ انھوں نے 1861 میں روسی حکومت کے خلاف پولینڈ کی بغاوت میں عملی طور پر حصہ لیا۔ جب وہ چار سال کے تھے تو ان کی والدہ تپ دق میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہوئی۔ اور کچھ ہی دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ کانراڈ نے آٹھ برس کی عمر میں انگریزی پڑھنا شروع کیا اور کچھ ہی دنوں بعد والٹر اسکاٹ، ڈکنس اور تھیکرے کے ناولز انگریزی اور ان کے پولش تراجم کے ساتھ پڑھیں۔ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے ایک فرانسیسی جہاز راں کمپنی میں ملازمت کرلی۔ اسی دوران انھوں نے غرب الہند، انگلستان، آسٹریلیا، سنگاپور، فلسطین، افریقہ، جاوا اور سماترا کا بھی سفر کیا۔ کانراڈ نے مارچ 1978 میں بیس (20) سال کی عمر میں ایک ریوالور کی مدد سے اپنے آپ کو گولی مار کر خودکشی کی بھی کوشش کی تھی۔ 9/اگست 1886 میں کانراڈ نے برطانوی شہریت اختیار کی۔ 38 سال کی عمر میں۔۔'جئیی جارج' سے رشتہ ازدواج مین منسلک ہوئے۔ ان سے ان کے دو (2) بچے پیدا ہوئے۔ 1919 میں وہ کینٹربری کے قریب 'اوسالڈز' بشپ بورن میں رہائش پزیر ہوئے۔ 1924 میں ایک امریکی ناشر کی دعوت پر نیویارک گئے۔ مارچ 1924 میں کانراڈ گٹھیا کے مرض کا شکار ہوئے اور تیزی سے ان کی صحت گرنے لگی۔ انگلستان کی وزیراعظم نے ان کو 'سر' کے خطاب سے نوازنا چاہا جسے انھوں نے ٹھکرا دیا۔

مشہور فلسفی اور ماہر ریاضیات برانڈ رسل ان کی تحریروں سے بہت متاثر تھے اور رسل نے اپنے ایک صاحبزادے کا نام کانراڈ رکھنے کے لیے کانراڈ سے اجازت چاہی تھی۔

ممتاز ناول نگاروں میں جوزف کانراڈ (Joseph Conrad) اپنی نوعیت کے فکشن نگار ہیں۔ان کی طویل مختصر کہانی 'تاریکی کا قلب' (Heart of Darkness) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ابتدائی ناولوں میں 'ال میئرس فولی' (Almayer's Folly 1898) 'نیگر آف نارسی سس' (The Niger of Nareissus) اور 'لارڈ جم' (Lord Jim 1900) ہیں۔سیاسی ناولوں میں 'مغربی آنکھوں کے تلے' (Under The WesternEyes 1991)، 'خفیہ کار پرداز' (The Secret Agent) ہیں۔ اس کا شاہکار 'نسٹروم' (Nostrom 1904) ہے۔ کانراڈ کے بیشتر ناولوں کا پس منظر بحری زندگی ہے۔ جہاں انسان قدرت کی سفاکی سے براہِ راست متصادم ہوتا ہے۔اورمہم جوئی کے جذبے کی تشفی بھی ہوتی ہے۔اوراس کی آزمائش بھی۔ کانراڈ کو اس زندگی کا براہ راست تجربہ تھا۔ اس کے ناولوں کی تکنیک کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ان میں علت و معلول کی ترتیب وتسلسل ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے یہاں کہانی کا آغاز عمل یعنی (Action) کے درمیان سے ہوتا ہے اورآگے بڑھنے اور پیچھے لوٹ آنے اور پھر آگے بڑھنے کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ کیونکہ زندگی ایک خط مستقیم نہیں بلکہ پر پیچ راہوں سے عبارت ہے۔ اگست 1924 کوکانراڈ کا حرکت قلب بند ہونے کے سبب انتقال ہوا۔ وہ سینٹ تھامس رومن کیتھولک چرچ کنٹری کے قبرستان میں رزق خاک ہوئے۔

کانراڈ نے مغربی سامراج سے اپنی ناگواری کا اظہار کیا ہےاورانھوں نے مغربی ممالک سے باہر سامراجی عزائم کا داخلی نوعیت کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے جوان کی' مہم جوئی اور سیاحی تحریروں میں نمایاں ہے۔ انھیں انگریزی نثر کے بیانیہ کو استعمال کرتے ہوئے اخلاقی شعور سے پردہ اٹھایا اور کرداروں کی ڈرامائی اظہاریت کو نیارنگ دیا۔ان کے انتہا پسندانہ اور خطرناک قسم کے کرداروں کومشہور نقاد ایف آر لیوس نے بھی سراہا ہے اور اسے عظیم روایت کا حصہ قرار دیتے ہوئے جین آسٹن، جارج ایلیٹ اور ہنری جیمس کا تسلسل قرار دیا۔ کانراڈ کا فکشن اعصابی تناؤ،خودکلامیہ قنوطیت کے خمیر سے گوندھا ہوا ہے۔ جس میں رومانویت اور اخلاقی فیصلے پوشیدہ ہیں۔ لہٰذا ان کے رویوں میں اظہاریت کی مصوری اوربعض دفعہ نثری نظموں کا شائبہ ہوتا ہے جس کی مثال ان کی ناول 'لارڈ جم' میں۔'پٹنہ'.. 'کمرہ عدالت' میں اداسی اور یاسیت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ یہی ان کا 'تصور دنیا' ہے۔ 1975 میں ایک نائیجیرین نقاد 'چینوا اچپ بی' نے کانراڈ کو 'نسل پرست' ادیب کہا ہے۔ منور آکاش کانراڈ ادب کی شرط کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:'' آرٹ کی شرط ہے کہ وہ ہونے والے کام کی ہر سطر میں اپنا جواز پیش کرے اورفن کی تعریف ایسے کی جاسکتی ہے جو واحد ذہن کی نظر آنے والی کائنات میں اعلیٰ سطح کے جواز پیش کرنے کی کوشش کرے، سچ کی روشنی کو بروئے کار لاتے ہوئے گوناگوں اور ہر بنیادی سطح کو مدنظر رکھتے ہیں۔ یہ ایک کاوش ہے اس کی ہیئتوں، اس کے رنگوں، اس کی روشنی، اس کے سایوں کوتلاش کرنے کی، زندگی کے حقائق اورمعاملات کے پہلوؤں میں جس میں سے ہر عنصر بنیادی ہے، پائیدار ہےاورضروری ہے یہ ایک روشن اور متاثر کن خصوصیت ہے سچ اوراس کے وجود کی فنکار مفکر اور سائنسدان کی طرح سچائی کی تلاش کرتا ہے اوراسے اپنے لیے پرکشش بناتا ہے دنیا کے مفکروں نے جواپنے نظریات کے غوطے لگائے اور سائنسدانوں نے جو حقائق دریافت کیے۔ایک فنکاران کے ہر پہلو سے متاثر ہوتا ہے۔ کہیں موجود اور اجاگر ہونے والی ہمارے

ہونے کی یہ خصوصیات پرکشش انداز میں جینے کے خطرات اور ہمت پر بہترین انداز میں فٹ ہوتی ہیں وہ حاکمانہ انداز میں ہماری عمومی حس، ہماری ذہانت، ہماری امن کی خواہش اور ہماری بدامنی کی خواہش پر بات کرتے ہیں، ہمارے تعصبات پر کبھی نہیں، کبھی کبھی ہمارے خوف پر اور کبھی کبھار ہماری انا پر، لیکن ہمیشہ ہماری خوش فہمی پر۔ ان کے الفاظ تعظیم سے سنے جاتے ہیں ان کا نقطہ نظر بھاری معمولات ہیں جیسے ہمارے ذہن کی نشوونما، ہمارے جسموں کی مکمل دیکھ بھال، ہمارے اداروں کا اخلاق، ہمارے عظیم اور قیمتی اہداف کی تکمیل، دوسری صورت میں یہ فنکار کے ساتھ ہے۔ ایسی ہی چیستانی صورت حال کا سامنا کرتے ہوئے فنکار اپنے اندر اتر جاتا ہے اور اس تنہائی، دباؤ اور تناؤ کی کیفیت میں وہ حقدار ہوتا ہے یا خوش قسمت، وہ اپنے پرکشش ضوابط کو تلاش کرتا ہے۔ اس کی یہ تلاش ہماری کم گنجائش سے بنتی ہے۔ ہماری فطرت کا یہ حصہ، جو بقا کی جنگ جیسی حالت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لازمی طور پر یہ مزاحمتی اور مشکل خصوصیات آنکھ سے اوجھل رکھی جاتی ہیں۔ جیسے خطرے سے دو چار جسم زرہ بکتر رکھتا ہے یہ تلاش سست رو ہے، زیادہ گہری، کم منفرد، زیادہ فعال اور جلد فراموش کر دی جانے والی۔ مگر اس کے اثرات ہمیشہ رہیں گے۔ کامیاب نسلوں کی تبدیل ہوتی ہوئی ذہانت، برطرف خیالات، سوالیہ حقائق، ختم ہوتے نظریات، مگر فنکار کی ہمارے ہونے کی یہ تلاش ذہانت پر منحصر نہیں ہے یہ جو ہمارے اندر فطری صلاحیت ہے نہ کہ جو ہم نے حاصل کی ہے، جو زیادہ پائدار ہے اور مستقل۔ وہ ہماری خوشی اور حیرانی کی صلاحیت پر بات کرتا ہے اس اساطیری حس پر جس سے ہماری زندگی گھری ہے ہماری رحم دلی، دکھ اور خوبصورتی کی جس سے ہمارے ساتھیوں کے اندرونی احساسات سے تمام مخلوق کے ساتھ، ٹھیک ٹھیک لیکن نظر نہ آنے والی سالمیت کا احساسِ جرم جو بے شمار تنہا دلوں کو ایک ساتھ جوڑ کے رکھتا ہے۔ اس سالمیت سے جو خوابوں میں ہے، خوشی، غم میں، تنہا، دھوکے میں، امید میں، خوف میں، جو انسانوں کو آپس میں جوڑتی ہے، جو تمام انسانیت کو جوڑتی ہے، مرے ہوؤں کو زندوں سے اور زندوں کو پیدا ہونے والوں سے۔'' کانراڈ کی ناولز میں کئی جدید ادبی اور تنقیدی نظریات چھپے ہیں۔ ان کی مختصر کہانیاں بھی طویل ہوتی ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب 'اے پرسنل ریکارڈ' میں لکھا ہے:'' وہ لوگ جو میری تخلیقات کو پڑھتے ہیں، دنیا کے متعلق میرے عقائد کو جانتے ہیں، یہ مادی دنیا تھوڑے سے سیدھے سادے تصورات پر قائم ہے، یہ خیالات اتنے سادہ ہیں۔ کی پہاڑوں کی طرح قدیم معلوم ہوتے ہیں ان میں ایک تصور وفاداری کا ہے۔''... جدید فکشن نگاروں اینڈی مارلو، ولیم فاکنر اور گراہم گرین پر جوزف کانراڈ پر خاصا اثر ہے ان کا خیال ہے کہ فرد کو برائیاں آہستہ آہستہ اندر سے کھائے جارہی ہیں۔

■

Mr. Ahmed Sohail
225, Trail Hollow Lane
Palestine, TX 75801 (USA)
Cell: 9037290786

نایاب حسن

نزار قبانی

جدتِ افکار اور جرأتِ اظہار کا استعارہ!

معروف عربی شاعر نزار قبانی کا عملی دورانیہ بیسویں صدی کے نصف ثانی کو محیط ہے، ان کے اشعار، نقوش فکر اور ان کے رنگا رنگ تخیلات مسلسل ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہو رہے ہیں، نزار قبانی 30/ اپریل 1998 کو وفات پاگئے، مگر ان کا ادبی، شعری و تخلیقی کارنامہ اپنی قوت وانفرادیت کی بہ دولت ہنوز تازہ و شاداب ہے۔ نزار قبانی نے اپنے باہم متناقض افکار و شعریات کے ذریعے پوری زندگی ادبی وفکری سطح پر ایک قسم کا ہیجان برپا کیے رکھا، وہ بیسویں صدی کے نصف آخر کے عربی معاشرے کے تضادات کو ان کی حقیقی شکل وصورت میں بیان کرتے تھے، وہ واحد ایسے عربی شاعر تھے، جس نے ایک طویل زمانے سے قائم معاشرتی رسم و رواج کے خلاف پوری جرأت و ہمت سے ہلہ بولا، اس نے بھرپور آزادی اور باغیانہ تیور کے ساتھ جہاں ایک طرف فکری، عملی اور شعوری سطح پر اس وقت کے عالم عرب کو درپیش مسائل پر اظہار خیال کیا، وہیں معاشرتی منکرات اور حرام وحلال جیسے نازک موضوعات بھی اس کی ناوک افگنی سے محفوظ نہ رہے۔ قبانی نے 'صنفِ لطیف' کو نہ صرف اپنی شاعری کا مستقل موضوع بنایا؛ بلکہ اسے انسانوں کی دیگر اصناف کی بجائے کسی خوب صورت نمائشی چیز کے طور پر پیش کیا، اسے اپنے تخیلات کے پاؤڈر کریم اور رنگوں سے آراستہ کیا اور نہایت بے باکانہ انداز اور واضح اسلوب میں اس کے جسم کے نشیب وفراز، جمالیاتی اوصاف و خصوصیات کو بیان کرکے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرتا رہا۔ اس کی شاعرانہ مہارت اور فضل وکمال میں کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا، جب لوگ اس کی شاعری سنتے ہیں، تو ان کی سماعتیں جھومنے لگتیں اور دل مچلنے لگتے ہیں، اس کا شعری اسلوب ایسا ہے کہ قلب ووجدان پر چھا جاتا ہے۔ نزار کو جب لوگ 'شاعر المرأة' (شاعرِ نسواں) کہتے تھے، تو وہ مست ہوجاتے تھے اور اب بھی عام طور پر جب لوگوں کی زبان پر نزار کا نام آتا ہے یا کوئی ان کی شاعری پڑھتا یا سنتا ہے، تو بے ساختہ اس کا ذہن ان کے اس لقب کی طرف چلا جاتا ہے؛ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نزار اپنی قومی نظموں، ملی ترانوں، واضح تنقیدی تصورات اور اپنے مختلف مقالات میں ایک ایسے دانشور نظر آتے ہیں، جو نہ صرف عورتوں سے محبت کرتا ہے؛ بلکہ وہ اپنے وطن کی مٹی اور اس کی آب و ہوا سے بھی قلبی انس رکھتا ہے۔

نزار بن توفیق قبانی آقبیق کی پیدائش 21/ مارچ 1923 کو ایک مڈل کلاس شامی فیملی میں ہوئی، ان کے گھر والے دمشق کے 'مئذنة الشحم' نامی محلے میں رہتے تھے، وہیں ان کی ابتدائی پرورش ہوئی، ان کے والد حلوائی تھے اور اسی سے پورے گھر کا خرچ چلتا تھا، مشہور ہے کہ جدید شامی ڈرامے کے سرخیلوں میں سے ایک ابوخلیل قبانی ان کے چچا تھے؛ لیکن نزار نے اپنے ایک دوست کے دریافت کرنے پر بتایا تھا کہ ابوخلیل قبانی ان کی والدہ کے چچا تھے۔ نزار نے یونیورسٹی آف سیریا سے 1944ء میں لا کی ڈگری حاصل کی، مگر انھوں نے تازندگی کبھی قانون، وکالت یا جج کو اپنا پیشہ نہیں بنایا؛ بلکہ 1945 سے لے کر 1966 تک سیرین ڈپلومیسی سے وابستہ رہے اور اس دوران مصر، ترکی، لندن، اسپین اور چین وغیرہ میں شام کی سفارت کی۔ انھوں نے عنفوان شباب میں ہی شاعری شروع کردی تھی اور جب وہ طالب علم تھے، تبھی ان کا اپنے ایک استاذ خلیل مردم بک سے تعلق قائم ہوا، انھوں نے نزار کی بے پناہ حوصلہ افزائی کی حتی کہ ان کا پہلا دیوان 'قالت لي السمراء' اپنے ذاتی صرفے سے شائع کروایا، ان کی شاعری ابتدا ہی سے عام عربی شاعری کے مزاج ومنہاج سے الگ تھی؛ چنانچہ بہت جلد روایات سے انحراف اور ان کا باغیانہ تیور ادبی دنیا کے سامنے نمایاں ہوگیا، حتی کہ جب 1945 میں ان کا قصیدہ 'خبز و حشیش و قمر' (روٹی، حشیش اور چاند) منظر عام پر آیا، جس میں انھوں نے شامی معاشرے کے توہمات پر مبنی مذہبی رسوم، عوام کی کاہلی وکسل مندی اور بزرگوں کی قبروں، مزاروں سے استعانت کے رواج پر جم کر تنقید کی تھی، تو علما کی ایک جماعت کی طرف سے نزار کو شدید احتجاج کا سامنا کرنا پڑا، اس احتجاج کی گونج شامی پارلیمنٹ تک پہنچی اور اس قصیدے کی اشاعت پر پابندی لگادی گئی، حتی کہ ان کے قتل کا مطالبہ کیا گیا، اس طرح ان کی شاعری اور معاشرے سے ان کی بغاوت دونوں ساتھ ساتھ سفر کرتی رہیں۔ ملازمت سے سبک دوشی کے بعد نزار نے بیروت (لبنان) میں رہائش اختیار کرلی، اس دوران باقاعدگی سے شاعری کرتے رہے، ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا، جس کے تحت اپنے 35 دیوان شائع کیے، یہ ان کا پچاس سالہ تخلیقی سرمایہ تھا، مضامین ومقالات کے بھی کئی مجموعے شائع کیے، ان کی بہت سی غزلوں، نظموں اور قصیدوں کو عالم عرب کے معروف گلوکاروں نے گایا، جن میں ام کلثوم، نجاة الصغیرہ، عبدالحلیم حافظ، فائزہ احمد، فیروز، کاظم الساحر، ماجدہ الرومی اور اصالہ نصری وغیرہ قابل ذکر ہیں، نزار اکثر و بیشتر عراق کا سفر کرتے اور وہاں مشاعروں میں شرکت کے علاوہ ادبا و دانشوران سے ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں، ایک سفر کے دوران ان کی ملاقات بلقیس الراوی سے ہوئی، پھر دونوں کی ایک دوسرے سے شناسائی ہوئی، جو عشق میں بدل گئی، دونوں شادی کرنا چاہتے تھے، مگر بلقیس کے اہل خانہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے اور بالآخر دونوں جدا ہوگئے، نزار کی پہلی شادی چچازاد بہن زہرا آقبیق سے ہوئی، جس سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئے، پھر ان کی اہلیہ ایک مہلک مرض میں مبتلا ہوکر وفات پاگئی، بیٹا جو قاہرہ میں طب کی تعلیم حاصل کررہا تھا، عین نوجوانی میں وفات پاگیا، اس سے نزار کے ذہن و دماغ پر خاصا اثر پڑا اور انھوں نے اپنے بیٹے کا

ایک دردناک مرثیہ کہا۔ایک عرصے کے بعد نزار کی ملاقات پھر بلقیس سے ہوئی، دونوں نے 1969 میں شادی بھی کی، اس بیوی سے بھی دو بچے ہوئے، مگر 1981 میں بیروت کے عراقی سفارت خانے پر ہونے والی بمباری میں بلقیس بھی ماری گئی، وہ اس سفارت خانے میں ملازمہ تھی، اس حادثے نے نزار کو نفسیاتی و ذہنی طور پر توڑ کر رکھ دیا، بلقیس کی وفات پر انھوں نے جو مرثیہ کہا ہے، وہ بھی نہایت دردانگیز اور متاثر کن ہے، لفظ لفظ میں کرب وحزن کی کائنات سمودی ہے۔اس کے بعد وہ اطمینان وسکون کی تلاش اور دنیا کے ہنگاموں سے دور رہنے کی کوشش میں پیرس و جینوا کے چکر کاٹتے رہے، بالآخر لندن میں اقامت گزیں ہوئے اور زندگی کے آخری پندرہ سال وہیں گزارے۔

نزار کی زندگی کا مطالعہ کریں، تو پتا چلتا ہے کہ انھیں ذاتی زندگی میں یکے بعد دیگرے کئی غیر معمولی حادثات سے دوچار ہونا پڑا، نوعمری میں ہی والدہ کی وفات ہوگئی، ایک بہن دل کی بیماری کا شکار ہوکر جاں بار ہوگئی، دوسری بہن کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کردی گئی، جس کی وجہ سے اس نے خودکشی کرلی، نوجوان بیٹا مر گیا، پہلی بیوی رحلت کرگئی، دوسری بیوی ایک سانحے میں جاں بحق ہوگئی، یہ سب حادثے متعدد زمانی مرحلوں میں رونما ہوئے، جن کی وجہ سے وہ تاعمر ذہنی آسودگی سے تقریباً محروم رہے، شاید اسی وجہ سے انھوں نے رومانوی شاعری کے ذریعے وقتی اور غیر حقیقی طور پر ہی سہی، اپنی نفسیاتی و ذہنی آسودگی تلاش کرنے کی کوشش کی، دوسری طرف بیسویں صدی کے نصفِ آخر میں عالمِ عرب کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے بھی ان کے فکر وتخلیق پر خاصا اثر ڈالا؛ چنانچہ خاص طور پر نوے کی دہائی میں انھوں نے معاصر عربی سیاست کے خلاف لگاتار کئی گرما گرم نظمیں لکھیں، جنھوں نے ایک بڑے عربی سیاسی حلقے کو چکرا کر رکھ دیا، نزار قبانی کا فکری وشعوری پس منظر اپنے وطن اور مٹی سے جڑا ہوا تھا اور وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی رہے، اپنے وطن کی محبت کے اسیر رہے، یہی وجہ تھی کہ 67ء کی عرب-اسرائیل جنگ میں عربوں کی شرمناک شکست نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا، پھر بعد میں بعض حکمرانوں کا اعلانیہ اسرائیل کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا اور اس ناجائز حکومت سے پینگیں بڑھانا نزار کے دل میں چھید کر گیا؛ چنانچہ انھوں نے جہاں اسرائیل کو للکارتے ہوئے 'منشورات فدائية على جدران إسرائيل" جیسی ولولہ انگیز نظم لکھی، وہیں "المهرولون، المتنبي، العشق والبترول، متى يعلنون وفاة العرب؟" جیسی نظموں میں عربوں کے سیاسی افلاس اور قومی بے غیرتی پر تازیانے برساتے رہے۔

بے شبہ نزار اپنے شاعرانہ فضل وکمال اور تعبیرات کی جدت وانفرادیت کی وجہ سے ایک ممتاز شاعر ہیں، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے تاعمر محض شعری وادبی تحرک پر زور دیا، بعض ایسے الفاظ وتعبیرات کو گنگناتے رہے، جو انسانی احساسات کو برانگیخت کرتے اور نفسانی جذبات میں ہیجان برپا کرتے تھے، ایک ایسے عربی معاشرے میں، جو بے شعوری وفکری محدودیت کی انتہا پر تھا، انھیں لوگوں کے جذبات سے کھل کر کھیلنے کا موقع ملا، اُس وقت عالمِ عرب کے حالات ایسے دریدہ تھے کہ جنس و جسم وشہوات، حتی کہ نسوانی پیکر کے مختلف اعضا کی اعلانیہ تصویر کشی میں نزار کو مدد ملی اور نزار نے پوری عربی شاعری میں ایک ایسا انقلاب برپا کیا، جس سے ایک طرف بے شمار لوگوں کو جذباتی آسودگی حاصل ہوئی اور نوجوان نسل نے ان کے اشعار کو آویزۂ گوش بنالیا، تو دوسری طرف اس انقلاب کی آنچ بسا اوقات خود شاعر کے دامنِ حیات تک جا پہنچی، البتہ ان کی زندگی کے اخیر کے بیس سالوں میں چوں کہ عرب دنیا کے حالات یکسر بدل چکے تھے، پھر اُسی دوران ان کی دوسری بیوی کی رحلت کا سانحہ بھی پیش آگیا، جس کی وجہ سے ان کے شعری موضوعات، حتی کہ الفاظ وتعبیرات میں بھی نمایاں تبدیلی آگئی تھی اور مجموعی طور پر اخیر عمر میں انھوں نے جو اشعار کہے، جو قصائد لکھے، ان کا موضوعی ارتکاز زیادہ تر عالمِ عرب کے سیاسی نشیب و فراز، مسئلۂ فلسطین اور عرب قومیت کے تحفظ وغیرہ پر رہا۔

بہرکیف عربی ادب وشعر کا ذوق رکھنے والوں کے لیے نزار قبانی کی شاعری کو پڑھنا اور سننا ایک دلچسپ تجربہ ہے، ان کے دورِ اول کی شاعری میں جہاں رومان انگیز و سرور بخش خیالات کی فراوانی ہے، وہیں دورِ آخر کی شاعری میں عالمِ عرب کی سیاست پر بے باکانہ تبصرہ، آزادیِ فلسطین کی تڑپ اور قومی وملی معاملات میں عربوں کو متحد ہونے کی بے مثال دعوت ہے، اس کے علاوہ لفظوں کی کہکشاں اور تعبیرات کا جہان اتنا دل فریب ہے کہ دل دماغ ان کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔

نزار قبانی کے شاعرانہ امتیاز اور تخلیقی تفوق کو اہلِ ادب ونقد نے جی کھول کے سراہا ہے اور ان کی بعض فکری لغزشوں کی نشان دہی کے باوجود ان کی مرتبہ شناسی میں کسی بخل سے کام نہیں لیا ہے، عام طور پر قبانی کو عربی شاعری کا 'دبستان' کہا جاتا ہے، حسین بن حمزہ نے انھیں 'ریاستِ شعر وادب کا صدر نشیں' قرار دیا ہے، مصری ادیب احمد عبدالمعطی حجازی نے انھیں "ایک ایسا حقیقی شاعر قرار دیا، جس کی اپنی خاص زبان ہے اور جو اپنے شعری موضوع کے انتخاب میں بے باک وجری ہے" البتہ انھوں نے بعض دفعہ ان کی 'جرأتِ بے جا' پر تنقید بھی کی ہے، معروف عربی شاعر علی منصور نے کہا کہ "نزار عربی ادب کے اجتماعی حافظے کا حصہ بن چکے ہیں اور انھیں لوگوں میں ایسا خاص مقام ومرتبہ حاصل ہوگیا ہے کہ ان کو دورِ جدید کا عمر بن ربیعہ قرار دیا جاسکتا ہے"، فلسطینی شاعر عزالدین المناصرہ نے کہا کہ "ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عشق کے موضوع کو خارجی وصف نگاری سے نکال کر جدید عربی شاعری کا ایک مخصوص موضوع بنادیا"۔

نزار قبانی کی وفات کے بعد ان کی شخصیت اور ادبی وشعری خدمات پر متعدد تحقیقی مقالات اور کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں احمد الخوص اور ہناء برہان کی تالیف 'عروبة نزار قباني' قابلِ ذکر ہے، اس کتاب میں انھوں نے نزار قبانی کی شاعری میں وطن دوستی اور عالمِ عرب سے ان کی قلبی محبت کے عناصر کی نشان دہی کی ہے، اس کے علاوہ عبداللہ الجعفری کی 'نزارقباني: آخرسيوف الأمويين" جس میں ان کی شخصیت، حیات اور شعری امتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے، ڈاکٹر خالد حسین کی کتاب 'نزار قباني: قنديل أخضرعلى باب دمشق' جس میں شاعر کی شخصیت کے علاوہ ان کے دو اہم شعری موضوع 'دمشق' اور 'عورت' پر گفتگو کی گئی ہے، اسی طرح جامعہ طہران کی ایک طالبہ آزادہ کریوانی کا 'الوطنية والشعر السياسي لدى نزارقبان' کے عنوان سے لکھا گیا قیمتی تحقیقی مقالہ قابلِ ذکر ہیں، نزار قبانی کی شخصیت وشاعری کے مختلف پہلوؤں پر ان کے علاوہ بھی متعدد کتابیں، تحقیقی وتنقیدی مقالات لکھے گئے ہیں، ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ انگریزی ودیگر زبانوں میں بھی منتقل ہو چکا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ موجودہ ڈیجیٹل علمی وادبی دور سے 'نزاریات' کو ہم آہنگ کرنے کے لیے ان کے بیشتر شعری ونثری ذخائر اور ان کی حیات وسوانحات اور خدمات پر لکھی گئی منتخب تحریروں کو انٹرنیٹ کی مختلف ویب سائٹس (مثلاً: www. www.adab.com nizariat. com, nizarq.com,) پر اپلوڈ کردیا گیا ہے؛ تاکہ عربی ادب وشعر سے دلچسپی رکھنے والے دنیا بھر کے لوگ براہِ راست نزار قبانی کے نتائجِ فکر سے استفادہ کرسکیں، ساتھ ہی یوٹیوب وغیرہ پر ویڈیو، آڈیو کی شکل میں خود نزار قبانی اور دیگر گلوکاروں کی آواز میں بھی ان کا کلام سنا جاسکتا ہے۔

■

Nayab Hasan
A/22, Seema Apartment
Street No.: 7, Batla House
New Delhi - 110025

نعیمہ جعفری پاشا

شوکت پردیسی
ایک بھولا بسرا شاعر

فنونِ لطیفہ میں ادب اور شاعری کو سب سے اونچا درجہ حاصل ہے اور ادب یعنی Literature میں بھی شاعری کو فوقیت دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض شعرا نے تو شاعری کو پیغمبری کا درجہ دے دیا ہے۔ مرزا غالب نے اس پر یوں مہر لگائی ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ع ایں سعادت بازورِ بازو نیست۔ یعنی شاعر پیدا ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے۔ تخلیق کار پر ادب کی صورت میں جو کچھ وارد ہوتا ہے وہ محض ذہنی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ آمد ہوتی ہے جو شاعر کے ذہن کو ودیعت ہوتی ہے۔ اسی لیے اس میں تاثیر ہوتی ہے۔ ایک اچھا شعر وہ ہوتا ہے جو دل کے نازک ترین گوشوں کو چھو جاتا ہے اور لافانی ہو جاتا ہے۔ ایک اچھا اور قدرتی شاعر وہ ہے جس کے پاس بھلے ہی تعلیمی ڈگریوں کی لمبی قطار نہ ہو لیکن جو صاحب دل ہو اس کے دل سے نکلے ہوئے اشعار جب نوکِ قلم تک آئیں تو سامعین اور قارئین کے دل کو چھو جائیں۔ ایک ایسے ہی شاعر تھے شوکت پردیسی، جن کے اشعار میں دل میں اتر جانے کا وصف پایا جاتا تھا۔

شوکت پردیسی ایک پرگو شاعر تھے جن کا کلام ایک زمانے میں ہر اچھے اور مقتدر رسالے کی زینت بنتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اتنی کم عمر تھی کہ ابھی تعلیمی سلسلہ بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ میرے بڑے بھائی اور بہن پابندی سے دہلی سے شائع ہونے والے بچوں کے مشہور رسالے 'کھلونا' کا مطالعہ کرتے تھے اور مجھے شوکت پردیسی کی نظمیں پڑھ کر سناتے تھے۔ بچوں کی قوالی

حلوے کے لیے حلوے کی قسم ہم آس لگائے بیٹھے ہیں
جو بات زباں پر لا نہ سکے وہ دل میں چھپائے بیٹھے ہیں

تو ذہن پر نقش ہے۔ ایک مقامی کلچرل پروگرام میں اسٹیج پر بھی پیش کی گئی تھی۔ مجھ جیسے بہت سے بچوں کا بچپن شوکت پردیسی کے گیت اور نظمیں پڑھتے اور سنتے گزرا ہے۔ یہ تمام کلام ادب اطفال کا ایک بیش قیمت تحفہ ہے جو ان کے بچوں کی نظموں کے مجموعے 'تحفہ اطفال' میں شامل ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ شوکت پردیسی کا اصل میدان ادب اطفال ہی تھا لیکن ان کے مجموعہ کلام 'ساز نغمہ بار' اور 'مضراب سخن' کی ورق گردانی کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شوکت پردیسی کو ادب اطفال کے ساتھ مخصوص کر دینا زیادتی ہوگی۔ وہ بلاشبہ غزل اور نظم دونوں میدانوں کے شہسوار تھے۔ وہ ایک کہنہ مشق اور منجھے ہوئے شاعر تھے۔ وقت اور حالات نے ان کے ساتھ وفا نہیں کی۔ زندگی ان کے لیے ایک امتحانِ مسلسل بنی رہی لیکن انھوں نے نامساعد حالات میں بھی شاعری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

یہ میرا ذوقِ سخن ہے کہ غزل کہتا ہوں
میری حالت تو یہاں مرغِ گرفتاری ہے

شوکت پردیسی ایک باہمت انسان تھے جو ناگفتہ بہ حالات سے نبرد آزما رہے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ البتہ ان کی دل شکستگی اور شکست خوردگی ان کے کلام میں جابجا نمایاں ہے۔

مجھ کو جہاں میں کوئی دل آرا نہیں ملا
میں خود بھی اپنے غم کا شناسا نہیں ملا
اپنی طلب کے اپنی غرض کے ملے ہیں لوگ
میری طلب کو دیکھنے والا نہیں ملا
میرے عیوب پر رہی ہر شخص کی نظر
کوئی ہنر کو دیکھنے والا نہیں ملا
خنجر بکف تو لوگ ملے ہر جگہ مگر
مرہم بدست کوئی مسیحا نہیں ملا

لیکن زندگی کی تمام تر بے وفائیوں، ناکامیوں اور نامرادیوں کے باوجود یہ شوکت پردیسی کا ہی حوصلہ ہے۔

کیوں خاک رہ گذارِ وفا میں اڑائیں ہم
آؤ پھر ایک بار قیامت اٹھائیں ہم
عزمِ جواں کے ساتھ قدم کو بڑھائیں ہم
ناکامیِ سفر کو نہ خاطر میں لائیں ہم

شوکت پردیسی کی شاعری ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں وحدتِ تاثر پایا جاتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں تغزل بھی ہے اور نغمگی بھی۔ ان کی شاعری تصنع اور اغلاق سے پاک ہے۔ زبان و بیان میں سادگی کے ساتھ پرکاری بھی ہے، حزن والم کا سوز ہے لیکن ساتھ ہی امید اور حوصلے کی رمق بھی ہے۔ ان غزلوں میں صرف زمانے کا شکوہ ہی نہیں ہے بلکہ حسن و عشق کی سرمستیاں بھی ہیں لیکن ایک نئے انداز میں۔

کھلتی کلیوں کے تر و تازہ تبسم کی طرح
تیری خوشبو میرے پیغام تک آپہنچی ہے
اپنی نظروں سے کہو اٹھ کے سنبھالیں مجھ کو
تشنگی بادۂ بے جام تک آپہنچی ہے

———

رات کے آنچل پہ نوریں چاندنی ہنستی رہی
ہر طرف موج نشاطِ زندگی ہنستی رہی
حسن کے سینے کی دھڑکن عشق کو راس آگئی
گیسوئے عنبر فشاں کی برہمی ہنستی رہی

شوکت پردیسی نے غزل کے علاوہ اور بھی کئی اصناف سخن پر طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں کامیاب رہے۔ ان کے قطعات، رباعیات، نظمیں اور گیت سب ہی اپنے اندر ایک استادانہ شان رکھتے ہیں۔ رباعی کی صنف کو اردو ادب کی ایک مشکل صنف مانا گیا ہے کہ جسے فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ نبھانا مشکل ہوتا ہے لیکن شوکت صاحب کی رباعیات بھی خاصے کی چیز ہیں۔ ان میں فن کی پختگی بھی ہے اور لطف و سرور بھی۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو

وعدوں سے بھری آس تو لیتے جاؤ
یہ گرمی انفاس تو لیتے جاؤ
بخشی ہے جو اپنا ہی سمجھ کر مجھ کو
اس چوٹ کا احساس تو لیتے جاؤ

شوکت پردیسی ایک سچے شاعر تھے اور سچا شاعر وہی ہوتا ہے جو اپنی ذات اور کوائف سے اوپر اٹھ کر شاعری کے فن کارانہ تقاضوں کو پورا کرے، جس میں جمالیات کی حس بھی ہو، حسن کا احساس بھی ہو اور عشق کی سرمستیاں بھی اور یہ تمام خوبیاں ہمیں شوکت پردیسی کی نظموں میں نظر آتی ہیں۔ ان کی نظموں کے مجموعے 'مضراب سخن' میں شامل زیادہ تر نظموں کو ہم رومانی شاعری کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک رچی بسی رومانی فضا ہے۔ ان کی رومانی شاعری کا بعض نقادوں نے اختر شیرانی سے موازنہ کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ شوکت کی رومانیت اختر شیرانی سے مختلف ہے۔ ان کی نظموں میں صرف رومان ہی نہیں ہے بلکہ زمانے کا شکوہ بھی ہے اور کہیں کہیں تنہائی کا احساس بھی ہے۔ شوکت کی نظم 'بیزاری' کا ایک بند ملاحظہ ہو

بزم انجم سے بہت دور چلا جاؤں گا
نشہ عشق سے معمور چلا جاؤں گا
دل میں حسرت لیے مجبور چلا جاؤں گا
مجھ کو سمجھانے میرے پاس نہ آئے کوئی

دوسری طرف ان کی بعض نظمیں یادِ محبوب، وہ سپنے، حیراں ہوں اے صنم وغیرہ اپنے اندر بڑا رچا ہوا خوبصورت رومانیت کا احساس رکھتی ہیں۔ 'حیراں ہوں اے صنم' میں یوں رقم طراز ہیں۔

حیراں ہوں اے صنم کہ تجھے اور کیا کہوں
دلبر کہوں کہ دوست کہوں دلربا کہوں
جادو بھری نگاہ قیامت سے کم نہیں
زلفِ سیاہ سایہ راحت سے کم نہیں

تسکینِ دل کہوں کہ وفا آشنا
آنکھوں پہ تیری فتنہ کہوں دوراں نثار ہے
تیری ہنسی پہ موجِ بہاراں نثار ہے
نغمہ کہوں کہ ساز کہوں یا صدا کہوں
حیراں ہوں اے صنم کہ تجھے اور کیا کہوں

ان کی نظمیں نشاطِ آرزو، چاندنی رات، میرے محبوب وغیرہ رومانی شاعری کی خوبصورت مثالیں ہیں جو اردو شاعری کے رومانی خزانے میں ایک دلکش اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

شوکت پردیسی کے مجموعہ ہائے سخن 'تحفہ اطفال'، 'سازِ نغمہ باؤ' اور 'مضراب سخن' پر ایک سرسری نظر ہی اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ ایک بلند پایہ، حساس، زبردست قوتِ متخیلہ کے مالک، پرگو فطری شاعر تھے۔ زبان و بیان اور فن شعر پر ان کی پکڑ بہت مضبوط تھی۔ شاعری ان کا شوق بھی تھا اور ان کی فطرت بھی۔ انھوں نے ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر شعر کہے اور بہت خوب کہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شوکت پردیسی کی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں:

''شوکت پردیسی کی بڑی صفت ان کی قدرت کلام تھی۔ رباعی جیسے مشکل فن سے لے کر بچوں کی نظموں تک ہر صنف پر انھوں نے دسترس کے ثبوت پیش کیے ہیں۔''

یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ شوکت کو ان کا جائز مقام نہیں دیا گیا، ان پر ریسرچ نہیں ہوئی، مقالات نہیں لکھے گئے۔ انھیں انعامات سے نہیں نوازا گیا۔ شاید اسی لے کہ دنیوی کامیابیاں ان سے دور رہیں۔ آخر عمر انھوں نے گوشہ نشینی میں غم روزگار سے نبرد آزما ہو کر گزار دی۔ کسی کی تعریف میں شعر نہیں کہے، کسی کی خوشامد کو اپنا شعار نہیں بنایا، صاحبانِ اقتدار کے در پر جبہ سائی نہیں کی۔ ورنہ جونپور جیسے زرخیز علاقے سے تعلق رکھنے والے ایک قابل قدر اور باصلاحیت شاعر اس طرح گمنامی کی زندگی نہ بسر کرتے۔

محمد عرفان شوکت پردیسی کی پیدائش 1924 میں ملیشیا میں ہوئی جہاں ان کے والد شیخ صاحب علی معاش کے سلسلے میں لمبے عرصے سے مقیم تھے۔ یوں تو ان کا وطن جونپور تھا لیکن شوکت کا بچپن ملیشیا میں ایک خوش حال خانوادے میں گزرا۔ پانچویں درجے تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ بارہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ وطن عزیز آنا ہوا اور پھر کبھی واپسی نہیں ہوئی۔ اسی دوران دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی اور ملیشیا اور ہندوستان کے درمیان آمد و رفت منقطع ہوگئی۔ والد کی آمدنی کے ذرائع محدود ہوگئے اور اس طرح جو بچپن خوشحالی اور بے فکری میں پروان چڑھا، اچانک ہی ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہوگیا۔ شوکت کو پہلے ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں داخل کروایا گیا جبکہ گھر والے جونپور میں مقیم تھے۔ ہاسٹل میں رہ کر تعلیم کے اخراجات زیادہ تھے۔ چنانچہ واپس جونپور بلوا لیا گیا اور یہاں ایک مشن اسکول میں داخل کروا دیا گیا لیکن نامساعد حالات یہاں بھی ان کی تعلیم کے راستے میں آڑے آئے اور ان کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ مڈل پاس کرنے کے بعد صرف انیس سال کی عمر میں رشتہ ازدواج سے منسلک کر دیا گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد والدین اور بڑی بہن اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ شوکت کے لیے یہ صدمات ناقابل برداشت تھے۔ چھوٹی بہن، یتیم بھانجیاں اور اپنے بیوی بچے! ذمے داریاں بہت تھیں اور روزگار کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ہومیوپیتھی کے علاج کو ذریعہ معاش بنانا چاہا لیکن کامیابی نہیں ملی۔ مجبوراً اپنی خودداری سے سمجھوتہ کر کے سسرال جا کر رہنے لگے۔ خسر صاحب خوش حال تھے۔ شوکت کاشت کاری میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے لیکن زیادہ عرصے تک گھر دامادی انھیں راس نہیں آئی۔ 1950 میں بمبئی آگئے۔ یہاں مختلف شعبوں میں قسمت آزمائی کی۔ روزنامہ 'انقلاب' کے دفتر میں کام کیا 'منا' نامی بچوں کا ایک رسالہ بھی نکالا، فلموں کے لیے کچھ گیت بھی لکھے۔ لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ اختلاج قلب کے مرض میں گرفتار ہو کر واپس جونپور آگئے اور باقی زندگی بیماریوں سے لڑتے ہوئے نہایت تنگدستی کی حالت میں سسرال میں بسر کی۔ 14 ستمبر 1995 کو ایک لمبی جدوجہد بھری زندگی سے آزاد ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ قسمت اور حالات نے شوکت پردیسی کے ساتھ کبھی وفا نہیں کیا ورنہ کچھ بعید نہ تھا کہ اپنی زندگی میں ہی ان کا شمار اردو کے نامور شعرا میں ہونے لگتا یا فلمی دنیا کے ایک مقبول شاعر کے طور پر یاد کیے جاتے۔

ان کے تین شعری مجموعے اور ایک مضامین کا مجموعہ کچھ سال قبل ان کے صاحب زادوں نے شائع کروائے ہیں۔ بہت کچھ کلام تلف بھی ہوگیا۔ شوکت پردیسی بلاشبہ اردو کے ایک قابل قدر شاعر ہیں۔

■

Dr. Naima Jafri Pasha
House No: 17, Pocket 2, Jasola
New Delhi - 110025

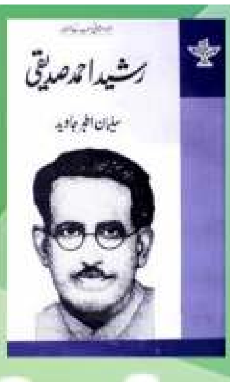

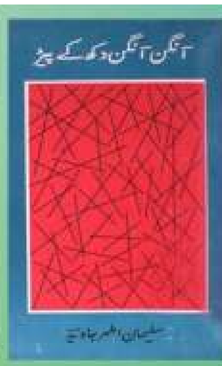

شیخ عمران

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید

اردو کے شہر حیدر آباد میں واقع جامعہ عثمانیہ سے فارغ ہونے والے نامور مشاہیر کی ایک طویل فہرست ہے۔ عصر حاضر میں اردو کے اساتذہ، شعرا اور ادیبوں و ماہرین تعلیم کی اس فہرست میں پروفیسر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر غلام عمران خاں، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر زینت ساجدہ، پروفیسر رفیعہ سلطانہ، پرفیسر افضل محمد، شاذ تمکنت، پروفیسر سیدہ جعفر وغیرہ ہیں اس طویل فہرست میں اردو تحقیق و تنقید کی ایک قد آور شخصیت 'پروفیسر سلیمان اطہر جاوید' بھی ہیں۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید چار پانچ پشتوں سے حیدر آبادی تھے، ان کے آبا و اجداد کا تعلق افغانستان سے تھا۔ آج سے دو سو سال قبل اُن کے پشتینی رشتے دار بلوچستان اور پنجاب میں تھے۔ وہاں سے نقل مقام کر کے حیدر آباد آگئے اور مستقل طور پر حیدر آباد ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے دادا کا نام محمد داؤد خان تھا۔ سلیمان اطہر جاوید کے والد کا نام محمد حسین خان تھا۔ محمد حسین خاں کی شادی حیدر آباد کے متوسط گھرانے کی لڑکی رحیم النساء بیگم سے ہوئی۔ یہی خاتون جو پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی والدہ تھیں۔ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن اچھے ناک نقشہ اور گورے رنگ کے سبب 'گوری ماں' کے نام سے مشہور تھیں۔ محمد حسین محکمہ بلدیہ میں ملازم تھے۔ وہیں سے وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے والد نے ایک دو جگہ ملازمتیں بھی کیں لیکن ایک مرتبہ حادثے میں ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں رہے۔ اسی بیماری میں ان کا دسمبر 1968 میں انتقال ہو گیا۔ تدفین درگاہ میاں میر نواب صاحب کے احاطے میں عمل میں آئی۔ سلیمان اطہر جاوید کی والدہ 'گوری ماں' عزم و استقلال والی خاتون تھیں۔ بچوں کی بہتر پرورش میں انھوں نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد بھی بچوں کی پرورش اسی تندہی سے کرتی رہیں اور بچوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ان کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے۔ طویل عمر پانے کے بعد 1992 میں ان کا انتقال ہوا۔ سلیمان اطہر جاوید کی پیدائش 9/ اپریل 1936 کو بروز جمعرات ہوئی۔ اتفاق سے اس دن عید الاضحیٰ تھی۔ آپ نے ایک شخصی انٹرویو میں کہا کہ والد صاحب کے پاس ان کی تاریخ پیدائش کا کوئی ریکارڈ نہیں لیکن مذکورہ بالا تاریخ ہی ان کی تاریخ پیدائش طے پائی اور ایس ایس سی سرٹیفکیٹ میں بھی یہی تاریخ درج ہے۔ اگست 2018 کی دوپہر آپ اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ آپ نے جو علمی و ادبی خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔

بچپن میں انھیں پڑھانے کے لیے ایک مولوی صاحب آیا کرتے تھے جو اردو اور عربی ناظرہ پڑھاتے اور تختی پر لکھنے کی مشق کراتے۔ والد صاحب نے انھیں فارسی کی ابتدائی تعلیم دی اور بعد میں انھیں گورنمنٹ ہائی اسکول مستعد پورہ میں داخل کرایا۔ 1949 میں اس اسکول سے انھوں نے پرائمری تعلیم کی تکمیل کی اور چادر گھاٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ تعلیم کے معاملے میں یہ کافی ذہین واقع ہوئے تھے۔ 1952 میں میٹرک کامیاب کیا اور چادر گھاٹ کالج میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔ اس وقت ڈاکٹر محی الدین قادری زور کالج کے پرنسپل تھے اور اساتذہ میں ڈاکٹر حمید الدین شاہد اور حامد صدیقی تھے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے 1955 میں انٹر کامیاب کیا۔ آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا۔ سلیمان اطہر جاوید نے 1959 میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور یہیں سے 1962 میں ایم۔ اے کی تکمیل کی۔ دوران تعلیم ان کے دوستوں میں پروفیسر افضل محمد، احمد جلیس اور شاذ تمکنت وغیرہ تھے۔

سلیمان اطہر جاوید نے ایم اے کے بعد بھی تعلیمی سفر کو جاری رکھا اور پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان 'رشید احمد صدیقی شخصیت اور فن' قرار پایا۔ پروفیسر مسعود خان صاحب چونکہ رشید احمد صدیقی کے شاگرد رہ چکے تھے اور ان سے خاصے روابط تھے اور رشید احمد صدیقی کی شخصیت بھی اس لائق تھی کہ ان پر تحقیقی کام کیا جا سکے۔ اس طرح پروفیسر مسعود خاں صاحب نگراں ہوئے اور انھوں نے اپنے شاگرد کے لیے دوران تحقیق پیش آنے والی دشواریوں اور رکاوٹوں کو دور کرنے اور رشید احمد صدیقی سے متعلق مواد کی حصولیابی میں بھی بھر پور مدد کی اور وقتاً فوقتاً ان کی رہنمائی کرتے رہے۔ سلیمان اطہر جاوید نے اس دوران تین چار مرتبہ دہلی، علی گڑھ اور لکھنؤ وغیرہ کے سفر بھی کیے۔ حیدر آباد آ کر وہ حاصل شدہ مواد کو ترتیب دیتے۔ اس طرح ان کا تحقیقی کام چلتا رہا بالآخر انھوں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کیا۔ جس پر

1968 میں عثمانیہ یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے مسلسل تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے دوران معاشی دشواریوں کے باوجود پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی 1965 میں جرنلزم میں ریفریشر کورس کیا اور لسانیات کے گرمائی اسکول منعقدہ میسور سے 1971 میں لسانیات کا سرٹیفکیٹ کورس اور 1976 میں شیلانگ میں منعقدہ یو۔ جی۔ سی گرمائی انسٹی ٹیوٹ سے اطلاقی لسانیات کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

21 ستمبر 1966 کو سری وینکٹیشورا یونیورسٹی میں ان کا تقرر بحیثیت اردو لکچرر عمل میں آیا اور ان کی مستقل ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ اس یونیورسٹی میں ترقی پاتے رہے۔ 1976 تک لکچرر رہنے کے بعد ریڈر بنائے گئے۔ اور اپریل 1976 تا مارچ 1985 ریڈر شعبہ اردو رہے۔ پھر انھیں پروفیسر کے عہدے پر ترقی دی گئی اور بعد میں صدر شعبہ اردو بنائے گئے اس طرح تقریباً 30 سال سری وینکٹیشورا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی خدمت کرنے کے بعد وہ 30 اپریل 1996 کو وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔

اپنے ایک شخصی انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ لوگ Retired ہو کر Tired ہو جاتے ہیں اور وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد تھک جاتے ہیں لیکن میں تھکا نہیں ہوں بس میری اصل تنخواہ کی جگہ مجھے وظیفہ مل رہا ہے اور تدریس کے لیے وہ طلبہ نہیں لیکن میں آج بھی اتنا ہی کام کرتا ہوں جتنا ملازمت کے دوران۔ چنانچہ وظیفہ پر سبکدوشی کے بعد بھی انھوں نے کام نہیں چھوڑا اور حیدر آباد سنٹرل یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت Visiting Professor نے تقریباً دو سال خدمات انجام دیں۔ وہ سنٹرل یونیورسٹی میں تھے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے انھیں اردو یونیورسٹی میں تعلیمی مشیر کے شعبہ کے منصب کی پیش کش کی۔ سلیمان اطہر جاوید یہاں آ گئے۔ 2001 اور 2002 میں انھوں نے گیسٹ فیکلٹی کی حیثیت سے عثمانیہ یونیورسٹی میں خدمات انجام دیں۔ وہ 2003 میں جامعہ اردو علی گڑھ کی مجلس منتظمہ کے تاحیات رکن مقرر ہوئے۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے 1951 میں جبکہ وہ چادرگھاٹ ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے ایک چھوٹی سی کہانی 'رہنمائے دکن' اخبار کے بچوں کے صفحہ کے لیے لکھی جو فوراً شائع ہوگئی۔ اس کہانی کی اشاعت سے انھیں لکھنے کا حوصلہ ملا اور اخبارات اور

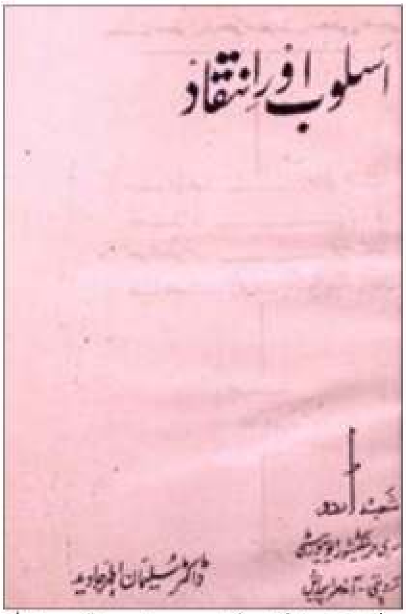

رسائل کے لیے لکھنے لگے۔ 1954 میں چادرگھاٹ کالج کے اردو مجلّہ 'فکرِ نو' کے شریک مدیر منتخب ہوئے۔ گھر کی مالی پریشانیوں کے سبب وہ دورانِ تعلیم ملازمت بھی کرتے اور 'رفتارِ سیاست' کالم بھی ترتیب دیتے تھے۔

1959 میں بی اے کامیاب کرنے کے بعد دفتر عطیات میں ماہانہ 106 روپے پر کلرک کی نوکری کی۔ مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہر جمعرات کی شام 'رہنمائے دکن' کو تازہ مضمون دے آتے جو دوشنبہ ایڈیشن میں شائع ہو جاتا۔ 'رہنمائے دکن' کے ایڈیٹر محمود وحید الدین کے ایما پر کلرک کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور اس اخبار سے وابستہ ہو گئے اور خصوصی ہفتہ وار صفحہ 'رفتار سیاست' ترتیب دینے لگے۔ یہ سلسلہ 15 جون 1960 سے شروع ہوا۔ وقت ضرورت وہ مقامی صفحہ گھر کی باتیں، اداریہ وغیرہ بھی لکھتے تھے۔ چھ سات سال تک سب ایڈیٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے کے دوران بھی انھوں نے 'رفتار سیاست' لکھنے کا سلسلہ ترک نہیں کیا۔ لوگ ان کی تحریروں سے متاثر تھے اور اکثر لوگ اس صفحہ کی خاطر دوشنبہ کا اخبار خریدا کرتے تھے۔ ادبی حلقوں میں بھی سلیمان اطہر جاوید کا چرچا ہونے لگا۔ 1966 میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید جب مستقل ملازمت پر سری وینکٹیشورا یونیورسٹی چلے گئے تب انھوں نے 'رہنمائے دکن' کی ملازمت ترک کردی لیکن وہ اخبار کے لیے ادبی موضوعات پر پابندی سے مضامین لکھتے رہے۔

سری وینکٹیشورا یونیورسٹی میں مستقل ملازم ہو جانے کے باوجود پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے صحافت سے اپنا ناطہ نہیں توڑا اور اپنی توجہ سیاسی و ادبی تحریروں سے ہٹا کر کالم نگاری پر مبذول کر لی۔ حیدر آباد کے ایک نوجوان صحافی محمود انصاری نے 1976 میں حیدر آباد سے ہی اردو روزنامہ 'منصف' جاری کیا۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے محمود انصاری سے دوستانہ روابط تھے۔ چنانچہ ان کے اصرار پر پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے 'رفتار ادب' کے نام سے ایک مطالعاتی کالم شروع کیا۔ یہ کالم منصف میں 10 اگست 1981 سے شروع ہوا۔ 24 اگست 1981 سے اس کالم کا نام 'میرا مطالعہ' ہو گیا جو 1997 تک جاری رہا۔ اس کالم میں پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے اپنے مخصوص انداز میں نئی کتابوں پر تبصرہ و تنقید کے ساتھ ادب کے مختلف موضوعات وغیرہ پر اظہار خیال کیا۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید جب 30 اپریل 1996 کو سری وینکٹیشورا یونیورسٹی سے صدر شعبہ اردو کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد وظیفہ حسن خدمات پر سبکدوش ہوئے تو ایک مرتبہ پھر انھوں نے اپنے وطن عزیز حیدر آباد کی طرف رخ کیا اور مکمل طور پر ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے اور انھوں نے اپنے پیشہ صحافت کی یادیں تازہ کر دیں اور ایک مرتبہ پھر کالم نگاری کی طرف توجہ کی۔ عابد علی خان مرحوم سے دیرینہ مراسم اور ان کے لائق فرزند و ایڈیٹر روزنامہ سیاست جناب زاہد علی خاں کی خواہش پر انھوں نے اخبار کے دوشنبہ ادبی سپلیمنٹ کے لیے ہفتہ وار کالم 'ادبی ڈائری' کے عنوان سے مارچ 2001 سے لکھنا شروع کیا۔ ادبی ڈائری کالم میں اکثر پروفیسر سلیمان اطہر جاوید حیدر آباد و کل ہند سطح پر یا ملک و بیرون ملک جہاں بھی وہ دورہ کرتے ہیں منعقد ہونے والی ادبی محفلوں، کتابوں کے رسم اجرا، سمیناروں، سمپوزیموں، جامعات میں منعقد ہونے والے لکچرس، مشاعروں کی روداد وغیرہ موضوعات پر معلومات پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات اردو کے ادبی مسائل پر بھی دلچسپ گفتگو ہوتی ہے۔ اردو ادب کے طالب علموں اور محققین کے لیے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کا یہ سلسلہ وار کالم ایک نعمت غیر مترقبہ سے کچھ کم نہیں۔ کیونکہ اس کالم کے ذریعہ اردو ادب کا تازہ منظر نامہ معلوم ہو جاتا ہے۔

بحیثیت محقق اور نقاد، انھوں نے دکنی ادب کو تو اپنا موضوع بنایا لیکن جدید ادب ان کی تنقید کے نشانہ پر رہا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے تنقید نگاری کے بارے میں کہا:

''جاوید صاحب کی تنقید میں ادعائیت نہیں ہے۔ ان کا ذہن جامد نہیں ہے وہ فارمولوں میں بند نہیں ہیں۔ ان کے ہاں جذباتی شدت یا غیر مہذب بے باکی نہیں ہے۔ ایک قسم کی سنجیدگی، کشادہ قلبی اور ہمہ جہتی

انداز ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مستقبل حال سے زیادہ روشن ہے۔''

حیات اللہ انصاری نے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کے تعلق سے کہا تھا:

''اس کا ذوق بھی بہت گہرا اور متوازن ہے وہ کانٹوں میں بھی پھول تلاش کرلیتا ہے اور یہ بھی دیکھ لیتا ہے کہ پھول کتنے کانٹوں میں گھرا ہے!''

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی پہلی تنقیدی کتاب 'اسلوب اور انتقاد' ہے۔ یہ کتاب جولائی 1969 کو حیدر آباد سے شائع ہوئی۔ کتاب کا انتساب والد مرحوم کے نام ہے۔ یہ کتاب دراصل ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب 151 صفحات پر مشتمل ہے اور آٹھ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ موصوف پیش لفظ میں اردو تنقید میں مغربی تنقیدی نظریات کے ساتھ مقامی، سماجی وتہذیبی پس منظر کو بھی مدنظر رکھنے پر زور دیتے ہیں اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''مغربی تنقید سے استفادہ کرتے ہوئے اردو کے سماجی اور تہذیبی پس منظر کو ملحوظ رکھیں تاکہ مغربی ادب کی تقلید یا ادبی آزادی کے نام پر جو بے راہ روی یا گمراہی پیدا ہوچکی ہے اس کا تدارک ہو اور ہمارے فن کاروں میں صحت مند میلانات کی ترویج کی جا سکے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ اس کا تجزیہ کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میرا تنقیدی میلان یہی ہے۔ میں نے اردو ادب کے ماضی وحال اور اس کے سماجی وتہذیبی ورثہ کی روشنی میں مغرب کے تنقیدی اصولوں سے استفادہ کرنے کی سعی کی ہے۔''

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نامور محقق ونقاد، مرقع نگار وصحافی ہی نہیں بلکہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ ان کا ایک عدد شعری مجموعہ 'آنگن آنگن دکھ کے پیڑ' کے عنوان سے 1996 میں اردو اکیڈمی آندھیرا پردیش حیدر آباد کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہو چکا ہے اور اس میں شامل شعری انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نظم ہی نہیں بلکہ غزل کے بھی اچھے شاعر ہیں اور چند غزلوں میں انھوں نے جاوید تخلص اختیار کیا ہے۔

ان کے کلام کے مطالعے سے ان کی شخصیت اور خیالات سے آگہی ہوتی ہے۔

یہ کم نہیں کہ زمانے کو روشنی دی ہے
تمام عمر میاں! ہم جلے دیوں کی طرح

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی غزل گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے علیم صبا نویدی یوں رقمطراز ہیں:

''سلیمان اطہر جاوید صاحب نے غزل کو غزل ہی رہنے دیا۔ کہیں اس کے وقار کو صدمہ پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ حتی الامکان بھرپور شاعرانہ روایت کے ساتھ اپنے خیالات کو قاری کے سامنے رکھا۔ بات بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ موصوف کا مخاطب کوئی نہیں اور از خود یا باخود کچھ کہتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی زیرلب کوئی بات کہہ لی یا ذرا اونچی آواز میں کچھ بتادیا یہ رویہ ان کی غزل کے اکثر وبیشتر اشعار میں دکھائی دیتا ہے۔ موصوف کی غزلیں بھی موصوف کی کشادہ پیشانی ہی کی طرح غموں کو مسکراہٹ کی مہک عطا کرتی ہیں۔ آپ کی غزلیں نکھرتی، بولتی، مچلتی، مہکتی، لپکتی، ڈولتی اور گنگناتی آگے بڑھ رہی ہیں۔ غزل کے وسیع میدان سے توقعات ہیں کہ موصوف کی رسائی دور دور تک ہوگی اور روشن کامیابی ان کے شعری پیکر کے قدم چومے گی۔''

(علیم صبانویدی: نذر جاوید، ص 101-99)

موصوف نے عام زندگی کے تجربات کو اپنی شاعری میں برتا۔ وہ ایک سیدھے سادے انسان ہیں اور ان کی سادگی وخاکساری ان کے کلام سے بھی جھلکتی ہے:

ایک دنیا دیکھ آئے کیا کریں پھر بھی جناب
اپنے گھر کے پاس کی ہے جو گلی اچھی لگی

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا شعری تجربہ اپنی ساخت کے اعتبار سے انتہائی سہل اور مانوس ہے گویا اس میں الجھاؤ اور مشکل کے بجائے آسانی نظر آتی ہے وہ اپنی نظموں اور غزلوں میں ابہام اور اظہار کی دیگر پیچیدگیوں میں نہیں الجھتے بلکہ ان کا شعری اسلوب ان کے اظہار کو سہل بنا دیتا ہے۔ ان کی غزلوں میں نہ تو الفاظ بکھرے ہوئے ملتے ہیں اور نہ غزلیں فکری انتشار کی ہی شکار نظر آتی ہیں۔ ان کی فکر تعمیری جہتیں رکھتی ہے۔ ہر چند کہ غزل میں انتشار خیالی ہوتا ہے۔ لیکن موصوف غزل سے بھی سماجی حقائق کی تشریح کا کام لینا چاہتے ہیں۔ وہ قاری کو بھی لفظوں اور زبان سے مدہوش کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے معنوی نظام اور اس کی کیفیت سے لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔

مرا خیال نظر میری، میری دنیا کیا
میں منزلوں کا گزیدہ ہوں میرا راستہ کیا
کوئی ملے یہ غنیمت ہے سونی راہوں میں
اب ایسے وقت کوئی غیر کیا شناسا کیا

زیادہ تر شاعری معنویت کی حامل ہے اور اپنے اندر زمانے کا شعور وادراک رکھتی ہے۔ ان کی شاعری نہ صرف ان کی شخصیت اور زندگی کا بیان ہے بلکہ زمانے کے حوادث کی تفسیر بھی ہے۔

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید مشاہیر کی نظر میں

عبدالقادر سروری: ''آپ نے جس سعی وکاوش سے مواد اکٹھا کیا ہے اور اپنے بارے میں کچھ لکھنے اور لکھانے سے رشید صاحب کی گریز سے جس طرح نمٹنے کی کوشش کی ہے قابل تحسین ہے۔ اس تلاش اور محنت نے تاریخ ادب کے متعلمین کے لیے بڑا عمدہ مواد فراہم کیا ہے۔ رشید صاحب کے حالات کے علاوہ ان کی ادبی شخصیت کے سارے پہلوؤں کو جس سلیقے سے ابھارا ہے اس کی بھی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ جدید عہد کی عمدہ سوانح عمری ہے جو آئندہ لکھنے والوں کے لیے رہنما ثابت ہوگی۔

اسلوب احمد انصاری: آپ نے کتاب بڑی محنت اور خوش اسلوبی کے ساتھ مرتب کی ہے اور بہت مفید مواد جمع کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رشید صاحب کی زندگی کی بعض ان تفصیلات سے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے میں بھی واقف نہ تھا۔ ان کے فن سے بھی آپ نے اچھی بحث کی ہے۔ رشید صاحب پر اس کتاب نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا اور اس کام کے لیے آپ لائق مبارکباد ہیں۔

رشید احمد صدیقی: آپ کی کتاب 'اسلوب وانتقاد' مسعود صاحب سے مجھے مل گئی تھی۔ جہاں تک دیکھ سکا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں شعر وادب واسالیب کے سمجھنے کی بڑی اچھی استعداد ہے۔ مسرت ہے کہ آپ اپنا کام تندہی اور عقیدت سے کرتے جائیں اور خود اپنے کاموں کا احتساب کرتے رہیں۔

پروفیسر قمر رئیس: ''پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی تجزیاتی تنقید میں ابتدا ہی سے نکتہ رسی، ژرف بینی اور اعتدال وتوازن کا احساس ہوتا ہے اور یہ بلاشبہ ان کے انہماک، غور وفکر، وسیع مطالعہ اور محنت کا ثمرہ ہے۔

ندافاضلی: ''آپ کی تنقید صاف شفاف اور تخلیقی ہے۔ بنا کسی الجھاؤ کے اپنی بات کو قارئین تک پہنچانے کا ہنر آپ کو آتا ہے۔

ایک شاعر، ادیب، نقاد اور مرقع نگار ہونے کے علاوہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید ایک ہمدرد انسان اور لوگوں سے محبت کرنے والی سچی شخصیت کے مالک ہیں اور بے شمار جسمانی اور روحانی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔

■

Dr. Shaikh Imran
Asst Prof. Dept of Urdu
Vasant Rao Nanak Govt Institute of & Social Sciences, Nagpur -440001 (MS)

سید اطہر رضا بلگرامی

سماجی علوم کی تعلیم و تدریس میں مشاہداتی زاویہ فکر کی اہمیت

اقتصادیات کے دائرے میں جائزہ

ہم کو اپنے تعلیمی دور سے لے کر آج تک یہ احساس شدید رہا کہ سماجی علوم کی تعلیم و تدریس جو کلاس روم میں ہوتی ہے، معاشرے کی طرز زندگی کا کوائف نہیں کرتی ہے۔ ایک پردہ ہے جو درسی کتابوں میں بیان کردہ فکر و نظریات اور زندگی گزارنے کے انداز کے درمیان حائل ہے۔ ہم نے سماجی علوم کی تعلیم و تدریس کو درسی کتابوں میں بیان کردہ نظریات کی تشریح و تنقید تک محدود رکھا ہے۔ وہ بیان کردہ قوانین و نظریات انسانی معاشرہ کی زندگی سے کس طرح وابستہ ہیں، اس کو کس طرح متاثر کر رہے ہیں، اس پر توجہ کم ملتی ہے۔ نتیجتاً تعلیم و تدریس کی مقصدیت فوت ہوتی جا رہی ہے۔ میں اقتصادیات کی درسی کتابوں میں بیان کردہ چند بنیادی قوانین و نظریات کو نموتنا کلاس روم سے نکال کر آپ کی زندگی کے معمولات سے وابستہ کرکے پیش کرنے کی سعی کر رہا ہوں تاکہ ان نظریات کی عملی شکل واضح ہو جائے اور اس کی تعلیم و تدریس زیادہ بامقصد، زیادہ بامعنی ہو جائے۔

I

سماجی علوم میں اکنامکس [اقتصادیات/ معاشیات] ایسا منفرد مضمون ہے جو زبان، اصطلاحات، طرز بیان، انداز تشریح و تشخیص کے اعتبار سے دیگر مضامین سے مختلف نظر آتا ہے۔ آپ اکنامکس کی کوئی کتاب پڑھنا شروع کیجیے تو پہلا تاثر یہی ابھرے گا کہ موضوع سے وابستہ تمام وضاحتیں، تشریحات، اصطلاحات نامانوس، غیر دلچسپ اور اجنبی سی ہیں۔ اس میں ایسی کشش نہیں ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن وابستہ رہے۔ میں اگر ایک اصطلاح کی وضاحت کر دوں تو شاید یہ اجنبیت دور ہو جائے۔

اکنامکس کی بنیادی درسی کتاب مائیکرو اکنامکس Micro ecnomics ہے جس کا ابتدائی اہم باب عمل صرف Consumption function ہے جہاں صارفین کے عمل صرف کی تشریح ملتی ہے۔ اکنامکس عوام کو 'صارفین' Consumers کے لقب سے مخاطب کرتا ہے۔ غور کیجیے اس لقب میں کتنی حقانیت ہے، کس قدر آپ کے معمولاتِ زندگی سے وابستہ ہے۔ انسان نوازیدہ بچہ ہو یا بوڑھا، عمر کے کسی دور سے گزر رہا ہو، کسی پیشہ کو اختیار کیے ہوئے ہو، راجہ ہو یا پرجہ، صاحب اختیار ہو یا محتاج، تنہائی پسند ہو یا مجلسی، گھر میں ہو کہ گھر کے باہر، وطن میں ہو یا وطن سے دور، صحت مند ہو یا بیمار، خوشحال و مطمئن ہو یا پریشان و تنگ دست اس کے افکار و خیالات و عقائد کچھ بھی ہوں، ہر حال میں اگر سانس لے کر زندہ رہنے کا ثبوت دے رہا ہے تو صارف ہے۔ وہ عمل صرف سے نہ گریز کر سکتا ہے اور نہ انحراف۔ اگر کوئی انسان یا گروہ خود اختیاری طور پر ارادتاً یا جبراً عمل صرف سے گریز کرتا ہے تو وہ اقتصادیات کے دائرہ فکر سے باہر ہے۔ چونکہ اقتصادیات انسانی زندگی کی ٹھوس مادی بنیادوں کی تشریح کرتا ہے اس لیے صارفین کے عمل صَرف کو مرکز قرار دیتا ہے۔

عمل صَرف آئینہ زندگی ہے جس کی بنیادی خواہشات ضرورتیں اور طلب ہیں۔ یہی جذبے متحرک ہو کر عمل صرف کو سرگرم رکھتے ہیں۔ اکنامکس انسان کے ان تمام جذبوں [خواہشات، ضرورتیں اور طلب] کی وضاحت کرتا ہے اور اپنی فکر کو طلب پر مرکوز رکھ کر کچھ اصول و نظریات پیش کرتا ہے جس میں قانون طلب و رسد، قانون قدر، قدر کی لوچ اور قانون خط بے نیازی خصوصی توجہ کے حامل ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان تمام قوانین کی تشریحات کو سمیٹا نہیں جا سکتا۔ ہاں نموتنا چند کی تشریحات مشاہداتی انداز سے پیش کر رہا ہوں تاکہ یہ قوانین درسی کتابوں سے نکل کر آپ کی زندگی میں سمو جائیں۔

انسان خواہشات و آرزوؤں کا پتلا ہے۔ اقتصادیات اس فطری جذبے کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے بکھراؤ، عدم سمتیت، عدم اعتمادی اور عدم یقینیت کے زیر اثر کسی ٹھوس اصول و قانون کو مرتب کرنے میں اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔ اس کی نظر میں یہ بے لگام فطری جذبہ معقولیت کے دائرے سے باہر ہے۔ اقتصادیات انسان کو ایک معقول معاشی انسان بنانا چاہتا ہے اس لیے ان بے لگام خواہشات کو اصولوں کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ اس کے لیے اقتصادیات نے خواہشات کے انبوہ میں چھان پھٹک شروع کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ خواہشات کی بے لگام

دوڑ میں چند خواہشات اتنی مضبوط ہوتی ہیں جو بار بار ابھرتی ہیں اور انسانی زندگی سے لپٹی رہتی ہیں اور جن کو پورا کیے بغیر سکون وچین نصیب نہیں ہوتا۔ پیاس میں پانی، بھوک میں غذا، سردی میں حرارت پہنچانے والے کپڑے وسازوسامان اور گرمی میں راحت پہنچانے والے سازوسامان اس کی مثالیں ہیں۔ جب یہ پرقوت خواہشات ابھرتی ہیں تو دیگر خواہشات پیچھے چلی جاتی ہیں۔ چائے، سگریٹ، شراب بھی ایسی ہی پرقوت خواہشات ہیں۔ اقتصادیات نے ذہنِ انسانی کو زیادہ جامع اور حقیقت پسندانہ فکر کی طرف موڑا۔ ایسی قوی خواہشات کی تسکین کے لیے انسان اپنی استعداد کے بموجب سعی وکاوش کرتا ہے، کوشاں رہتا ہے۔ اقتصادیات نے خواہشات کے امبوہ سے ایسی پرقوت خواہشات کو الگ کیا اور ضرورت Wants کا نام دیا اور اپنے اصولوں کی تشریح میں شامل کیا۔

اقتصادیات نے اپنی تشخیص کو اور عمیق وگہرہ بنایا۔ اس نے واضح کیا کہ ہر انسان کے وسائل، ان پر ان کی قدرت، اس کا مزاج، ترجیحات، معاشرتی اقدار کی پاسداری یکساں نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی ضرورتوں کو اپنی استعداد اپنی پسند وترجیحات کے بموجب پورا کرتا ہے۔ مثلاً اگر چند دوستوں کو ایک قلم کی ضرورت ہے تو پھر ضروری نہیں کہ سبھی دوست ایک ہی قیمت اور ایک جیسا قلم خریدیں۔ یہاں دوستوں کے درمیان جو شرط مشترک ہے وہ قلم کی ضرورت ہے۔ بس جہاں ضرورت Want کو استعداد وپسند وترجیحات کے بندھن میں باندھا وہاں 'ضرورت' 'طلب' Demand میں منتقل ہوگئی۔ اقتصادیات کی تمام توجہ اسی طلب پر مرکوز ہے۔ اور اس سے وابستہ اصول وقوانین اسی کا احاطہ کرتے ملتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ اکنامکس نے کس طرح خواہشات کے بکھراؤ کو سمیٹا اور ایک بامقصد فعل کی طرف منتقل کردیا۔ کس طرح اس نے آپ کو خواہشات کے امبوہ سے نکال کر ضرورت Wants کے دائرہ میں داخل کیا اور اس کو مزید صاف ستھرا بنا کر بالآخر طلب Demand کی منزل تک لے آیا اور یہاں تک لاتے لاتے اس نے آپ کو ایک مکمل معقول معاشی انسان بنا دیا جس کو صارف Consumer کا لقب دیا۔ انھیں کی آبادی کو صارفین Consumer کہا گیا اور جن اصولوں کے تحت وہ اپنی طلب کی تسکین کرتے ہیں، ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، اس کو عمل صَرف Consumer's function کہا گیا اور جس طور پر صارف اکنامکس میں قانون طلب ورسد پر عمل کرتا ہے اس کو Consumer-behavior کا نام دیا گیا۔ یہ ایک ایسا فطری قانون ہے جس کی ابتدا اگر آپ غور کریں تو شکمِ مادر سے ہی ہوجاتی ہے اور تاحیات آپ کی زندگی سے جڑا رہتا ہے۔ اور آپ جانے انجانے اس کی پیروی کرتے رہتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں تہذیبوں میں ہونے والے تمام تغیرات کا محرک یہی قانون ہے۔ میں قانون کی تشریح سے پہلے اس کی وسعت واثر انگیزی کا مختصر جائزہ رہا ہوں۔

اقتصادیات نے اپنی تشخیص کو اور عمیق وگھرہ بنایا۔ اس نے واضح کیا که ہر انسان کے وسائل، ان پر ان کی قدرت، اس کا مزاج، ترجیحات، معاشرتی اقدار کی پاسداری یکساں نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی ضرورتوں کو اپنی استعداد اپنی پسند و ترجیحات کے بموجب پورا کرتا ہے۔ مثلاً اگر چند دوستوں کو ایک قلم کی ضرورت ہے تو پھر ضروری نہیں که سبھی دوست ایک ہی قیمت اور ایک جیسا قلم خریدیں۔ یہاں دوستوں کے درمیان جو شرط مشترک ہے وہ قلم کی ضرورت ہے۔

میں نے ذکر کیا کہ اس قانون کی ابتدا شکم مادر میں کسی زندگی کے آنے کے ساتھ ہوجاتی ہے اور تاحیات اس سے وابستہ رہتا ہے۔ ادھر ماں کو اپنے شکم میں کسی ہستی کے وجود کا احساس ہوا ادھر قدرت نے ماں کو قانونِ طلب میں باندھ لیا۔ اس کے معمولات زندگی میں فرق آگیا۔ وہ زیادہ محتاط نظر آنے لگی۔ اس کے کھانے، پینے، اٹھنے بیٹھنے، آرام کرنے، کام کرنے میں ایک نظم ونسق پیدا ہوگیا۔ ایسا کیوں ہورہا ہے۔ ایک زندگی اپنی بقا کے لیے کچھ طلب کررہی ہے اور دوسری اس کو پورا کررہی ہے۔ 9 ماہ بعد جب یہ ہستی دنیا میں آئی تو اپنی طلب کے لیے اس کے پاس نہ زبان ہے نہ الفاظ۔ ہاں ہاتھوں کی جنبش، چہرے کے بدلتے رنگ، اعضاء وجوارح کی حرکت ضرور ہے۔ ماں کے لیے یہی سب پیغامات ہیں۔ کب نیپکن بدلنا ہے؟ کب دودھ پلانا ہے؟ کب گود میں دے کر تھپکنا ہے؟ کب سہلانا ومالش کرنا ہے؟ ماں نے بچہ کی طلب کو پورا کیا اور وہ پُرسکون سوگیا۔ اسی کو نقطۂ تسکین (Point of satisfaction) یا نقطہ توازن (Equilibrium) کہا گیا۔ اب ماں اس کی اس طلب کو پورا نہ کرے، وقت پر دودھ نہ دے، گود میں لے کر نہ تھپکائے، گیلا نیپکن نہ بدلے، بستر کی شکن دور نہ کرے تو یقیناً بچہ بے چین رہے گا۔ یہی عدم تسکین (Dis-satisfaction) یا (Dis-equlibrium) کی سطح ہوگی۔ طلب ورسید کا یہ ربط وضبط جو ابھی ماں اور بچہ کے درمیان ہے، بڑھ کر افراد خانہ، محلّہ، شہر، ملک وغیر ملک تک پھیلتا نظر آتا ہے جہاں توازن وعدم توازن کی کیفیتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اور تہذیب انسانی اس کا مشاہدہ کرتی رہتی ہے۔

اقتصادیات کے مفکرین نے اس نظام قدرت پر غور کیا اور ایک بنیادی قانون طلب ورسد سے دنیا کو متعارف کرایا۔ چونکہ ہر انسان اپنی ضرورت کی تسکین کسی وسیلے سے کرتا ہے اس لیے وہی وسیلہ اس کی ضرورت کی تسکین کا ذریعہ بنتا ہے اور وہی ضرورت کی تسکین کا پیمانہ بھی۔ ضرورت کی اشیاء وجنس کی مقدار اور اس کو حاصل کرنے کی استعداد جو آمدنی وقیمت کا مظہر ہوتی ہے، غور کیا گیا تو دونوں میں مخالف رشتہ پایا گیا۔ یعنی اگر قیمتیں بڑھتی ہیں تو مانگ کم اور اگر گرتی ہیں تو مانگ زیادہ ہوتی ہے۔ قیمت کے بڑھنے پر طلب کرنے والوں کی تعداد کم اس لیے ہوتی ہے کہ تمام انسانوں کی استعداد وادائیگی یعنی آمدنی برابر نہیں ہوتی۔ اور بلند قیمت پر چند افراد یا گروہ انسانی ہی اس کو حاصل کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ لیکن جب قیمتیں گرنا شروع ہوتی ہیں تو خریدنے والوں کی استعداد کا دائرہ وسیع ہونے لگتا ہے، زیادہ سے زیادہ صارفین اس شے کو حاصل کرنے کے اہل ملتے ہیں۔ اس لیے قانون یہ واضح کرتا ہے کہ دیگر باتیں یکساں رہنے پر اگر قیمتیں بڑھتی ہیں تو طلب کم اور گرنے پر طلب زیادہ ہوتی ہے۔ اس قانون کے بہت سے گوشے مضمون کی طوالت کے مدِنظر چھوڑ رہا ہوں جن کی تفصیلات ہماری کتابوں میں مل جائیگی۔ ہاں ایک فقرہ کی وضاحت ضرور کرتا ہوں اور وہ ہے ''اگر دیگر باتیں یکساں رہیں۔''

اس قانون کے نافذ ہونے میں یہ فقرہ بہت اہم ہے۔ یہ فقرہ اس قانون کے نافذ ہونے کی ان پابندیوں اور بندشوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کی موجودگی میں اس قانون کا اطلاق صحیح طور پر نہیں ہوسکتا۔ اگر آمدنی میں اچانک اضافہ ہوجائے، فیملی بڑی ہوجائے لیکن کمانے والوں کی تعداد وہی رہے، کسی شے کا متبادل بازار میں آجائے، سیاسی حالات بدلیں، جغرافیائی آفات وتغیرات، تعلیم وتربیت کے پھیلاؤ سے ترجیحات بدلیں تو یہ قانون نافذ نہیں ہوتا۔ ان کا اثر طلب پر پڑتا ہے ان تمام مفروضات کو سمیٹ کر یہ کہہ دیا گیا کہ اگر ''دیگر باتیں یکساں رہیں'' تو طلب اور قیمت کے درمیان مخالف

نسبت پائی جاتی ہے۔

طلب کی نوعیتیں تین طرح کی ہوتی ہیں اور ہر ایک کی اس کی قیمت سے نسبت جداگانہ ہوتی ہے۔ اس کو طلب کی حساسیت برائے قیمت کہا گیا۔ یعنی Price elasticity of demand or price responsneness یہ بھی ہمارے آپ کے مشاہدے کی بات ہے کہ اشیاء و خدمات کی قیمتوں میں چاہے جتنا تغیر آئے ان کی طلب پر اثر بہت کم پڑتا ہے۔ یعنی ان کی طلب بہ اعتبار قیمت بے لوچ ہوتی ہیں۔ اشیاء ضروری اسی زمرے میں آتی ہیں۔ ان کی طلب بروئے قیمت بے لوچ ہوتی ہے۔ کچھ اشیاء جو آرام و آسائش کے زمرے کی ہیں ان کی قیمت اور طلب کے درمیان رشتہ الٹا پایا جاتا ہے۔ جب قیمتیں بڑھتی ہیں تو طلب گرتی ہے اور جب قیمتیں گرتی ہیں تو طلب زیادہ ہوتی ہیں۔ کچھ اشیاء ایسی بھی ہوتی ہیں جو عیش و عشرت کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہاں طلب کی حساسیت بہت شدید پائی جاتی ہے۔ یعنی قیمتوں میں تھوڑی سی گراوٹ طلب کو بہت بڑھا دیتی ہے اور تھوڑی سی بلندی طلب کو بہت گرا دیتی ہے۔ اصطلاحات میں ان کو In-elastic اور Elastic Highly-elastic کہا گیا ہے۔

II

قانون طلب کے مختصر تعارف کے بعد اس سے منسلک ایک دوسرا اہم قانون، قانونِ قدر ملتا ہے۔ کافی وسیع اور اہم موضوع ہے جس کا بس مختصر تعارف یہاں پیش کر رہا ہوں۔ اس کا تعلق بھی عمل صَرف سے ہے۔ آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ دنیا کی ہر شے جو آپ کے حلقہ علم میں ہے، آپ کے کام کی ہے یا آپ کی کسی نہ کسی ضرورت کی تسکین کا وسیلہ ہے۔ ہر شے میں پوشیدہ یہی قوت اس شے کی قدر کا تعین کرتی ہے۔ کسی شے میں انسان کی کسی ضرورت کی تسکین کی جتنی مستحکم قوت پائی جاتی ہے وہ اسی قدر پر کشش بنتی ہے، اسی قدر بلند اس کی قدر ہوتی ہے۔

جب تک انسان شے کی اس قوت سے بے خبر رہتا ہے، اس شے میں کوئی کشش نہیں پاتا۔ وہ شے اس کے لیے بے قدر و قیمت ہی رہتی ہے۔ معاشیات میں قدر Utility کی پہلی اور بنیادی شرط یہی ہے کہ اس شے میں انسان کی کسی ضرورت کی تسکین کی قوت ہو اور انسان اس سے واقف بھی ہو۔

معاشیات میں قدر کی دوسری اہم شناخت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کمیابی میں ابھرتی ہے، افراط میں نہیں۔ اس کی وضاحت زندگی کے مشاہدوں سے کی جا سکتی ہے۔ ہوا، پانی، سورج کی روشنی، اس کی تمازت سب قدرت کے

شدید پیاس میں پانی کا پہلا گھونٹ اور بھوک میں روٹی کا پہلا نوالہ جس بلند قدروسکون کا احساس کرائے گا، اس کے بعد کے گھونٹ ونوالے اتنی بلند قدروسکون کا احساس نہیں کرائیں گے۔ بتدریج قدر گھٹتی جائے گی اور یہ اس لیے ہوگی کہ تسکین کا دائرہ ہر گھونٹ اور ہر نوالے کے ساتھ سمٹتا جائے گا۔ دائرے کا سمٹنا ہی تسکین کی سطح کے بلند ہونے کی دلیل ہے۔ ایک سطح پر تسکین مکمّل ہوجائے گی، یعنی پیاس بجھ جائے گی، بھوک مٹ جائے گی اور یہی کامل تسکین کی سطح ہوگی۔ اس کے آگے صَرف کی اکائیاں اپنی قدر نہ صرف کھودیں گی بلکہ عدم تسکین کا احساس پیدا کریں گی۔

عطیات ہیں اور یہ اتنے قیمتی ہیں کہ ان پر نہ صرف بنی نوع انسان بلکہ حیوانات، نباتات سبھی کی بقا کا انحصار ہے۔ قدرت نے اسی لیے ان کو بے حساب افراط میں عطا کیا ہے۔ اتنا افراط میں کہ انسان کو ان کی قدر کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ذرا ان کی دستیابی کو محدود کر دیجیے تو فوری ان کی قدر کا احساس جاگ جائے گا۔ انتہائی حبس و امس میں ایک فرحت بخش ہوا کے جھونکے کی قدر کا احساس کیجیے۔ بے آب و گیاہ صحرہ میں تھوڑے پانی کی دستیابی کی قدر کو محسوس کیجیے۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جہاں آکسیجن نہیں ہوتی، غوطہ خوروں کے پشت پر لگے آکسیجن سلنڈر کی اہمیت کا اندازہ کیجیے۔ وہ غوطہ خور اپنی نارمل زندگی میں کبھی سوچتا بھی نہیں کہ اس کی زندگی کے لیے ہوا کی کیا اہمیت ہے۔ لیکن یہاں وہی بے وقت ہوا کی تھوڑی مقدار اس کی زندگی کی ضامن بنی ہوئی ہے۔ افراط قدر کو نہیں جگاتی بلکہ کمیابی میں قدر ابھرتی ہے۔ یہی حال ہسپتالوں میں مریضوں کو لگے آکسیجن سلنڈر کی ہے۔ اس سلنڈر کی قدر و قیمت اس مریض کے گھر والوں سے پوچھیے۔

یہ مثالیں تو مخصوص ہیں۔ آپ تو معمولات زندگی میں دیکھیے کہ جس وقت گھریلو اشیائے صَرف میں بہتات ہو، ان کی قدر گھٹ جاتی ہے اور جب یہی بہتات بہ وجہ استعمال گھٹنے لگے تو بتدریج قدر و منزلت بڑھنے لگتی ہے۔ صرف میں احتیاط، ایک نظام اور سلیقہ آ جاتا ہے۔

محض قلت یا کمی ہی نہیں بلکہ مدت [وقت] یا زمانہ اور فاصلے بھی قدر کے معیار کو طے کرتے ہیں۔

شراب کہنہ کی بڑی قدر ہے محض اس لیے نہیں کہ وہ کمیاب ہے بلکہ اس لیے بھی کہ اس پر ایک مدت اور وقت لگایا گیا ہے۔ چاولوں کے کچھ اقسام کی بھی یہی صورت ہے۔ یہی صورت حال فاصلے کی ہے۔ گنگا کے کنارے بسے لوگوں کے دلوں میں اس کی وہ قدر و منزلت نہیں ہوگی جو ہزاروں میل دور بسے لوگوں کے دلوں میں ہوگی۔ حرم شریف سے متصل رہنے والوں کے دلوں میں وہ عقیدت نہیں ہوگی جو اس سے ہزاروں میل دور دراز ملکوں میں بسے لوگوں کے دلوں میں ہوگی۔

انسانی شعور کی بالیدگی بھی قدر کی سطح کو طے کرتی ہے۔ نوجوانوں میں ہو سکتا ہے بہت سی اشیاء و خدمات کی فی الوقت کوئی قدر نہ ہو لیکن طویل عمر کا تجربہ رکھنے والے بزرگ، عمر کے نشیب و فراز کو جھیل کر دور بینی پیدا کرنے والے معمّر حضرات واقف ہوتے ہیں کہ آئندہ زمانہ میں ان کی کیا قدر ہوگی۔ انسان میں پس انداز کرنے کی دور اندیشی اسی پختہ شعور سے پرورش پاتی ہے اور بیشتر وہی حضرات زیادہ مطمئن نظر آتے ہیں جو حال کے ساتھ مستقبل پر بھی نظر رکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا جو مستقبل کی قدر و قیمت کو حال میں آنکتے ہیں۔

قدر کی ان تمام کثیر الجہتی صفات کی تشریح کے بعد معاشیات میں بیان کردہ قانون قدر پر نظر کیجیے۔ معاشیات میں قدر اس پوشیدہ قوت کا نام ہے جو کسی ضرورت کی تسکین کا باعث بنے اور انسان اس قوت سے واقف بھی ہو۔ قیمت کی ادائیگی کا عمل اس کا مظہر ہے۔ معاشیات میں قدر کا قیمت سے اہم رشتہ ہے کیونکہ یہی قیمت یعنی قوت خرید اس شے کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے جس کے ذریعہ تسکین ملتی ہے۔ قیمت کی ادائیگی کی استعداد یا اہلیت جس کو ہم قوت خرید کہتے ہیں اور جس کو آمدنی کی سطح سے ناپا جا سکتا ہے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے اشیاء کے حصول کی مقدار و معیار بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔ لیکن جدا ہونے کے باوجود مطمئن ہونے کی سطح مساوی رہتی ہے۔ اگر ایک صاحب حیثیت کو قیمتی کار سے جس تسکین کا احساس ہوتا ہے، وہی تسکین کا احساس ایک کم حیثیت والے کو موٹر سائیکل یا اس سے بھی کم حیثیت والے کو محض سائیکل سے ہو سکتا ہے۔ یہاں آمدنی کے فرق سے پیدا قوت خرید کی خلیج تسکین کی سطح کو نہیں بدلتی۔ یہاں ایک بات کی اور وضاحت کرتا چلوں کہ کم آمدنی کی سطح والے جن کی قوت خرید دوسروں کے مقابلے پست ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس شے کی قدر کو نہیں پہچانتے۔ یہ شخص اس شے کی قدر و افادیت سے واقف ہے لیکن فی

الوقت اس کی نگاہ میں اس شے کی قدر یوں نہیں ہے کہ وہ اس کے حصول کا اہل نہیں ہے۔

مائیکرو اکنامکس کی کتابوں میں قانونِ قدر کی وضاحت کچھ اس طرح ملتی ہے۔ کہا گیا اگر دیگر باتیں یکساں رہیں تو صَرف کی پہلی اکائی [یونٹ] سے سب سے بلند قدر یا افادیت کا احساس ہوتا ہے اور جیسے جیسے صرف کی اکائیوں کو بڑھاتے جاتے ہیں تو ہر اگلی اکائی پر ملنے والی قدر گھٹتی جاتی ہے۔ صرف ایک سطح ایسی آئے گی جہاں قدر یا افادیت کا احساس صفر ہوجائے گا اور یہی سطح اطمینانِ کل Maximum/optimum satisfaction کی ہوگی اس سطح کے بعد اگر صرف کی مزید اکائیوں کو بڑھایا گیا تو قدر بجائے بڑھنے کے گھٹے گی، یعنی منفی ہوگی۔ جس کو Dis-satisfaction or dis-utility عدم تسکین کا نام دیا گیا۔

اس قانون کی وضاحت چند روز مرّہ کے امور سے بخوبی کی جاسکتی ہے۔ شدید پیاس میں پانی کا پہلا گھونٹ اور بھوک میں روٹی کا پہلا نوالہ جس بلند قدر وسکون کا احساس کرائے گا، اس کے بعد کے گھونٹ ونوالے اتنی بلند قدر وسکون کا احساس نہیں کرائیں گے۔ بتدریج قدر گھٹتی جائے گی اور یہ اس لیے ہوگی کہ تسکین کا دائرہ ہر گھونٹ اور ہر نوالے کے ساتھ سمٹتا جائے گا۔ دائرے کا سمٹنا ہی تسکین کی سطح کے بلند ہونے کی دلیل ہے۔ ایک سطح پر تسکین مکمل ہوجائے گی، یعنی پیاس بجھ جائے گی، بھوک مٹ جائے گی اور یہی کامل تسکین کی سطح ہوگی۔ اس کے آگے صَرف کی اکائیاں اپنی قدر نہ صرف کھودیں گی بلکہ عدم تسکین کا احساس پیدا کریں گی۔ یہاں مثال پانی اور غذا کی دی گئی ہے۔ اس قانون کا اطلاق ہر اشیائے صَرف پر ہوتا ہے۔ ملبوسات، کار، بائیک گھر کا ساز و سامان سبھی اس قانون کے تحت آتے ہیں۔

اس قانون کے نافذ ہونے کے کچھ مفروضات/ شرائط یا پابندیاں ہیں۔ پہلی شرط یہی ہے کہ معقول فکروذہن کا ہونا۔ کنجوس یا ہوس والے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ ایک Rational human being پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ استعمال کے اوقات، کوالیٹی وماہیت میں تبدیلی نہ ہو۔ اگر پیاس میں وقفہ دے کر پانی پیتے ہیں تو بہت ممکن ہے ہر وقفہ کے بعد پہلا گھونٹ مساوی تسکین دے۔ یا اگر پہلا گھونٹ سادہ پانی کا لیا اور دوسرا گھونٹ ٹھنڈے پانی کا تو دوسرا گھونٹ پہلے کے مقابلہ زیادہ تسکین کا احساس کرائے گا۔ یہی صورت بھوک میں کھانے کی ہے۔ اگر پہلا نوالہ باسی روٹی کا لیا اور دوسرا تازہ گرم روٹی کا تو دوسرا نوالہ پہلے کے مقابلہ زیادہ اچھا لگے گا۔ یہی صورت حال وقت کے بدلنے میں ہوتی ہے۔ بھوک کے وقت اگر کھانا نا ملا تو وقت ٹل جانے پر وہ تسکین نہیں ملے گی۔

احساسِ تسکین کا تعلق مقام اور ذہنی سطح سے بھی بہت گہرا ہے۔ گرمیوں میں ٹھنڈے مقام پر تسکین کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ کسی ذہنی انتشار میں یہ قانون منطبق نہیں ہوتا۔ یہی حال آمدنی کے تغیر میں ہے۔ اگر آمدنی میں اچانک اچھال آگیا تو تسکین کے پیمانے بدل جائیں گے۔ گندی بستیوں سے نکل کر صاف ستھرے ماحول میں آکر رہنے، گاؤں قصبوں سے نکل کر شہروں میں بسنے سے تسکین کے پیمانہ بدل جائیں گے ہمارے مطمئن ہونے کا معیار بدل جائے گا۔ اچانک خوشی یا صدمے کی صورت میں یہ قانون فعال نہیں ہوتا۔ گویا قانونِ قدر ایک نارمل صورت حال میں ہی فعال رہتا ہے۔ کوئی غیر معمولی کیفیت اس کے عمل میں مانع ہوسکتی ہے۔

اب اگر ان تمام بیانیہ تفصیلات کو سمیٹ کر ہندسوں اور شکلوں میں منتقل کردیا جائے تو قانون اپنی عملی شکل میں واضح ہوجائے گا۔ میں یہاں صرف پانی کی مثال لے رہا ہوں۔ آپ نے شدید پیاس میں پانی کا پہلا گھونٹ لیا تو اپنے احساس تسکین کو بلند مقام پر پایا۔ مان لیجیے یہ بلند سطح 80 پر ہے۔ اب دوسرا گھونٹ لیا تو یقیناً احساس تسکین بلند ہی رہا لیکن پہلے کے مقابلے تھوڑا کم ہوگا۔ مان لیجیے یہ سطح 70 کی ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ آپ گھونٹ گھونٹ پانی پیتے رہیں گے۔ ہر گھونٹ پر احساس تسکین پہلے کے مقابلہ گرتا جائے گا اور ایک مقام پر آکر صفر یعنی 0 ہوجائے گا۔ یہاں پیاس بجھ جائے گی اور آپ تسکین کامل حاصل کرلیں گے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہر اگلی اکائی پر احساس تسکین گرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیاسے کو اپنی پیاس کا پیمانہ معلوم ہے کہ اس کی پیاس کتنے گلاس پانی کی ہے۔ پہلے گھونٹ میں اس کا ایک حصہ بجھ گیا تو کل حجم کم ہوگیا۔ اس لیے جو اگلا گھونٹ ہوگا اس میں تسکین کچھ کم ہوگی۔ آپ گھونٹ گھونٹ پانی سے پیاس کے حجم کو کم کرتے جائیں گے اور جو آخری گھونٹ ہوگا اس میں گویا سب سے کم تسکین کا احساس ہوگا۔ آپ کی پیاس بجھ جائے گی اور آپ تسکین کامل کی سطح پر پہنچ جائیں گے۔ اب اس کے آگے پانی کے گھونٹ کی افادیت صفر ہوجائے گی۔

معاشیات میں اس قانون قدر کو کل، اوسط اور حاشیائی قدر میں تقسیم کرکے وضاحت ملتی ہے۔ ریاضی اور جیومیٹری کی مدد سے اس کو مزید واضح کیا گیا ہے۔ لیکن اس مختصر مضمون میں ان سب کی تشریح مشکل ہے۔

معاشیات کا نظریہ قدر آپ کے عملِ صَرف سے خاموشی کے ساتھ لپٹا ہوا ہے، آپ کے ذہن، طبیعت ومزاج اور سوچ وفکر کے ساتھ وابستہ ہے اور آپ جانے انجانے اس کی پیروی کرتے رہتے ہیں۔ صارفین کے اس طرزِ عمل Consumer behavior کو مائیکرو اکنامکس کی بنیاد قرار دیا گیا ہے جس کے چند گوشوں کی یہاں وضاحت کی گئی ہے۔ دیگر گوشے جیسے صارفین کے خطِ بے نیازی Indifference curve اور صارفین کے اضافہ Consumer's-surplus کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا گیا ہے۔ صارفین کے طرزِ عمل کے بعد پیداوار، بازار، مسابقتی بازاریں اور آخر میں تقسیم کی منزل آتی ہے۔ احاطہ بہت وسیع ہے۔ اگر آپ کو ایسے ہی مشاہداتی انداز میں ان تمام گوشوں کی تفصیلات میں جانے میں دلچسپی ہو تو میری چند تصنیفات کا مطالعہ کرلیجیے جن کا حوالہ مضمون کے اخیر میں دیا جارہا ہے۔

اختتامیہ

میں نے کوشش کی ہے کہ سماجی علوم کی ایک اہم برانچ اکنامکس کے نظریات وقوانین کو درسی کتابوں سے نکال کر معاشرے کی طرزِ زندگی کے قریب لے آؤں، اس سے وابستہ کردوں۔ میں سمجھتا ہوں علم وآگاہی کا یہ پہلو بہت اہم ہے جو علم یا عمل کی طرف بڑھتا قدم ہے۔ شاید اسی احساس نے Behavioral economics کو نوبل پرائز سے نوازہ ہے۔ سماجی علوم کی درس وتدریس میں یہ خلا بہت روشن ہے، جس کو پر ہونا چاہیے۔ معاشیات ایک ایسا موضوع ہے جس کے اصول ونظریات آپ کی عملی زندگی کے بہت قریب ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو مشاہداتی انداز سے پیش کیا جائے تاکہ وہ نصابی کتابوں میں ہی محصور ہوکر نہ رہ جائیں بلکہ آپ کی زندگی کا آئینہ بن جائیں۔

ہماری کچھ کتب جن کے مطالعے کی سفارش کرتا ہوں:

(1) معاش اور معاشرت [منتخب مضامین] مکتبہ جامعہ نئی دہلی 2006
(2) معاشرتی معاشیات [انتخاب مضامین] مکتبہ جامعہ نئی دہلی
(3) اقتصادیات برائے عوام [مائیکرو اکنامکس کے منتخب اصول] قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
(4) اقتصادیات برائے عوام [میکرو اکنامکس کے منتخب اصول] زیر طبع۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

■

Syed Athar Raza Bilgarami
B-40, Johri Farm, Noor Nagar Extn
New Delhi - 110025
Mob.: 9891425691
E-mail: atharb40@gmail.com

گفتگو

مرزا عبدالقیوم سے خصوصی ملاقات

عبدالحی

عبدالحی: پیدائش وخاندانی پس منظر پر روشنی ڈالیں:

مرزا عبدالقیوم ندوی: میرا پورا نام مرزا عبدالقیوم ندوی، والد کا نام: مرزا گلزار بیگ، ہم تین بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ میری پیدائش 15 اگست 1975 کو ملک کے تاریخی شہر اورنگ آباد (جسے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے 'غرناطۂ ہند' کہا ہے) کے ایک محلہ نارے گاؤں میں ایک غریب کسان ومزدور کے گھر میں ہوئی۔ والد صاحب ہمارے آبائی وطن کونبے پھل (جو اورنگ آباد شہر سے 20 کلو میٹر کی دوری پر ایک دیہات ہے)، 1975 میں قحط سالی کی وجہ سے شہر میں روزگار کی تلاش میں آئے تھے۔ میرے والد صاحب کو ایک فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔

ع ح: ابتدائی تعلیم وتربیت پر گفتگو کریں۔

مرزا عبدالقیوم ندوی: میری ابتدائی تعلیم چوتھی جماعت تک ضلع پریشد مراٹھی اسکول نارے گاؤں میں ہوئی۔ جہاں اردو زبان میں ذریعہ تعلیم کا کوئی نظم نہیں تھا، ہاں مدینہ مسجد نارے گاؤں میں مکتب ضرور چلتا تھا جہاں میں پابندی سے جایا کرتا تھا۔ والد صاحب مرحوم، تبلیغی جماعت میں چالیس دن کے لیے گئے اور وہاں سے آنے کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے دینی تعلیم دلائی جائے، چنانچہ مجھے اسکول سے نکال کر مدرسہ عربیہ انوارالعلوم نگینہ مسجد، نواب پورہ اورنگ آباد میں پہلی جماعت میں شریک کیا گیا۔ چوتھی جماعت سے پہلی جماعت میں بیٹھنا بڑا عجیب لگ رہا تھا، کیا کیا جائے مجبوری تھی، اردو نہیں آتی تھی۔ ہاں ابتدائی تعلیم مراٹھی میں ہونے سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ ریاستی زبان مراٹھی ہونے کے سبب سے سرکاری دفاتر میں کام کرنے میں بہت آسانی ہوئی، گاؤں کی ہندو مسلم مشترک آبادی، مذہبی تقریبات میں شرکت سے ہندوستانی تہذیب وتمدن، یہاں کے تہواروں اور رسم ورواج کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ابتدائی دینی تعلیم مدرسہ عربیہ انوارالعلوم نگینہ مسجد میں ہوئی اور اعلی تعلیم کے لیے ملک کی عظیم دینی درسگاہ، اسلامی یونیورسٹی دارالعلوم ندوۃ العلماء، میں 1993 میں گیا۔ وہاں سے 1998 میں عالمیت وفضیلت تک کی تعلیم مکمل کی۔ فراغت کے بعد کچھ مہینے پونا میں مشہور ماہر تعلیم، انیس چشتی کی تربیت میں رہا، جہاں ''تحریک پیام انسانیت'' فورم کے تحت غیر مسلموں کے درمیان کام کرنے کا موقع ملا۔

ع ح: کتابوں کی فروخت کے کاروبار میں کس طرح آئے؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: 31/دسمبر 1999 کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا انتقال ہوا۔ اورنگ آباد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا تھا، جس میں پونہ سے انیس چشتی اور ناگپور سے مفسر قرآن مولانا عبدالکریم پاریکھ تشریف لائے تھے۔ محترم انیس چشتی صاحب نے میرا تعارف مولانا پاریکھ سے کرواتے ہوئے کہا کہ یہ لڑکا ابھی ابھی ندوۃ العلماء سے فارغ ہوا ہے اور کچھ ماہ میری تربیت میں بھی رہا ہے۔ آپ کے پاس اگر کچھ کام ہو تو اسے دیجیے، اس پر مولانا پاریکھ نے کہا کہ ٹھیک ہے، میرے پاس ایک کام ہے، جو تمھارے لائق ہے وہ یہ کہ میری جو درس قرآن کی کیسٹس ہیں انھیں تحریری شکل میں شائع کرنا ہے اور تم ایک ندوی عالم ہو اور یہ کام بخوبی انجام دے سکتے ہو، ایسا کرو میں جب ناگپور پہنچ جاؤں مجھ سے رابطہ کرنا اور ساتھ ہی انھوں نے اپنا کارڈ دیا۔

میں نے کچھ دنوں کے بعد مولانا سے رابطہ کیا۔ انھوں نے مجھے درس قرآن کی اپنی کچھ کیسیٹیں بھیجیں اور ایک خط لکھا کہ آپ اس کو ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے کتابی شکل دو اور ذیلی سرخیوں کے ساتھ کتابچہ کی شکل میں مجھے بھیجو۔ اگر تمھارا کام پسند آگیا تو باقی کام بھی تمھیں دے دوں گا۔ میں نے مولانا کا وہ کام کر دیا جو انھیں بہت پسند آیا انھوں نے مجھے معاوضہ یا تحفہ کے طور پر اپنی مطبوعات جس کی قیمت آٹھ ہزار روپے تھی بھجوا دیں۔ میں نے سائیکل پر دو تھیلوں میں کتابیں رکھیں اور نکل پڑا۔

یقین جانیے یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ میں ایک ایسے وقت میں مولانا کی کتابیں فروخت کر رہا تھا جس وقت کہ ایک پوسٹ کارڈ پر اگر کوئی مولانا سے ان کی مطبوعات کی فرمائش کرتا تو وہ بھیج دیتے تھے۔

ابتدا میں مسجدوں کے باہر نماز کے بعد کپڑا بچھا کر

کبھی مسجد کے صحن میں اور کبھی سائیکل پر ہی میں دکان لگاتا تھا۔ میرا معمول تھا کہ میں ہر جمعہ کو شہر کی جامع مسجد میں کسی پیڑ کے نیچے دکان لگا کر بیٹھ جاتا اور آواز لگا کر کتابیں فروخت کرتا تھا۔ یہ میرا بڑا کامیاب تجربہ رہا، جامع مسجد میں ہزاروں لوگ نماز پڑھنے آتے ہیں، شروع شروع میں کچھ ہفتوں تک کسی نے میری طرف توجہ نہیں کی، آہستہ آہستہ لوگ میرے ارد گرد جمع ہونے لگے اور اپنے ذوق کی کتابیں خریدنے لگے۔ اس میں ایک کام میں نے یہ کیا کہ لوگوں کو ادھار کتابیں دینا شروع کیں، کیونکہ اکثر لوگ پیسے لانا بھول جاتے تھے، میں ان سے کہتا کوئی بات نہیں آئندہ ہفتہ دے دینا۔ ایک اور کام میں نے یہ بھی کیا کہ میں لوگوں سے کہتا صاحب میں آپ کے مکان، دکان یا آفس پر آجاتا ہوں اور آپ وہاں پیسے دے دیجیے۔ جب میں وہاں جاتا تو کتابوں کی تھیلی بھی ساتھ رکھ لیتا اور مزید انہیں کتابیں دکھاتا تو اکثر لوگ کتابیں خرید لیتے۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے گھروں پر کتابیں لے جانا شروع کی جہاں گھر کی خواتین بھی کتابیں خریدنے لگیں۔ مجھے چند ہی مہینوں میں لوگوں کا ذوق اور پسند معلوم ہوگئی اور جب بھی میرے پاس نئی کتابیں آتیں میں انہیں فون کر دیا کرتا کہ صاحب آپ کے موضوع و دلچسپی کی کتابیں آئی ہیں دیکھ لیجیے یا میں آتا ہوں۔

ایک اور تجربہ یہ کیا کہ اورنگ آباد شہر اردو کا بہت بڑا مرکز ہے۔ یہاں بہت سارے اردو ہائی اسکول و کالج ہیں۔ میں نے وہاں جانا شروع کیا، ابتدا میں بڑی شرمندگی اور اجنبیت سی محسوس ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ مسئلہ بھی حل ہوگیا اور میں اساتذہ کو کتابیں دکھانے لگا، یہاں بھی میں نے یہ کیا کہ ان سے کتابوں کے پیسے نہیں مانگے بلکہ میں کہتا جب آپ کی تنخواہ آجائے اس وقت دے دیں۔ میں مہینہ کی ابتدائی تاریخوں میں اسکولوں میں جاتا سابقہ ادھاری لیتا اور پھر انھیں نئی کتابیں دے دیتا۔ ہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ میں ان سے درخواست کرتا کہ اپنے دوست احباب، رشتہ داروں کو بھی بتائیے یا مجھے ان کا پتہ و فون نمبر دیجیے میں انھیں کتابیں دکھاؤں گا، اس سے وہ خوشی خوشی بتا دیا کرتے اور اپنے طور پر بھی میرا تعارف اپنے دوست احباب سے کرواتے رہتے۔

دو سال تک میں سائیکل پر گھوم پھر کر کتابیں فروخت کرتا رہا، میں روزانہ تقریباً 25 تا 30 کلو میٹر سائیکل پر گھوم کر کتابیں فروخت کرتا تھا اور اس کے بعد میں نے ایک گاڑی خریدی اور اس پر کتابیں بیچنا شروع کیا۔ جس سے میرا کاروبار خوب بڑھنے لگا۔ اب مجھے شہر کا ذوق اور مزاج معلوم ہوگیا تھا اس لیے جب نئی کتابیں آتیں میں لے کر ان کے پاس چلا جاتا۔ لوگ بہت خوش ہوتے اور مجھے دعائیں دیتے اور کہتے کہ، ہاں بھئی مجھے اس کتاب کی بہت دنوں سے تلاش تھی۔ بزرگوں اور خواتین نے مجھے بہت دعائیں دیں کہ انہیں ان کی پسند کی کتابیں گھر بیٹھے مل جاتی تھیں۔

میں نے یہ محسوس کیا کہ لوگوں کے پاس دکانوں پر جا کر کتابیں خریدنے کے لیے فرصت نہیں ہے اس لیے میں کتابیں لے کر ان کے پاس پہنچ جاتا تھا، یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں نے ہوم سروس دینا شروع نہیں کی تھی۔ میں شہر میں ہونے والے ہر چھوٹے بڑے ادبی، سماجی، ملی، سیاسی جلسوں، میٹنگوں، نشستوں، کانفرنسوں، سیمناروں میں اپنی کتابوں کی دکان لگایا کرتا تھا۔ لوگوں کو اتنا یقین ہوگیا تھا کہ آج جہاں پروگرام ہو رہا ہے وہاں مولانا مرزا عبدالقیوم ندوی ضرور ہوں گے، اس لیے وہ فون پر مجھ سے دریافت کرتے کہ پروگرام شروع ہوا یا نہیں۔ اخبار والے، پولیس والے مجھ سے پوچھتے کہ مہمان کون کون ہے، کس کی تقریر ہوئی بلکہ یہاں تک کہ کس نے کیا کیا بولا اور خاص بات کیا تھی۔ شہر میں میری پہچان ''کتاب والے مولانا'' کے نام سے ہوگئی۔

ابتداء میں Mobile Book Service کے نام سے دکان چلاتا تھا۔ کوئی مستقل دکان نہیں تھی بس Call me میرا طریقہ کار تھا۔ لوگ مجھے موبائل پر فون کرتے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب موبائل پر بات کرنا ہے تو ایک منٹ کے لیے آٹھ (8) روپے لگتے تھے۔ 2006 میں میں نے Mirza World Book House کے نام سے دکان شروع کی۔ جس دن دکان کا افتتاح تھا یقین کریں تین سو (300) سے زیادہ لوگ موجود تھے۔ یہ دراصل میری پانچ سال کی محنت اور لوگوں سے رابطوں کی بنا پر تھا۔ کئی دنوں تک لوگ دکان کھولنے پر مجھے مبارک باد دیتے رہے۔

ع ح: آپ کے خیال میں کن موضوعات پر کتابیں زیادہ فروخت ہوتی ہیں؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: سماجی، معاشرتی، تاریخی موضوعات پر زیادہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ میں اپنے تجربات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی دکان دار کو یا کتب فروش کو خود پہلے کتابوں کا شوق ہونا چاہیے، وہ خود کتابیں پڑھتا ہو اس کا مطالعہ وسیع ہو اسے ہر موضوع پر تقریباً سو پچاس کتابوں کے نام معلوم ہوں یا اس نے وہ کتابیں پڑھی ہوں یا ان کے بارے میں جانتا ہو۔ کتابیں لوگ خریدتے نہیں بلکہ آپ کو ایک سیلز مین کی طرح کتابوں کی مارکیٹنگ کرنی ہوگی، اس کی خوبیاں کچھ اس انداز سے بیان کرنی ہوں گی کہ وہ کتاب خریدنے پر مجبور ہو جائے یا وہ آپ کی دکان پر اپنی مطلوبہ کتابوں کی لسٹ لے کر آئے اور وہ کتابیں آپ کے پاس نہ ہوں تو آپ اسے واپس نہ جانے دیں بلکہ اس کی مطلوبہ فہرست سے ملتی جلتی کتابیں اسے دکھائیں۔

ع ح: کیا یہ بات درست ہے کہ اردو میں سب سے زیادہ کاروبار مذہبی کتابوں سے ہی ہوتا ہے۔؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ آج بھی ملک میں زیادہ تر مذہبی کتابیں ہی فروخت ہوتی ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول تو یہ کہ مسلمانوں کی آبادی کسی نہ کسی مکتب فکر سے منسلک ہے او رسال بھر ملک میں جلسے، جلوس، اجتماعات منعقد ہوتے رہتے ہیں جہاں مقررین و واعظین اپنے وعظ و بیان میں اپنے اپنے مسلک و مکتب فکر کی کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں، سامعین کو کتابوں کی اہمیت یا مصنف کے بارے میں بتاتے ہیں جس سے کہ ان کے اندر کتاب پڑھنے یا خریدنے کا شوق و جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے مذہبی کتابیں زیادہ فروخت

ہوتی ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں اکثریت چند کتابوں پر ہی قناعت کرتے ہیں یا اپنے اپنے مسلک و مکتب فکر کے مصنفین کی کتابیں خریدتے و پڑھتے ہیں۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ادبی کتابیں زیادہ کیوں نہیں فروخت ہوتی ہیں تو اس کی میری نظر میں چند وجوہات ہیں۔ ادبی کتابوں کو ہم نے بہت محدود کر دیا ہے، ادبی کتابوں کے خریدنے اور پڑھنے کا رجحان صرف ضرورت کے تحت کیا جا رہا ہے اور وہ ضرورت یہ ہے کہ صرف امتحانات کی حد تک ہی ان کتابوں سے مدد لی جاتی ہے۔ حال یہ ہے کہ جو کتابیں کالج و یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں طلبا کتابیں نہ پڑھتے ہوئے نوٹس، گائیڈ جیسی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ ادب نما، شعور فن، تنقیدی زاویے جیسی کتابوں کو پڑھ کر بی اے، ایم اے اور نیٹ، سیٹ کے امتحانات دیے جا رہے ہیں۔ اصل کتابوں سے رجوع کا رجحان بہت کم ہو گیا ہے۔

ع ح: موجودہ دور میں ناشرین کتب اور تاجر حضرات کو کیا مشکلات پیش آ رہی ہیں؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: موجودہ دور میں ناشرین کتب اور تاجر حضرات کو جو پریشانیاں لاحق ہیں، یقیناً وہ تشویش کا باعث ہیں۔ کاغذ کی گرانی نے ناشرین کی کمر توڑ دی ہے۔ قیمتوں میں اضافہ کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

ناشرین حضرات، تاجروں اور عام لوگوں میں فرق نہیں کر رہے ہیں، جس رعایت پر وہ کتابیں تاجروں کو دیتے ہیں اسی رعایت پر عام لوگوں کو بھی دے رہے ہیں۔ دونوں میں کوئی تال میل نہیں ہے۔ دونوں کے اپنے اپنے مسائل ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ دونوں موجودہ کاروباری نظام سے دور ہیں۔ انگریزی اور ہندی کے بڑے ناشرین اور تاجرین میں ایک طرح کا تال میل ہے۔ بڑے بڑے ناشرین عام گاہک کو کتاب نہیں دیتے ہیں۔ انھوں نے ملک بھر میں ریاستی سطح پر یا بڑے بڑے شہروں میں اپنی کتابوں کی ایجنسیاں دے رکھی ہیں۔ اگر کوئی عام آدمی یا چھوٹے تاجر حضرات ان سے براہ راست کتابیں منگواتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ فلاں تاجر کو ہم نے اپنی کتابوں کی ایجنسی دے رکھی ہے، آپ ان سے خریدیں۔ جبکہ اردو ناشرین و تاجرین میں اس طرح کا کوئی تال میل نظر نہیں آتا ہے۔ اس میں نقصان دونوں کا بھی ہے۔

اس سلسلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اردو کے ناشرین و تاجرین یہ طے کر لیں کہ ہم انگریزی اور ہندی ناشرین کی طرح کام کریں گے، جس طرح وہ اپنی ایجنسیاں دیتے ہیں ہم بھی دیں گے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ناشرین ایک ریاست میں یا ایک ضلع میں کسی ایک دوکاندار ہی کو اپنی ایجنسی دیتے ہیں تو ان سے کاروبار کرنے میں آسانی ہوگی۔ تاجر حضرات کا یہ فائدہ ہوگا کہ انہیں سب کی کتابیں اسٹاک رکھنے کی ضرورت نہیں رہے گی، وہ تمام ناشرین کی کتابیں رکھنے کی بجائے آپسی تال میل کے تحت جیسے آرڈر آئیں گے وہ شہر کی متعلقہ ایجنسی سے کتاب منگوا کر گاہک کو دے سکیں گے۔

ع ح: کتابوں کے تئیں بیداری پیدا کرنے سے متعلق آپ مختلف پروگراموں کا انعقاد کرتے رہے ہیں؟ ہمیں یہ بتائیں کہ ان پروگراموں سے کتنے فائدے ہوئے؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: کتابوں کے تئیں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے جو طریقہ کار میں نے اپنایا ہے وہ بالکل انوکھا اور اپنی نوعیت کا پہلا علمی تجربہ ہے۔ میں نے شہر کے مختلف اسکولوں میں طلباء کے درمیان مفت 'گلک' (وہ ڈبہ جس میں بچے پیسے جمع کرتے ہیں) Piggy Bank تقسیم کیے، اس کا طریقہ کار یہ رہتا ہے کہ میں اسکول چلا جاتا ہوں تمام طلباء کو جمع کر دیا جاتا ہے۔ ان کے سامنے کتابوں کی اہمیت، مطالعہ کے فائدے اور زندگی میں بچت کیسے کی جاتی ہے اس پر شہر کی کسی علمی و مشہور شخصیت کو بات کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ تقریر کے بعد وہ 'گلک' بچوں میں تقسیم کر دی جاتی ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ روزانہ جو پیسے آپ کو جیب خرچ کے لیے والدین دیتے ہیں ان میں سے کچھ نہ کچھ روزانہ 'گلک' میں ایک ماہ تک جمع کرنا ہے۔ ایک مہینے کے بعد آپ کے اسکول میں کتابوں کی نمائش لگے گی اس وقت اس میں جمع رقم کتابیں خریدنے کے کام آئے گی۔

یقین جانیے میرا یہ تجربہ اتنا کامیاب رہا کہ بچوں نے 'گلک' میں سو روپے، دو سو روپے جمع کر لیے تھے جس کی انھوں نے کتابیں خریدیں۔ اس طرح میں نے اورنگ آباد کے مختلف اسکولوں میں 37000 'گلکیں' تقسیم کی۔

ع ح: نئی نسل میں مطالعے کا شوق کس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: دیکھیے موجودہ دور مارکیٹنگ کا دور ہے، ہر چیز تیزی سے بدل رہی ہے۔ ''جو نظر آتا ہے وہی بکتا ہے'' لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ کتابوں کی دوکانوں پر جا کر کتابیں دیکھیں اور پھر خریدیں۔ آج اسکولوں و کالجوں میں مطالعے کا ذوق تقریباً ختم ہو گیا ہے، طلباء پر درسی کتابوں کا اتنا بوجھ ہے کہ ان کے پاس غیر درسی کتابیں پڑھنے کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ اسکول انتظامیہ اور اساتذہ کے تعاون سے اسکولوں میں ایسے پروگرام منعقد کیے جائیں جس سے طلبا میں غیر درسی کتابیں پڑھنے کا رجحان پیدا ہو۔ دوسرے یہ کہ موجودہ نسل تیزی کے ساتھ سوشل میڈیا کی زد میں آ رہی ہیں، پہلے گھروں میں کتابیں پڑھنے پڑھانے کا ماحول تھا، گھر کے بڑے بزرگ، والدین کتابیں خود پڑھتے تھے جن کو دیکھ کر گھر کے چھوٹے بچے بھی کتابیں پڑھنے کی کوشش کرتے تھے، آج تقریباً گھروں سے وہ ماحول ختم ہو گیا ہے۔ نہ گھروں میں ماحول ہے اور نہ

گفتگو

اسکولوں میں اساتذہ کتابیں پڑھتے نظر آتے ہیں، اکثریت موبائل کے عشق اور سوشل میڈیا کی زلف گرہ گیر کی اسیر نظر آتی ہے۔ آخر بچوں میں پڑھنے کا شوق کیسے پیدا ہوگا۔ گھر اور اسکول میں ہمیں ویسا ماحول فراہم کرنا ہوگا تبھی ہم نئی نسل کو کتابوں سے جوڑ سکتے ہیں۔ خود پسندی پر محمول نہ فرمائیں تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ میں نے اپنی دوکان کے توسط سے ادبی اور نصابی کتابوں کی بڑی تعداد قارئین سے متعارف کروائی ہے۔ مخلصین تو یہ کہہ کر میرا حوصلہ بڑھاتے ہیں کہ ادبی کتابیں اتنی بڑی تعداد میں کسی اسٹال پر کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں۔ مجھے یہ کہنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ آج کئی گھروں میں چھوٹی چھوٹی لائبریاں قائم ہوگئی ہیں۔ لیکن بہر حال اس میں قارئین کا تعاون بھی اشد ضروری ہے۔

ع ح: کتاب میلے سے اردو زبان و ادب کا فروغ ہوتا ہے؟ آپ کیا کہتے ہیں؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: جی بالکل درست، کتاب میلوں سے اردو زبان و ادب کو فروغ ملتا ہے، لوگوں کو بیک وقت، ایک ہی مقام پر لاکھوں کتابیں نظر آتی ہیں، لوگ آتے ہیں، شوق سے کتابیں خریدتے ہیں، طلبا اساتذہ کے علاوہ بھی لوگ آتے ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ کتابوں کے مستقبل اور اردو زبان و ادب کے وجود و بقاء کے لیے کتاب میلے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا اپنا تجربہ ہے کہ صرف کتاب میلے منعقد کرنے سے کام نہیں چلے گا، بلکہ کتاب میلوں کو کامیاب بنانے کے لیے، مقامی ادبی انجمنوں، اردو اسکولوں، کالجوں کے ساتھ جو لوگ اردو سے وابستہ ہیں یا جن کی معاش اردو سے جڑی ہوئی ہے۔ ان پر سخت محنت کرنی ہوگی، تبھی جا کر کتاب میلے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ میں یہاں یہ بات بھی بتا تا چلوں کہ 2014 میں اورنگ آباد میں جو کتاب میلہ ہوا تھا میں اس کا کوآرڈینیٹر تھا، جس میں صرف نو دن میں ایک کروڑ روپے سے زائد کی کتابیں فروخت ہوئی تھیں، جو ایک ریکارڈ ہے۔ اس کے لیے اورنگ آباد کی تنظیموں، جماعتوں اور اردو سے محبت کرنے والوں نے مسلسل دو ماہ تک محنت کی تھی۔

ع ح: اسکول کی سطح پر بچوں کو کس طرح کتابوں کی جانب مائل کیا جا سکتا ہے؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: بہت آسان ہے، بچے اسکول میں پڑھنے، لکھنے اور سیکھنے کے لیے ہی آتے ہیں، اس لیے کتابیں کیسے پڑھی جاتی ہیں، کیا، کب اور کیسے پڑھنا چاہیے یہ بھی انھیں سکھنا ہوگا۔ بچوں کو غیر درسی کتابوں کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے اس طرف ہماری توجہ بہت کم ہے۔ اس کے لیے میرا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ میں بین المدارس، تقریری، تحریری مقابلے منعقد کرتا ہوں، وقتاً فوقتاً سیرت، تاریخی و مختلف شخصیات کی زندگی پر لکھی کتابوں میں سے سوالات کا انتخاب کر کے کوئز مقابلے کا انعقاد کیا جاتا ہے، جن کتابوں میں سے سوالات لیے جاتے ہیں طلباء کو ان کتابوں کو خریدنا لازمی ہوتا ہے۔ تاکہ وہ کتابیں پڑھ کر جوابات دیں سکے۔ ان پروگراموں سے بہت فائدہ ہوتا ہے، طلباء میں غیر درسی کتابوں کے تئیں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح میں ہر دو چار مہینے میں شہر کے اسکولوں میں کتابوں کا اسٹال لگاتا ہوں، جہاں طلبا کے معیار و استعداد کی کتابیں رکھی جاتی ہیں، جیسے قومی کونسل کی مطبوعات، مکتبہ جامعہ کا بچوں کا ادب و دیگر اداروں کی کتابیں۔ اس سے بہت فائدہ ہوتا ہے، بچوں میں خرید کر کتابیں پڑھنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔

ع ح: موجودہ دور میں کتابوں کا کاروبار کس حد تک منافع بخش ہے؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: کافی حد تک فائدہ مند ہے، آج جدید تکنیک کی وجہ سے کتابوں کی اشاعت میں آسانی ہوگئی ہے، پہلے کے مقابلہ میں خرچ بھی کم آرہا ہے۔ کتابیں بڑی دیدہ زیب چھپ رہی ہے اور پھر یہ کتابوں کا کاروبار ہے، روزانہ کی ضرورت کی چیز نہیں ہے، روز بروز ناشرین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، شہروں میں بھی نئی نئی کتابوں کی دوکانیں کھل رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صحیح ڈھنگ سے مارکیٹنگ کی جائے، نئے نئے موضوعات پر کتابیں شائع کی جائیں تو یہ کاروبار مزید منافع بخش ہو سکتا ہے۔

بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو کتابوں کا سب سے زیادہ مارکیٹ جنوبی ہند میں ہے، جس میں مہاراشٹر، آندھرا، کرناٹک کے علاقے اردو کتابوں کے لیے بڑے زرخیز ہیں۔ جنوب میں اردو کے فروغ کے لیے بے لوث اور ان تھک کوششیں جاری ہیں۔ برخلاف اس کے شمال میں اردو کتابوں کا کاروبار کسی حد تک مذہبی کتابوں پر چل رہا ہے۔ برامت مانیے شمال میں اس کے لیے زوردار کوشش نظر نہیں آتی۔

ع ح: نئی نسل کی اردو سے بڑھتی دوری پر آپ کیا کہیں گے؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: نئی نسل کی دوری صرف اردو زبان کی حد تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ مسئلہ ہر علاقائی زبان کو درپیش ہے۔ مراٹھی، ہندی، گجراتی، تمل و دیگر علاقائی زبانوں کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن مہاراشٹر میں آج لاکھوں بچے اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں، یہاں اردو کے فروغ کے لیے حکومت کا بھی تعاون حاصل ہے، پورے ملک میں مہاراشٹر واحد ایسی ریاست ہے جہاں سب سے زیادہ اردو میڈیم کے پرائمری اسکول، ہائی اسکول اور جونیئر کالجز ہیں۔ اگر چہ کہ یہاں بھی اب عام مسلمان انگریزی اسکولوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوا رہے ہیں، مگر ایک بات قابل ذکر ہے کہ وہ ایک سبجکٹ اردو کا ضرور رکھتے ہیں، ساتھ ہی یہاں مسجدوں میں مکتب کا نظام بہت اچھا ہے، جہاں بچوں کو تعلیم اردو میں دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے مہاراشٹر کے 80% بچے اردو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں۔

ع ح: بچوں کے رسائل کو اسکولوں اور بچوں تک پہنچانے کے لیے کون سی حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: ایک منظم تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے تو بچوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے لیے ان کے معیار کا کوئی اردو رسالہ

شائع ہوتا ہے۔ جسے پڑھ کر انہیں اپنے نصاب تعلیم اور آئندہ زندگی میں فائدہ ہوگا۔ رسالہ دیدہ زیب ہونا چاہیے، قیمت بھی کم ہو، مواد اور معلومات کا معیار ان کے نصاب سے مناسبت رکھتا ہو تو یقین جانیے بچے خوشی خوشی ان رسائل و جرائد کو خریدیں گے۔ صرف رسالے چھاپ کر رکھ دینے سے یا چند کاپیاں اسکول کے پرنسپل کو بھجوانے سے کام نہیں چلے گا، اسی طرح کتابیں اور رسائل دوکانوں پر رکھنے سے بھی کام نہیں چلے گا۔ اس کے لیے ہمیں طلبا کے بیچ جانا ہوگا۔ ان پر رسالوں کی اہمیت واضح کرنی ہوگی، ان سے بھی اس میں لکھنے کے لیے ترغیب دلانی ہوگی۔

کونسل سے شائع ہونے والا 'ماہنامہ بچوں کی دنیا' کو میں نے ایک سال کے مختصر عرصہ میں مہاراشٹر کے ہر گاؤں و شہر میں پہنچا دیا تھا، اس کے لیے میں ایک ایک اسکول گیا، کئی بار اسکول میں رسالہ کا تعارف کرانے کی اجازت انتظامیہ اور اساتذہ کی طرف سے نہیں ملتی تھی۔ میں چھٹی کے بعد اسکول سے باہر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر آواز لگا کر بچوں میں رسالہ کا تعارف کراتا تھا۔ اسکول انتظامیہ کی اپنی بہت ساری مجبوریاں ہوتی ہیں جس کے سبب وہ اسکول میں مارکیٹنگ کی اجازت نہیں دیتے ہیں اور نہ ہی اسکول میں رسالوں کو بیچنے کی اجازت دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں، میں اسکول کے باہر کینٹین یا چھوٹی موٹی کھانے پینے کی جو دکانیں ہوتی ہیں ان پر رسالہ رکھ جاتا تھا، جہاں سے بچے انٹرول میں رسالہ خرید لیتے تھے۔

ع ح: بچوں کے لیے نکل رہے رسائل کے مزاج اور معیار سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: کافی حد تک مطمئن ہوں، بچوں کے لیے کام کرنا بڑا مشکل کام ہے، خصوصاً جب ان کے لیے لکھنا ہو یا ان سے گفتگو کرنی ہو تو بڑی دقت پیش آتی ہے۔ معیار، مواد اور ایسے مضامین جس سے طلبا میں دلچسپی پیدا ہو ایسے مضامین کی تعداد میں اضافہ ان رسائل کے لیے ضروری ہے، سب سے پہلے تو چھپائی اچھی ہو، کاغذ عمدہ ہو اور قیمت بھی مناسب ہو تو طلبا یقیناً رسائل خریدتے ہیں۔ لیکن ایک بات ضرور ہے کہ 'بچوں کی دنیا' جیسے رسائل شائع کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، جب تک حکومت کی سرپرستی حاصل نہیں ہوتی اس وقت تک معیاری اور دیدہ زیب چھپائی ممکن نہیں۔

ظاہری بات ہے جب مدیران معیار اور چھپائی پر زیادہ دھیان دیں گے تو لاگت میں اضافہ ہوگا جو طلباء کی قوت خرید سے باہر ہوگا۔

ع ح: اردو زبان کے فروغ کے لیے آپ کے پاس کیا تجاویز ہیں؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: اردو عوامی زبان ہے، اسے عوامی سطح پر لانا ہوگا، اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے جو سیمینار منعقد کیے جا رہے ہیں سب سے پہلے ان کی تعداد کم ہونی چاہیے کیونکہ جو اردو کی کانفرنسوں پر سالانہ کروڑوں روپے خرچ ہو رہا ہے اور نتائج کچھ بھی نہیں ہیں۔ ان سیمناروں میں کیا ہوتا ہے؟ کون تقریریں کرتا ہے؟ وہی ہمیشہ ہمیشہ کے چہرے جنہیں سنتے زمانہ ہو گیا اور اب تو زبان و ادب بہت آگے نکل چکے ہیں۔

اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے ہمیں عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اردو زبان کے فروغ کے لیے سب سے بڑی ذمے داری تو ان لوگوں پر عائد ہوتی ہیں جن کی روزی روٹی اردو زبان سے وابستہ ہے، انہیں سامنے آنا ہوگا۔ اردو کو پہلے اپنے گھر سے شروع کرنا ہوگا، بعد میں باہر کے لوگوں سے آپ توقع رکھ سکتے ہیں، آج المیہ یہ ہے کہ 90% وہ لوگ شامل ہیں اردو کی روزی روٹی کھا رہے ہیں اور صورتِ حال یہ ہے کہ ان کے گھروں میں ان کے علاوہ کسی اور کو اردو پڑھنی بھی نہیں آتی ہے۔ وہ اپنی اولادوں کو غیر اردو اسکولوں میں تعلیم دلا رہے ہیں۔

کونسل سے شائع ہونے والا 'ماہنامہ بچوں کی دنیا' کو میں نے ایک سال کے مختصر عرصہ میں مہاراشٹر کے ہر گاؤں و شہر میں پہنچا دیا تھا۔ اس کے لیے میں ایک ایک اسکول گیا، کئی بار اسکول میں رسالہ کا تعارف کرانے کی اجازت انتظامیہ اور اساتذہ کی طرف سے نہیں ملتی تھی۔ میں چھٹی کے بعد اسکول سے باہر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر آواز لگا کر بچوں میں رسالہ کا تعارف کراتا تھا۔ اسکول انتظامیہ کی اپنی بہت ساری مجبوریاں ہوتی ہیں جس کے سبب وہ اسکول میں مارکیٹنگ کی اجازت نہیں دیتے ہیں اور نہ ہی اسکول میں رسالوں کو بیچنے کی اجازت دیتے ہیں۔

چند تجاویزات:

سب سے پہلے ان لوگوں کو جمع کیا جائے جو اردو کے لیے زمینی سطح پر بے لوث کام کر رہے ہیں۔ جن کا مقصد صرف اردو زبان کی نشر و اشاعت اور اس کا استحکام ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف اور ان کے ذریعہ کیے گئے کاموں کو سراہا جائے، انھیں اعزاز و اکرام سے نوازا جائے۔ اردو آج کل VIP ہوتی جا رہی ہے، اسے پھر عوامی بنانا ہوگا۔ ملک کے مختلف حصوں میں چھوٹے چھوٹے علاقائی کتاب میلے منعقد کیے جائیں۔ یہ کہنا کہ بچے پڑھتے نہیں، بچوں پر الزام ہے۔ آپ ایسے مواقع فراہم کیجیے کہ وہ پڑھیں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ پہلے خود پڑھنے کی عادت ڈالیں، گھر، اسکول، کالج میں پڑھنے کا ماحول بنائیں۔ طلبا میں کتابوں کا تعارف، مصنفین کا تعارف، ادیبوں، شاعروں، عظیم شخصیتوں کی آپ بیتیوں کا تذکرہ یا پھر ان کی ولادت یا یوم وفات پر ان کی تخلیقات کا تعارف کرانا، لائبریوں سے یا بازار سے حسب گنجائش کتابیں خریدنے کے لیے انھیں تیار کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے سرپرستوں اور اساتذہ کو میدان عمل میں آنا ہوگا۔ اس سلسلے میں، میں نے ہزاروں کتابیں خصوصاً 'بچوں کی دنیا' کے وہ شمارے جو عظیم شخصیتوں پر شائع ہوئے تھے، جیسے فروری میں مولانا ابوالکلام آزادی کی یوم پیدائش پر شائع شمارہ، اکتوبر مہاتما گاندھی، سرسید، اے پی جے عبدالکلام وغیرہ پر خصوصی شمارے بڑی تعداد میں تقسیم کیے تھے۔

ع ح: ہمارے قارئین کے لیے کوئی پیغام یا مشورہ؟

مرزا عبدالقیوم ندوی: اردو زبان و ادب کے تحفظ و بقا کے لیے نئے قاری کا ہونا ضروری ہے اور یہ پیدا ہوگا نئی نسل سے جو اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں پروان چڑھ رہی ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ مصنفین کی تخلیقات کو، کالم نگاروں کے کالموں کو، ادیبوں کی نگارشات اور شاعروں کی شاعری کو خود ان کے اہل خانہ تک پڑھنے سے قاصر ہیں۔ جب آپ کا ادب، آپ کی شاعری، آپ کے مضامین آپ کے خاندان والوں کو متاثر و متوجہ نہیں کر سکتے ہیں تو آپ دوسروں سے کیسے توقع وابستہ کر سکتے ہیں کہ وہ پڑھیں گے۔؟

آخری بات: میری روح کانپ جاتی ہے جس وقت میں یہ سوچتا ہوں کہ ان کروڑوں کتابوں کا کیا ہوگا، جو ملک کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں یا دوکانوں اور گھروں پر ذخیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ آئندہ جو کتابیں شائع ہوں گی ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ اگر ہم نے آج سے ہی اس کے لیے کوئی ٹھوس لائحہ عمل نہیں بنایا تو ڈر ہے کہ یہ ساری کتابیں، سارے علم کے موتی کہیں ضائع نہ ہو جائیں۔

■

Dr. Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com
Mirza Abdul Qayyam Nadwi
Mirza World Book House, Qaisar Colony
Aurangabad - 431001 (MS)
Mob.:9325203227

سید عابد علی عابد کی ادبی اور صحافتی خدمات

ثمرین

سید عابد علی عابد کی علمی و ادبی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، نقاد، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نگار، فیچر نگار، مترجم کے علاوہ ایک مدیر کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے مختلف رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیے، جن میں رسالہ صحیفہ، دلکش، ہزار داستان، ادبی دنیا، نونہال، گل خندہ، صادق اور زرعی دنیا وغیرہ ہیں۔ مذکورہ رسائل میں سے چند رسائل کی ادارتی مدت صرف کچھ مہینوں کو محیط ہے مگر رسالہ 'صحیفہ' اور 'ہزار داستان' کی ادارتی مدت نے طویل عرصہ طے کیا ہے۔ رسالہ 'صحیفہ' عابد علی عابد کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ رسالہ مجلس ترقی ادب سے شائع ہوا۔ حکومت مغربی پاکستان نے اردو ادب کی ترقی و ترویج کے لیے ایک لاکھ روپے کے ابتدائی سرمائے سے 1950 میں بمقام لاہور میں ایک ادبی ادارہ قائم کیا اور اس کا نام 'مجلس ترجمہ' طے پایا۔ اس ادارے کا مقصد یہ تھا کہ غیر زبانوں کی علمی و ادبی کتابوں کے اردو ترجمے شائع کیے جائیں۔ یہ ایک ایسا ادارہ تھا کہ جہاں اپنے زمانے کے ممتاز و معروف ادیب یکجا تھے۔ جن میں سید امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک، خلیفہ عبدالحکیم، کلب علی خاں فائق، حمید احمد خاں اور سید نذیر نیازی کسی نہ کسی حیثیت سے اس ادارہ سے وابستہ رہے۔ اس ادارے سے عابد علی عابد کا تعلق بہت پرانا تھا۔ جب وہ دلی کالج میں پرنسپل تھے تبھی سے وہ مجلس ترجمہ کے رکن تھے۔ پھر مدیر صحیفہ کی حیثیت سے 1962 میں باقاعدہ ملازمت کا آغاز ہوا۔ جولائی 1954 میں 'مجلس ترجمہ' کا نام بدل کر 'مجلس ترقی ادب' کر دیا گیا۔

مجلس ترقی ادب سے عابد علی عابد کا تعلق 1950 تا 1971 رہا۔ اس دوران مجلس کی کارگزاریوں میں انھوں نے اہم کارنامے انجام دیے۔ ترتیب و تالیفات، مقدمہ و حواشی کے علاوہ اراکین مجلس کو اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے اور سب سے اہم کارنامہ مجلس ترقی ادب سے رسالہ 'صحیفہ' کا اجرا تھا۔ عابد علی عابد نے مجلس کے ناظم امتیاز علی تاج کو رسالے کے بنیادی خطوط اور معیار سے متعلق تجاویز پیش کیں جن کو ناظم نے قبول کر لیا اور عابد علی عابد کو ہی اس رسالے کا مدیر مقرر کر دیا۔ یہ رسالہ ابتدا میں سہ ماہی تھا، پھر اراکین کی ایما پر 6 ستمبر 1959 میں اسے دو ماہی کر دیا گیا مگر بعد میں یہ چھ ماہی ہوگیا۔ یہ رسالہ 1957 میں جاری ہوا تھا اور 1967 تک عابد علی عابد اس کے مدیر رہے۔

صحیفہ میں مجلس ترقی ادب کی کارگزاری، شاعری، تبصرات، مقالات وغیرہ شائع ہوا کرتے تھے۔ 1964 میں مجلس کی ایک اہم میٹنگ میں عابد علی عابد کو شعبہ تصنیف و تالیف میں اہم فرائض سونپے گئے جو حسب ذیل ہیں:

1۔ مسودات موصولہ سے متعلق تحریری یا زبانی رائے دینا،
2۔ مسودات موصولہ پر نظر ثانی کرنا،
3۔ ناظم کی ایما پر کسی کتاب پر مقدمہ لکھنا،
4۔ فارسی مسودات پر نظر ثانی کرنا،
5۔ کسی پروف ریڈر یا کسی اور شخص کی تربیت کرنا کہ عروضی اور علم شعر سے آگاہ ہو کر کام کے تسلسل میں معاون ہو
6۔ صحیفہ کی ادرات۔

مذکورہ بالا تمام ذمے داریاں عابد علی عابد بخوبی نبھاتے رہے۔ صحیفہ کا پہلا شمارہ جون 1957 میں شائع ہوا۔ سجاد رضوی اس کے نائب مدیر تھے، پھر نائب مدیر وقتاً فوقتاً بدلتے رہے لیکن مدیر کے عہدہ پر عابد علی عابد ہی جلوہ افروز رہے۔ شمارہ نمبر 13 کے بعد یہ رسالہ دوبارہ سہ ماہی کر دیا گیا۔ رسالہ میں چونکہ تحقیقی مضامین و مقالات بہت کم شائع ہوا کرتے تھے لہٰذا اس بات پر غور کیا گیا اور کچھ وقفہ کے بعد انتظامیہ کمیٹی نے رسالے کے مزاج کو تحقیقی بنانے کی خواہش ظاہر کی اور یہ تبدیلی رسالہ کے لیے مفید ثابت ہوئی کیونکہ نئی تخلیقات کا تعارف دوسرے ممالک کے رسائل و جرائد کے ذریعہ ہو رہا تھا۔ عابد علی عابد نے بھی 15 ویں شمارہ سے اس میں اہم تبدیلیاں کیں۔ صحیفہ کے مزاج کو تخلیقی سے زیادہ تحقیقی بنا دیا۔ 20 ویں شمارہ سے یہ رسالہ خالص تحقیقی انداز کا حامل ہوگیا اور صحیفہ کے مستقل عنوانات کی صورت اس طرح ابھر کر سامنے آئی:

1۔ جمع متکلم۔ اداریہ،
2۔ انجمن خیالات۔ مقالات،
3۔ مجلس ترقی ادب کی کارگزاری۔ تازہ ترین مطبوعات پر تبصرہ،
4۔ رفتار ادب۔ گزشتہ سہ ماہی کی تازہ مطبوعات پر تبصرہ،
5۔ کسب نور۔ کسی صنف ادب میں سے ایک کتاب سے متعلق مختصر گفتگو اور چند اقتباسات پر اظہار خیال (یہ کتاب مجلس کی مطبوعات یا تالیفات میں سے ہوتی تھی)۔
6۔ مشاہیر کے بارے میں
7۔ مقالہ نما۔

کسی بھی رسالہ کے اداریہ کا کوئی عنوان قائم نہیں ہوتا لیکن رسالہ صحیفہ میں اس سے پرہیز کیا گیا اور اداریہ کو جمع متکلم کا نام دیا گیا کیونکہ یہ رسالہ کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ چند افراد کے زیر سایہ نکلتا تھا اس لیے عابد علی عابد نے اس کا نام جمع متکلم رکھا جس میں سب کی رائے اور مشوروں کو مدنظر رکھ کر اداریہ تحریر کیا جاتا تھا۔ چند شماروں میں واحد متکلم کا صیغہ بھی استعمال کیا گیا ہے اور اس کی ایک وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ آخری وقت میں عابد علی عابد کی مجلس ترقی ادب کے کارکنان سے رسہ کشی اور مخالفت چل رہی تھی جس کے باعث صحیفہ کے اداریے کے لیے کارکنان کی نشست نہیں ہو سکی ہوگی اور اس طرح اداریہ مدیر کی ذمہ داری میں آ گیا ہوگا۔ کیونکہ مجلس ترقی ادب کے ممبران کو عابد علی عابد کی بہت سی باتوں پر اعتراض تھا یہ جوان کی گھریلو اور ادبی زندگی دونوں سے متعلق تھا۔

عابد علی عابد کی ادارت میں جب سے صحیفہ جاری ہوا تھا مجلس ترقی ادب لاہور نے تب سے اُن کی آخری ادارت کے شمارہ تک ان کے سر بہت سے کام کیے تھے جن میں یہ بھی تحریر کیا گیا تھا کہ نئے لوگوں کو جگہ دینے سے بہتر ہے کہ مدیر خود اس کے لیے تخلیقات پیش کرے اور یہ بھی کہا گیا کہ مدیر کا کام صرف مضامین موصولہ میں سے کس مضمون کو پہلے اور کس مضمون کو بعد میں شائع کرنا ہے، یہ نہ ہو بلکہ مدیر اس کے لیے بہت سی تخلیقات پیش کرے۔ اس کے علاوہ عابد علی عابد کے ذمے مجلس کی کتابوں پر تبصرہ بھی تھا۔ مجلس سے تین ماہ کے اندر اندر جو کوئی بھی کتاب شائع ہوئی ہو یا گزشتہ چھ ماہ کی کتابوں پر تبصرہ عابد علی عابد کو ہی کرنا ہوتا تھا۔ یہی نہیں، جب عابد علی عابد علالت کے باعث گھر پر رہ کر ہی مجلس کا کام انجام دے رہے تھے تب بھی ان سے 2 کتابوں کی شرط اور رکھی گئی، کہ وہ مجلس کے لیے دو کتابیں لکھا کریں گے۔ اس کے برعکس جب وحید قریشی صحیفہ کے مدیر مقرر ہوئے تو ان کے ساتھ یہ تمام پابندیاں نہیں رکھی گئی تھیں۔ وحید قریشی اداریہ کے علاوہ کوئی مقالہ، غزل یا تبصرہ نہیں لکھتے تھے۔ وحید قریشی 1967 میں رسالے کے اڈیٹر بنے اور انھوں نے اس میں کچھ تبدیلیاں کیں جن میں اداریہ کو پہلے کی بہ نسبت بہت مختصر کر دیا گیا۔ عابد علی عابد کی ادارتی مدت میں مجلس ترقی ادب اور عابد کے مشوروں سے اداریہ تحریر کیا جاتا تھا جس کو صیغہ جمع متکلم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور بعد میں اسے اداریہ کا نام دے دیا گیا جو وحید قریشی تحریر کرتے تھے۔ اداریہ میں انھوں نے گزشتہ نمبر اور پیش نظر شمارہ پر زور قلم صرف کیا ہے جس میں مضامین اور ان کے مصنفین کا تعارف ہے اس کے علاوہ آنے والے شمارے کے سلسلے میں بھی گفتگو کی گئی ہے کسی خاص موضوع پر یا مجلس کے منشورات پر یا پھر کسی ادبی اصناف سے متعلق اداریہ میں کوئی بحث نہیں کی گئی جبکہ عابد علی عابد کی ادارت میں عابد نے مختلف اصناف تنقید، شاعری، اسلوب، افسانہ اور ڈراما وغیرہ سے اپنے اداریے میں مکمل اور جامع بحث کی ہے۔ اپریل 1969 کا پرچہ ان کی نگرانی میں آخری پرچہ تھا۔ اس رسالے کے لیے عابد صاحب نے جو کچھ کیا اس کے لیے سید امتیاز علی تاج کے یہ الفاظ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ :

''رسالہ کا مزاج اس کی تربیت اور اس کی زیبائش سب انھیں کے حسن ذوق کا نتیجہ تھی۔ وہ نہ صرف صحیفہ کے بانیوں میں سے تھے بلکہ صحیفہ اور عابد ایک ہی شے کے دو نام تھے''۔ (رسالہ تخلیق عابد علی عابد نمبر، جلد 2، شمارہ 2 اور 3)

رسالہ صحیفہ کے علاوہ عابد علی عابد نے دوسرے رسائل کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ حکیم احمد شجاع نے جولائی 1922 میں رسالہ 'ہزار داستان' جاری کیا، اس کے جاری کرنے کے دو سال بعد حکیم صاحب کو لیجسلیٹو میں ملازمت مل گئی۔ انھوں نے 'نونہال' اور 'ہزار داستان' دونوں پرچے میاں محمد اسماعیل نعیم کے حوالے کر دیے جنھوں نے سید عابد علی عابد اور ہادی حسین قریشی صدیقی کو مدیر مقرر کیا۔ عابد علی عابد اس رسالے کے عملے میں 1923 سے 1926 تک رہے۔

عابد رسالہ 'دلکش' کے بھی مدیر رہے۔ اس کی مجلس ادارت میں نذیر احمد یزدانی، نازش رضوی اور سعادت حسن بھی تھے۔ 'معارف' نے جولائی 1927 کی اشاعت میں دلکش پر یوں تبصرہ کیا ہے:

''صرف ادبی پھولوں کا گلدستہ ہے۔ سید عابد علی عابد بی اے ایل ایل بی کی ادارت میں لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ زیادہ شعر و شاعری اس کا موضوع ہے''۔

بی۔ اے کے بعد عابد علی عابد 'دلکش' اور 'ہزار داستان' کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے تھے۔ 'ہزار داستان' اردو کا پہلا رسالہ تھا جس میں خالص اردو افسانوی ادب کی اشاعت کا التزام کیا گیا تھا۔ عابد نے بھی اسی کے لیے کئی افسانے تخلیق کیے جن کو بعد میں جمع کرکے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ ہزار داستان کی ادارت کے زمانے میں عابد نے جو نظمیں اور غزلیں کہی تھیں وہ غنائیہ رنگ کی تھیں اور افسانے بھی رومانی انداز کے حامل تھے۔ یہ تخلیقات خالص رومانی فضا سے لبریز تھیں جن میں عابد کا رومانی انداز نمایاں ہے۔ ہر غزل کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس میں رومانی اثر موجود ہے۔ افسانہ وشاعری کے علاوہ عابد علی عابد نے ایڈیٹری کے زمانے میں مختلف کتابوں پر تبصرے بھی کیے، یہ تبصرے اعلی پایے کے ہوتے تھے۔ بی اے کے زمانے کے تبصروں میں عابد کی تحریر میں زیادہ پختگی نہیں تھی جس کی جھلک کہیں کہیں نظر آتی ہے لیکن جب انھوں نے رسالہ 'صحیفہ' جاری کیا تو اس میں ان کے تبصرے، مضامین اور غزلیں وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں اور انداز بیان جداگانہ ہے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی نے 1929 میں لاہور سے 'ادبی دنیا' جاری کیا۔ اس رسالے کی مجلس ادارت میں بہت سے نائب مدیر تھے۔ عابد علی عابد بھی اس کے مدیر رہے۔ انھوں نے ادبی دنیا کی رنگین تصویروں پر خوبصورت نظمیں لکھیں۔ اس کے علاوہ موصوف نے ادبی دنیا کے افسانوں پر بھی خصوصی توجہ دی۔ 'تنقید شعری' کے عنوان سے ایک شعری تشریح بھی 'ادبی دنیا' میں چھپتی رہی جس میں اکثر تشریحات عابد علی عابد نے کی ہیں۔ ادبی دنیا میں ڈرامے بھی شائع ہوتے تھے جن میں بہت سے ڈرامے ان کی تخلیق یا ترجمہ شدہ ہیں۔

1930 میں عابد علی عابد دیال سنگھ کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ اکتوبر 1933 سے مئی 1939 تک وہ دیال سنگھ کالج میگزین کے نگراں و مدیر رہے۔ اس کے علاوہ اردو میں افسانوی ادب کے فروغ کے لیے 1934 سے لاہور میں ماہنامہ 'افسانہ' کا اجرا کیا گیا۔ جس میں طبع زاد افسانے، یوروپین اور قدیم زبانوں کے شاہکار افسانوں کے تراجم، ڈرامے اور فن افسانہ پر تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے کے مدیران اعزازی کے اسمائے گرامی میں ادبی لحاظ سے ممتاز نام عابد علی عابد کا ہے۔ انھوں نے کم وبیش پچیس سال تک ادبی رسائل و جرائد کی ادارت کی۔ 'دور جدید' اور 'زرعی دنیا' کے بھی مدیر رہے 1954 میں روزنامہ ملت میں فکاہیہ کالم بھی لکھتے رہے۔ رسائل کی ادارت کے اعتبار سے عابد علی عابد کی ادارتی خدمات کو دو واضح ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور کم و بیش 16 برسوں پر محیط ہے 1923 سے 1939 تک ('ہزار داستان' سے 'دیال سنگھ کالج میگزین' کی نگرانی اور ادارت تک) اور دوسرا دور 1956 سے 'صادق' کی ادارت سے 'صحیفہ' کی ادارت تک ہے۔ عابد علی عابد نے 1956 میں لاہور سے پندرہ روزہ 'صادق' جاری کیا۔ اس کے صرف دو پرچے ہی شائع ہو سکے تھے۔ اس کی ادارتی مجلس میں سید قاسم محمود بھی شریک تھے۔

'گل خنداں' کے نام سے ایک رسالہ مکتبہ گل خنداں نے 1948 میں جاری کیا۔ عابد علی عابد اس کی مجلس ادارت سے 1956 میں وابستہ ہوئے اور 1959 تک اس رسالہ کی ادارت کرتے رہے۔ عابد سے پہلے یہ رسالہ عبدالرؤف اور امین ہاشمی کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کی مجلس ادارت میں عابد کی شمولیت نے انقلاب پیدا کر دیا۔ ضخامت کے اعتبار سے بہت چھوٹے رسالے کے وقیع نمبر شائع ہوئے۔ انقلاب نمبر 1857، ڈراما نمبر، افسانہ نمبر، فنون لطیفہ نمبر، تنقید نمبر، غزل نمبر، لاہور نمبر، لطائف وظرافت نمبر عابد علی عابد کے دور ادارت کی یادگار ہیں۔

رسائل کی ادارت کے علاوہ عابد علی عابد نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے فیچر، ناول اور ڈرامے بھی تحریر کیے، ساتھ ہی ان کی کئی نشری تقاریر کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ریڈیو اسٹیشنوں کے قیام سے ریڈیائی اور نشریاتی ادب کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ عابد نے بھی ریڈیو کے لیے خوب لکھا۔ انھوں نے 4 ناول لکھے اور یہ چاروں ناول ریڈیو کے لیے تحریر کیے گئے تھے اور بعد میں کتابی شکل میں سامنے آئے۔ ناول کے نام یہ ہیں (1) چاندنی (یہ ناول ریڈیو

لاہور سے 'پھر کیا ہوا' کے نام سے نشر ہوتا رہا) (2) شمع (3) دکھ سکھ، اور (4) سہاگ۔ ان ناولوں میں زبان بہت صاف ستھری اور نکھری ہوئی ہے۔ کہیں کوئی لفظ یا جملے کی ادائیگی ذہن پر گراں نہیں گزرتی اور سماعت میں کسی واقعہ کو سمجھنے میں کوئی جھول یا پریشانی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ناول ریڈیو کے لیے لکھے گئے تو اس وجہ سے مصنف پر کچھ پابندیاں عائد کی گئی تھیں جن میں کرداروں کی زیادتی، مشکل پسندی، ابتذال، بے جا منظر نگاری اور طویل مکالمات پر روک ٹوک تھی۔ اگر کردار اور کچھ اپنی زبان سے کہنا بھی چاہتے تو ان پابندیوں کے سبب کہہ نہ سکے اور اسی طرح یہ کتاب سامعین کی فرمائش پر کتابی صورت میں منظر عام پر آئے۔

ڈراما نگاری میں بھی عابد علی عابد نے اپنا ایک اہم مقام حاصل کیا ہے۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھ کر اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ ان کے ڈراموں کے مجموعے 'شہباز خاں'، 'ید بیضا'، 'روپ متی اور باز بہادر' (ریڈیو فیچر) ہیں۔ یہ فیچر بھی لاہور ریڈیو اسٹیشن سے 1940 میں نشر ہوئے۔ 'شہباز خاں' بالاقساط 1950 میں ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوا۔ یہ ہفتہ وار ریڈیو سے نشر ہوتا رہا۔ یہ جاسوسی اور اصلاحی نوعیت کا ہے اس کے علاوہ 'ید بیضا' بھی 17 ڈراموں اور فیچروں کا مجموعہ ہے، یہ بھی ریڈیو اسٹیشن لاہور اور ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوتے تھے۔ ریڈیو ڈرامے میں صوتی اثرات، مکالموں اور بیان کے ذریعہ عمل کا اظہار ہوتا ہے۔ مکالمے اور بیان، کردار اور واقعات کی آرائش کے لیے استعمال نہیں ہوتے۔ وہ جہاں کردار کی شخصیت پر روشنی ڈالتے اور موقع و محل کو بیان کرتے ہیں وہاں ڈرامے کے عمل کو بھی تقویت دیتے ہیں۔ کسی ڈرامے یا فیچر میں ایک سے زائد راوی کی بھی ضرورت ہوسکتی ہے، عابد علی عابد نے اپنے ریڈیو فیچر روپ متی اور باز بہادر میں دو راویوں کو پیش کیا ہے۔

ریڈیو کے علاوہ عابد علی عابد نے ٹی وی کے لیے بھی دو ڈرامے لکھے 'طلسمات' یہ 20 اگست 1965 کو ٹی وی پر پیش کیا گیا اور دوسرا 'زنجیر در زنجیر' ہے جو لاہور ٹی وی سے 15 فروری 1968 کو پیش کیا گیا۔

عابد علی عابد نے ریڈیو کے لیے غنائیے بھی لکھے جن میں 'منزل مراد'، 'مری نوا سے زندہ ہوئے عارف و عامی'، 'جلوس گل و سریر چمن مبارکباد'، 'رنگ حنا'، 'جاوید نامہ' اہم ہیں۔ غنائیہ تخلیق کرنے کے لیے موسیقی اور شاعری سے تخلیقی انداز کے گہرے لگاؤ کی ضرورت ہوتی ہے اور عابد علی عابد میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود تھی اور ان کے غنائیے بھی نشریاتی ادب میں ایک تجربے سے کم نہیں۔

ریڈیو سے تقریروں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا تھا جس کا عنوان تھا 'لکھنے کے ڈھنگ' عابد صاحب نے اس سلسلے میں ادبی رسائل میں لکھنے کے مختلف طریقہ کار بتائے ہیں جو رسائل کے مصنفین کے لیے اہم ہیں۔ اسی ضمن میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ادبی رسائل میں لکھنے کا پہلا اور آخری گر تو یہ ہے کہ آپ لکھنا جانتے ہوں۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تو لاکھ کوشش کریں، نہ لکھ سکیں گے۔ آپ ضرور کہیں گے کہ اگر لکھنے کا یہی گر ہے تو پھر ہم نے تقریر کرنے والے سے سیکھا کیا۔ اس کا جواب ابھی عرض کرتا ہوں۔

عرض یہ ہے کہ لکھا تبھی جا سکتا ہے کہ لکھنے والا پڑھے۔ تو جو گر میں نے بتایا ہے اس کی غایت یہ ہے کہ نو عمر لکھنے والوں کو پڑھنے پر آمادہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ مطالعہ باقاعدہ نہیں کریں گے، گردو پیش کے حالات سے باخبر نہیں رہیں گے، دوسرے اچھے لکھنے والوں کے اسلوب تحریر پر غور نہیں کریں گے تو جو کچھ آپ لکھیں گے وہ رسالوں کو قبول نہیں ہوگا۔ اگر آپ میں لکھنے کا جوہر موجود ہے تو اس کو جلا دینے کی صورت یہ ہے کہ پڑھیے اور جہاں تک ہوسکے پڑھیے۔ تاکہ ادبی رسالے جس قسم کے مضمون کی فرمائش کریں، آپ لکھ کر ان کے حوالے کر سکیں۔"

(صحیفہ، عابد علی عابد نمبر، شمارہ 56، جولائی 1971، ص: 249)

عابد علی عابد نے ریڈیو سے سیکڑوں تحریریں نشر کیں وہ تمام تقاریر ایسی ہیں کہ مواد سے استفادہ کرنے یا اسلوب کا بانکپن دیکھنے کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ تقریر کی طرح عابد علی عابد کے اداریوں کی تحریری خصوصیات بھی ان کو دوسرے ایڈیٹرز سے منفرد کرتی ہیں۔ ان کے اداریوں میں خاص طور پر ہمیں درج ذیل خوبیاں دیکھنے کو ملتی ہیں:

1۔ زبان و بیان پر عبور: اپنا مقصد اور خیالات کے اظہار کے لیے ضروری ہے کہ اداریہ نویس یا مدیر زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہو اور اسے ہر طرح کے اظہار بیان پر عبور حاصل ہو تاکہ وہ پوری روانی اور وضاحت سے اپنے خیالات کو سامعین تک پہنچا سکے۔ لہٰذا عابد علی عابد کو یہ تمام چیزیں حاصل تھیں۔ وہ ایک کامیاب ادیب تھے اور زبان پر انھیں ملکہ حاصل تھا۔

2۔ غور و فکر کی صلاحیت: اداریہ نویس کا فرض صرف یہ نہیں ہے کہ وہ حالات و واقعات کی توضیح کرکے قارئین کو دعوت فکر دے بلکہ کئی پہلو ایسے نمودار ہوتے ہیں کہ جہاں پر مدیر کو آگے بڑھ کر رہنمائی کرنی ہوتی ہے، اس کے لیے اسے اعلیٰ فکری صلاحیتوں کا مالک ہونا چاہیے، کھرے کھوٹے میں تمیز کر سکتا ہو، اسی صورت میں اس کے اداریوں میں جدت، ندرت، انفرادیت اور اثر آفرینی پیدا ہوسکتی ہے۔ عابد علی عابد بھی غور و فکر کی صلاحیت رکھتے تھے، ان کے اداریوں کے مطالعہ سے ان کی گہرائی و گیرائی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ قدم قدم پہ قارئین کے ساتھ ساتھ رسالوں میں لکھنے والے مصنفین کی بھی رہنمائی کرتے تھے اور انھیں دعوت فکر دیتے تھے۔ تنقید جو عابد علی عابد کا اہم وصف ہے اس سے وہ بھرپور استفادہ کرتے تھے۔

3۔ مطالعہ کی وسعت: جو مدیر اداریہ سے متعلق رسالہ کے موضوع پر گہری نظر نہیں رکھتا یا اس کے مطالعہ میں وسعت اور پختگی نہیں ہوتی تو اس کا اداریہ بھی موثر اور دلنشین نہیں ہوسکتا۔ اداریہ جس بھی موضوع پر لکھا گیا ہے اس پر مدیر کو گرفت ہونی چاہیے، تاکہ وہ اپنے خیالات کا اظہار دلائل کے ساتھ واضح کر سکے اور اس میں جاذبیت پیدا ہو۔ عابد علی عابد کے اداریوں میں مطالعہ کی وسعت ہر جگہ نظر آتی ہے وہ خود ایک ہی وقت میں تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں جس کا اندازہ ان کے اداریوں میں پیش کیے گئے دلائل سے کیا جا سکتا ہے۔

4۔ تخلیقی صلاحیت: تخلیقی صلاحیت سے عابد علی عابد نے اپنے اداریوں کو جاندار بنا دیا۔ تخلیقی صلاحیت کے سبب ان کے اداریے موثر اور دلکش ہوتے ہیں۔ مدیر میں تخلیقی صلاحیت جتنی زیادہ ہوتی ہے مدیر اپنی حسین و دلنشین تحریر کے ذریعہ اپنے مقاصد کو بخوبی انجام تک لے جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فنی چابکدستی، مسلسل مطالعہ اور مشق و ریاضت اداریہ نویس کے لیے جو تمام چیزیں لازم ہیں وہ عابد علی عابد کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک کامیاب مدیر تھے اور ان کی صحافتی خدمات سے اردو ادب کو بیش قیمت اداریے، تقاریر، اور تخلیقات ہاتھ آئیں۔

5۔ جمع متکلم کا صیغہ: عابد علی عابد نے اپنے اداریوں میں جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ وہ اپنی رائے کے ساتھ ساتھ مجلس کے منتظمین کو بھی اپنی رائے اور مشوروں میں شامل کرتے تھے لیکن اس میں بھی عابد کے مشوروں کو ہی سراہا جاتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عابد علی عابد ہر موضوع پر گہری نظر رکھتے تھے۔ صحیفہ کے ہر شمارے میں انھوں نے جمع متکلم کا صیغہ استعمال کیا اور چند ہی شمارے ایسے ہیں جس میں انھوں نے واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

مختصر یہ کہ عابد علی عابد اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے رہے اسی لیے نشریاتی اور ریڈیائی ادب میں عابد کی تخلیقات ہمیشہ ممتاز اور قابل تحسین رہیں گی۔

■

Samreen
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

فلم کی زبان اور تکنیک

عبدالقادر صدیقی

فلم کی شروعات بہت دلچسپ رہی ہے جب ساکت تصویروں کی اجتماعی گردش نے بے جان تصاویر میں جان ڈال دی۔ تیزی سے گردش کرتی تصویر نے جامد کو متحرک بنا دیا۔ پردہ پر دوڑتی بھاگتی زندگی کے مناظر نے لوگوں کو محو حیرت کردیا۔اس کا ابتدائی تجربہ جتنا دلچسپ رہا اتنا ہے سراسیمگی پھیلانے والا بھی ثابت ہوا تھا۔ جب پہلی بار کسی کیفے میں پردہ پر فلم (ٹرین روبری) کی نمائش کی گئی تھی تب کیفے میں بیٹھے لوگ اپنی طرف آتی ہوئی ٹرین کو دیکھ کر گھبراہٹ میں کیفے سے باہر نکل پڑے تھے کہ کہیں وہ اس کے نیچے کچل نہ جائیں۔ لومئیرس برادرس(Lumière brothers) کی کامیاب فلمی نمائش،فلموں کے نئے نئے دیوانوں کو اس جادوئی دنیا میں کھینچ لائی۔ جس کے نتیجے میں اس میں نت نئے تجربات کا آغاز ہوا۔سنیما اظہار و خیال کا مطلب بننے سے قبل محض ایک مشینی ریکارڈنگ تھا۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ انسانی زندگی اور سماجی واقعات کے کسی مناظر کی چلتی پھرتی ریکارڈنگ تھی۔ لیکن 1910 سے 1915 کے درمیان جب Enoca Arrden, Quadis, اور برتھ آف اے نیشن (Birth of a Nation) جیسی فلمیں منظر عام پر آئیں تب اس نے فلمی زبان اور تکنک کے ارتقا کی راہ ہموار کردی۔لومئیر برادرس نے جہاں فلموں میں مائز اینڈ سین (یعنی فلمی منظر نامے) کو متعارف کرایا تو میلیز ای ایس، پورٹر اور ڈی۔ ڈبلو گریفتھ نے فلم کی زبان پر اس کی تکنک کو نئے زاویے اور نئے رخ دیے۔انھوں نے فلموں میں علامت اور فلسفہ کو داخل کیا۔ میلز نے اپنے تجربے سے فلم میں ڈبل ایکسپوزر، ملٹی پل ایکسپوزر، فیڈ ان اور چین شاٹ تکنک کی ایجاد کی۔ جس نے فلم شوٹنگ کے تکنک میں انقلابی تحریک کے طور پر رہنمائی کی اور پھر دوسرے ماہرین نے بھی اپنی اپنی طبع آزمائی سے نت نئے فلم شوٹنگ اور فلم بیانیہ تکنیک تکنک پیش کیے۔ فرنچ اور انگریز فلم سازوں کے بعد جب روسی فلم سازی کے جانبازوں نے اس سمت میں قدم بڑھایا تو سنیما تکنیک کو اپنی جولانی طبیعت سے تجربہ گاہ بنا ڈالا۔ سرمایہ داری اور امپریلزم کے مخالف روسی فلم سازوں نے فلم تکنک اور اس کے بیانیہ کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ ایک طرف انگریز فلم ساز جی اے اسمتھ اور جے ولیم سن نے فلموں میں کلوز اپ شاٹ، ٹریکنگ شاٹ اور چین شاٹ کی تکنیک کا متاثر کن استعمال کیا۔تو دوسری طرف روسی فلم ساز اور فلمی نظریہ ساز، سرجی آئزن ٹائنا اور روی آئی پودوکن نے فلمی تکنک اور بیانیہ میں انقلابی تبدیلیاں کی، انھوں نے مختلف اقسام کے مونتاج کی دریافت کی۔ سرجی آئزنشٹن کی زرخیز دماغی اور اس کی کمیونسٹ معاشقی نے فلم آرٹ کو اظہار و خیال اور بیان کا شہ پارہ بنا دیا۔ جس کی مثال اس کی فلمیں بیٹل شپ پوٹمکن اور Ivan the Terrible ہے۔فلم مدر کا ہدایت کار اور آئزنشٹن کا ہم عصر پودوکن نے فلم مونتاز (Montage) کو پانچ زمرے میں تقسیم کیا ہے۔ اس نے الگ الگ شاٹ کے انسلاک پر ریشنل ایڈیٹنگ یا لینکیج linkage کا نظریہ دیا، اس کا ماننا تھا کہ دو یا زائد شاٹس کے رشتہ انسلاک سے معنی پیدا ہوتا ہے اس کے برعکس آئزن ٹائن کا کہنا ہے کہ معنی دو یا زائد شاٹس کے اختلاف سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ دونوں فلم سازوں کا یہ اختلاف ان کی فلموں میں صاف نظر آتا ہے اول الذکر جہاں دو شاٹ کے ربطی انسلاک سے معنی کا ترسیل کرتا ہے وہیں سرجی آئزنشٹن دو مختلف شاٹس سے تیسرا معنی کی ترسیل کرتا ہے۔امریکی فلم ساز ڈی ڈبلو گرفتھ کے بقول فلم میں مونتاج کی دریافت نے ہی فلم کو آرٹ یا فلسفہ کے زمرے میں لاکھڑا کیا ہے اور فوٹوگرافی کی مزید منظم اور مرتب پیشکش نے فلمی زبان کو جنم دیا (کیول جے کمار 2011 ص:171)۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا واقعی فلم کی کوئی زبان ہے؟ جیسا کہ ادب کی زبان ہے یا بول چال کی زبان ہے تو اس تعلق سے جو بحثیں ہوئیں وہ اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ ہاں فلم بھی اپنی زبان رکھتی ہے، لیکن اس کی زبان عربی،اردو،فارسی اور انگریزی زبان کی طرح نہیں۔سنیما کے آغاز سے ہی فلم تھیورسٹ سنیما کی زبان کو بول چال کی زبان یعنی Dilects کے طور پر دیکھتے آئے ہیں اور پیش کرتے آئے ہیں۔ تاہم کسی فلم تھیورسٹس نے 1960 تک ایسی کوئی تھیوری یا ڈسکورس پیش نہیں کیا تھا جس کے تناظر میں فلم کو زبان کی حیثیت حاصل ہو سکے۔ یہ سمیالوجسٹ (ماہرین علم نشانیات) مفکر ہیں جس نے فلم کو زبان کے طور پر دیکھا اور پرکھا۔ مشہور سمیالوجسٹ اور سنیمٹک کرسٹن میٹز (Chiristaian Metz) نے 1960s اور 70s کی دہائی میں مشہور زمانہ ساختیاتی اور پس ساختیاتی مفکر رولاں بارتھ (Roland Barthes) کے حوالے سے اپنے متواتر مضامین میں سنیما کی تکنک اور اس کے ذریعہ اظہار و خیال پر بحث کرتے ہوئے یہ دریافت کرنے کی کوشش کی کہ کیا سنیما ایک زبان ہے یا زبان کا سسٹم ہے۔ اور اپنی اس پر مغز اور ثمر آور بحث کو اس نتیجے پر پہنچایا کہ سنیما کو قواعد سے عاری زبان کے طور پر دیکھا اور سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ یہ مکمل طور پر ایک زبان تو نہیں ہے لیکن یہ زبان کی طرح ہے۔ جیسا کہ وہ فلم لینگویج میں لکھتا ہے کہ ’’ہم فلم اس لیے نہیں سمجھتے ہیں کہ ہمیں فلم کے سسٹم کی سمجھ ہے بلکہ ہم اس کے سسٹم کو اس لیے سمجھ پاتے ہین کیوں کہ ہم فلم کو سمجھ پاتے ہیں۔ دوسرے انداز میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ سنیما کی زبان نہیں ہے جو اتنی خوبصورت کہانی سناتی ہے بلکہ یہ زبان بن جاتی ہے کیوں کہ یہ اتنی خوبصورت کہانی بیان کرتی ہے‘‘۔

سنیما کی زبان بھی فرڈیننڈ دی سوئسر (Ferdinand de Saussure) کے سائن، سگنی فائر اور سگنی فائڈ کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ آرٹ میں معنی نما (نارنگ، کی سگنی فائر کی اردو اصطلاح) اور تصور معنی (نارنگ، کی سگنی فائڈ کی اردو اصطلاح) آرٹ کا اصل مقام ہے۔ لیکن فلم میں معنی نما اور تصور معنی تقریباً ہم شکل (Identical) ہے۔ کیوں کہ تصویر Iconic ہو یعنی جیسا کا تیسا اس میں تصور اور تخیل کی گنجائش تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ اگر ہم لفظ 'کتاب' لکھتے یا کہتے ہیں تو الگ الگ قاری اور سامعین کے ذہن میں الگ الگ کتابوں کا تصور مع اس کے جلد اور حجم کے ابھرے گا جو کتابیں اس نے پڑھی ہوں گی یا دیکھی ہوگی۔ لیکن جب ہم کسی کتاب کی تصویر پیش کرتے ہیں تو ناظرین کے ذہن میں صرف اس کتاب کی تصویر ابھرتی ہے جو اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے۔ اسی لیے سنیما دیکھتے وقت تصور معنی کی زیادہ گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔ سنیما کی اس لسانی خصوصیت کی وجہ سے کہا جاتا ہے: The Sign of a Cinema is a Short circuit sign اور اس کی وجہ سے فلم کی زبان ادق ہو جاتی ہے۔ اس مشکل کو کرسٹن میٹز اس طرح حل کرنے کی کوشش کرتا ہے یعنی فلم کی توضیح اس لیے مشکل ہے کیوں کہ اس کو سمجھانا آسان ہے۔ جس طرح سے ہم زبان کے کسی لفظ کو دوسرے لفظ میں تبدیل کر دیتے ہیں اور ایک لفظ سے کئی لفظ بنتے چلے جاتے ہیں یہ مانا جاتا ہے کہ سنیما کی زبان میں یہ تبدیلی ممکن نہیں اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ اگر کسی فلم میں گلاب کا پھول دکھایا گیا ہو تو وہ بس گلاب کا پھول ہے اور کچھ نہیں۔ ناظرین اس کے الگ الگ معنی نکال سکتے ہیں جیسا کہ پس ساختیات کا تصور ہے کہ معنی آزاد ہے، تاہم فلمی گلاب، گلاب ہی رہے گا کچھ اور نہیں بن سکتا ہے، لیکن لسانیات میں لفظ 'گلاب' گلابی، گلبدن، گلفام، گل بکاؤلی، گلنار، گلزار وغیرہ بن سکتا ہے۔

اردو یا ہندی زبان کے ادب میں جب کوئی لفظ گلاب لکھے گا تو قاری کے تصور میں اپنے اپنے تجربات اور یادداشت کی روشنی میں گلاب کا تصور ابھرے گا۔ وہ گلاب برتھ ڈے پارٹی والا گلاب ہو سکتا ہے، شادی میں ملنے والا گلاب ہو سکتا ہے یا ویلن ٹائن ڈے یا روز ڈے پر ملنے والا گلاب بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب فلم میں کسی گلاب کی عکس بندی کی گئی ہو تو ناظرین کے تصور میں بس وہی خاص گلاب کا تصور ہوگا جو کہ فلمایا گیا ہے۔ اسی طرح افسانہ اور ناول پڑھنے والے قاری دوران مطالعہ واقعات اور حادثات کے مناظر کا اپنے طور پر اپنی تخیلاتی پرواز کے مطابق دیکھ سکتا ہے لیکن ایک فلم ناظر ایسا نہیں کر سکتا کیوں کے یہاں سارا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے ہے جسے ہدایت کار نے اپنے تصور کے مطابق پیش کر رکھا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ فلمی مناظر کو وہی بہتر انداز میں سمجھ سکتا ہے جو زیادہ بہتر انداز میں تصویر کو سمجھ سکتا ہو۔ جو تھیورسٹ فلم کو ایک زبان مانتے ہیں ان میں سے کچھ فلم نظریہ ساز یہ مانتے ہیں کہ فلم کے پاس بھی لسانی سسٹم ہے وہ اس کے لیے دلیل دیتے ہیں کہ فلم کا ایک شاٹ (Shot) فلم کا 'لفظ' ہے اس کا ایک سین (Scene) ادبی زبان کے جملے کی طرح ہے اور اس کا سیکوئنس (Sequence) کسی پیراگراف کی طرح ہے اور پوری فلم ایک کتاب کی طرح ہے۔ ان کا یہ خیال بہت پر کشش اور متوجہ کرنے والا ہے لیکن بہت سے نقاد اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے ہیں جیسا کہ جیمس مینکو (2007) اپنی تصنیف How to read a Film میں مذکورہ دعوے کی قلعی اس طرح کھولتا ہے کہ "ادبی زبان میں حروف تہجی سب سے چھوٹی اکائی ہوتی ہے تو کیا حروف تہجی کا موازنہ شاٹ سے کرنا درست ہوگا؟ وہ کہتا ہے نہیں کیوں کہ فلم کا ایک مکمل شاٹ 24 یا 25 فریم کا مجموعہ ہوتا ہے ایک فریم کا نہیں اگر فرض کر لیں کہ ایک فریم حروف تہجی کی طرح ہے اور شاٹ لفظ کی طرح تب یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ ایک لفظ اپنے آپ میں مکمل ہے لیکن ایک فریم دوسرے فریم کے بغیر مکمل نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ فلم کی زبان کو عام لسانیاتی قواعد اور ضوابط پر نہیں پرکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جب ہم کسی شاٹ کو تکنیکی طور پر فلم کی ایک اکائی مان بھی لیتے ہیں تو یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ کسی شاٹ میں جب کیمرہ پین Pan (کیمرہ کا دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں گھومنا) ہوتا ہے یا ٹریک (کیمرہ کو پٹری نما ٹریک پر آگے کی جانب کھینچنا) ہوتا ہے تب شاٹ ایک سین میں بدل سکتا ہے، اب اس شاٹ کو سنگل شاٹ مانا جائے گا یا ڈبل شاٹ؟ اور جہاں تک سین Scene کا تعلق ہے تو فرانچ تھیٹر نے سین کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ سین دراصل کسی کردار کے اسٹیج پر نمودار ہونے اور اس کے اسٹیج سے غائب ہونے تک کا پورا منظر ایک سین ہے۔ لیکن اس تعریف کا اطلاق فلم پر نہیں کیا جا سکتا اور اگر اس کا اطلاق کیا جائے تو بہت ہی بے ہنگم لگے گا۔ اس ساری بحث کا مقصد یہی ہے کہ آخر فلم کی سب سے چھوٹی اکائی (یونٹ) کو ہم کس طرح سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ ہم تکنیکی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ایک فریم ایک امیج یا تصویر تو ہو سکتی ہے۔ لیکن یقینی طور پر ہم اسے فلم کی سب سے چھوٹی اکائی نہیں کہ سکتے۔ کیوں کہ جیسا کہ مذکورہ بالا سطر میں عرض کیا گیا ہے کہ فلم لکھنے یا بولنے والی زبان نہیں ہے۔ ادبی زبان کا میڈیم تحریر یا Text ہے، اس کے برعکس مصوری کا میڈیم رنگ ہے، موسیقی آواز کا میڈیم ہے اور فوٹو گرافی کا میڈیم روشنی ہے (لیکن جب ان کی تشریح اور توضیح کرنی ہوتی ہے تو Text کا ہی سہارا لیا جاتا ہے) اور سنیما آخر الذکر تین میڈیم کا مرکب ہے۔ فوٹو کے بارے میں انگریزی کا یہ جملہ ضرب المثل بن چکا ہے A Picture is worth than thousand words اور فلم کا ایک شاٹ اپنے اندر اس سے کہیں زیادہ معنویت رکھتا ہے کیونکہ اس میں موسیقی بھی ہوتی ہے۔ اب یہ ناظرین پر منحصر ہے کہ وہ اس ایک شاٹ میں کتنے معنی تلاش کر پاتے ہیں۔ کیوں کہ فلم تخیل سے پرے ہے۔

■

Abdul Quadir Siddiquee
Research Scholar, Dept of Mass Communication & Journalism
Gachibowli, MANUU
Hyderabad - 500032 (Telangana)

کیلکولیٹر Calculator اور ونڈوز میڈیا پلیئر Windows Media Player

کیلکولیٹر(Calculator)

آپ پڑھ چکے ہیں کہ کیلکولیٹر ونڈوز آپریٹنگ سسٹم کے ماتحت حاصل ہونے والا ایک ایسا معاون پروگرام ہے، جس کی مدد سے آپ اپنی اسکرین پر ٹھیک ویسے ہی حساب کا کام کر سکتے ہیں، جیسے کسی الیکٹرانک کیلکولیٹر پر کرتے ہیں۔ یہ پروگرام ونڈوز ایکسیسریز (Accessories) کے اندر موجود ہوتا ہے۔

کیلکولیٹر شروع کرنا (Starting Calculator)

کیلکولیٹر کو شروع کرنے کا طریقہ نوٹ پیڈ، پینٹ وغیرہ پروگراموں کی طرح ہی ہے، جو مختصراً درج ذیل ہے:

تصویرW-10.1: کیلکولیٹر ونڈو کا اسٹینڈرڈ ویو

1۔ اسٹارٹ بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے اسٹارٹ مینو کھل جائے گا۔

2۔ 'آل پروگرامس' پر کلک کیجیے۔ اس سے پروگراموں کا مینو کھل جائے گا۔

3۔ ایکسیسریز آپشن پر کلک کیجیے۔ اس سے ایکسیسریز کا مینو کھل جائے گا۔

4۔ ایکسیسریز کے مینو میں 'Calculator' آپشن کو کلک کیجیے۔ اس سے کیلکولیٹر پروگرام شروع ہو جائے گا۔

اگر آپ کے ڈیسک ٹاپ پر کیلکولیٹر پروگرام کا شارٹ کٹ ہے، تو اسے ڈبل کلک کرکے بھی آپ اسے شروع کر سکتے ہیں۔

کیلکولیٹر پروگرام شروع ہوتے ہی آپ کی اسکرین پر اس کی ونڈو تصویر W-10.1 کی طرح کھل جائے گی۔

یہ ونڈو ایک عام الیکٹرانک کیلکولیٹر کی طرح دکھائی دیتی ہے اور اسی طرح کام کرتی ہے۔ اس میں آپ حسابیات کے زیادہ تر کام کر سکتے ہیں۔ یہ کیلکولیٹر پروگرام کا اسٹینڈرڈ ویو (Standard View) ہے۔ اس میں عددوں اور حسابیات کے نتائج کو دکھانے کے لیے ایک ڈسپلے باکس بھی ہے، ساتھ میں سبھی عددوں اور اہم حسابیات، جیسے جمع (+)، تفریق (-)، ضرب (*)، تقسیم (/)، فیصد (%) وغیرہ کے لیے بھی بٹن بنے ہوئے ہیں۔

آپ یا تو ونڈو میں بٹنوں کو کلک کرکے حساب کا کام کر سکتے ہیں یا اپنے کی بورڈ پر متعلقہ کنجیوں کو دبا سکتے ہیں۔ کیلکولیٹر کا اسٹینڈرڈ ویو آپ کے کی بورڈ کے نومیرک کی پیڈ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اس میں بنے ہوئے زیادہ تر بٹنوں کے لیے اس کی پیڈ میں کنجیاں موجود ہیں۔ اس لیے آپ نومیرک کی پیڈ (Numeric Keypad) سے ہی زیادہ تر حسابیاتی کام آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ضروری ہونے پر بیک اسپیس بٹن کے بدلے میں کی بورڈ کی بیک اسپیس کنجی دبائی جا سکتی ہے اور کلیئر (C) کے بدلے میں اسکیپ (Esc) کنجی کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جن بٹنوں کے لیے کی بورڈ پر کوئی کنجی موجود نہیں ہے، انھیں ونڈو میں کلک کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح = بٹن کے بدلے انٹر (Enter) کنجی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اگر آپ زیادہ پیچیدہ اور سائنسی حسابیات کرنا چاہتے ہیں، تو اس کے سائنٹفک ویو (Scientific View) کا استعمال کر سکتے ہیں، جو تصویر W-10.2 میں دکھایا گیا ہے۔ کیلکولیٹر ونڈو کے 'View' مینو میں سائنٹفک (Scientific) آپشن کو کلک کرکے آپ اس ویو کو حاصل کر سکتے ہیں۔ اس ویو میں عام حسابیات کے ساتھ ہی ٹرگنومیٹرک

تصویرW-10.2: کیلکولیٹر ونڈو کا سائنٹفک ویو

(Trigonometric) سوالوں کا نتیجہ حاصل کرنے کے لیے بھی بٹن موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح ویو مینو میں شماریاتی (Statistical) اور پروگرامر (Programmer) ویو کو بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

حساب کتاب کرنا (Performing Calculation)

کیلکو لیٹر کی ونڈو میں حساب کتاب کرنے کا طریقہ عام کیلکو لیٹر کی طرح ہی ہے، جو درج ذیل ہے:

1۔ پہلا نمبر ڈالیے۔ یہ نمبر ڈسپلے باکس میں نظر آئے گا۔

2۔ حساب کتاب کا آپریٹر، جیسے +، -، x یا / ڈالیے۔

3۔ دوسرا نمبر ڈالیے۔ اس وقت یہ نمبر ڈسپلے باکس میں نظر آئے گا۔

4۔ انٹر دبائیے یا کوئی دوسرا آپریٹر ڈالیے۔ اس سے حسابیات کا آخری نتیجہ ڈسپلے باکس میں نظر آئے گا۔

5۔ اسی طرح حساب کتاب جاری رکھیے۔

6۔ آخری حساب کا نتیجہ دیکھنے کے لیے انٹر دبائیے یا = بٹن کو کلک کیجیے۔ مثال کے طور پر مان لیجیے کہ آپ دو نمبروں 1234 اور 56.78 کا ضرب جاننا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے پہلے 1234 ٹائپ کیجیے، پھر * کنجی دبائیے۔ اب دوسرا نمبر 56.78 ٹائپ کیجیے۔ اخیر میں انٹر کنجی دبائیے، جس سے آپ کو اس کا نتیجہ 770066.52 دکھائی دے گا۔

اگر کبھی نمبر ٹائپ کرنے میں غلطی ہو جائے، تو بیک اسپیس کنجی کو دبا کر غلطی ٹھیک کیجیے۔ ڈسپلے کو خالی کرنے کے لیے اسکیپ (Esc) کنجی کو دبائیے۔

سائنٹفک ویو میں بھی حساب کتاب اسی طرح کیے جاتے ہیں۔ اس بارے میں تفصیل سے جاننے کے لیے کیلکو لیٹر کی ہیلپ سہولت کی مدد لیجیے، جو اس کے ہیلپ مینو میں موجود ہے۔

کیلکولیٹر کو بند کرنا (Closing Calculator)

کیلکو لیٹر ونڈو کو بند کرنے کے لیے اس کے دائیں اوپری کونے پر بٹن (X) کو کلک کیجیے۔

ونڈوز میڈیا پلیئر (Windows Media Player)

ونڈوز میڈیا پلیئر ایک ڈجیٹل میڈیا پلیئر اور میڈیا لائبریری ایپلی کیشن ہے، جسے مائکروسوفٹ کارپوریشن نے ونڈو پر مبنی پرسنل کمپیوٹروں میں میوزک چلانے اور ویڈیو اور تصویر دیکھنے کے لیے تیار کیا تھا۔ دراصل، یہ ایک آڈیو اور ویڈیو پلیئر ہے، جو MP3 فائلوں پر کام کرتا ہے۔ اس کے ذریعے آپ اپنا من پسند گانا، ویڈیو اور تصویر وغیرہ اسٹور کر سکتے ہیں۔

ونڈوز میڈیا پلیئر میں میوزک کو سی ڈی سے نکالنے، سی ڈی یا پین ڈرائیو میں کاپی کرنے اور آڈیو سی ڈی بنانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ونڈوز ویڈیو پلیئر کا نیا ورژن ونڈوز میڈیا پلیئر 12 ہے، جس کی خصوصیات کے بارے میں ہم اس باب میں بات کریں گے۔

ونڈوز میڈیا پلیئر شروع کرنا (Starting Windows Media Player)

اگر آپ کے ڈیسک ٹاپ پر ونڈوز میڈیا پلیئر کا شارٹ کٹ بنا ہوا ہے، تو آپ اسے ڈبل کلک کر کے فوراً ہی ونڈوز میڈیا پلیئر شروع کر سکتے ہیں۔ اس کو چلانے کا سب سے آسان طریقہ اسٹارٹ مینو کے ذریعے ہے، جو درج ذیل ہے:

1۔ اسٹارٹ بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے اسٹارٹ مینو کھل جائے گا۔

2۔ اسٹارٹ مینو میں ماؤس پوائنٹر کو 'All Programs' آپشن پر لے جائیے۔ اس سے اسٹارٹ مینو میں ہی کمپیوٹر میں موجود سارے پروگراموں کی فہرست آجائے گی۔

3۔ اس فہرست میں سے 'Windows Media Player' آپشن کو کلک کیجیے۔ اس سے 'Windows Media Player' پروگرام شروع ہو جائے گا۔

تصویر W-11.1: ونڈوز میڈیا پلیئر کی ونڈو

4۔ ونڈوز میڈیا پلیئر 12 شروع کرتے ہی آپ کی اسکرین پر اس کی ونڈو تصویر W-11.1 کی طرح کھل جائے گی۔

ونڈوز میڈیا پلیئر کا ڈیزائن (Design of Windows Media Player)

ونڈوز میڈیا پلیئر 12 میں پچھلے ورژن کے مقابلے شکل وصورت کو بہتر بنایا گیا ہے اور ویڈیو فائلیں ٹرانسفر کرنا اور بھی زیادہ آسان اور دلچسپ بنایا گیا ہے۔ اس حصے میں ہم ونڈوز میڈیا پلیئر 12 کی بعض خصوصیات پر بات کریں گے۔

ونڈوز 7 میں ونڈوز میڈیا پلیئر کی دو شکلیں دی گئی ہیں، جو شکل تصویر W-11.1 میں دکھائی گئی ہے، اس شکل کو لائبریری موڈ (Library Mode) کہا جاتا ہے۔ اس شکل میں میڈیا پلیئر کو پانچ حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

1۔ **ایڈریس بار (Address Bar)**: ونڈوز میڈیا پلیئر میں دوسری ونڈوز کی طرح سب سے اوپر ایڈریس بار ہوتا ہے، جو صارف (یوزر) کو میوزک یا ویڈیو فائل کی موجودہ جگہ بتاتا ہے اور میوزک یا ویڈیو فائل کو تلاش کرنے میں مدد کرتا ہے۔

2۔ **نیوی گیشن پین (Navigation Pane)**: کمپیوٹر ونڈو کی طرح ونڈوز میڈیا پلیئر میں بھی بائیں طرف کی پٹی کو نیوی گیشن پین کہتے ہیں۔ اس پٹی میں تین پہلے سے متعینہ (Music /Videos اور Pictures) اور صارف کے ذریعے بنائی گئی لائبریریز کی فہرست دکھائی جاتی ہے۔ (لائبریریز کے بارے میں آپ پچھلے ابواب میں پڑھ چکے ہیں)۔ نیوی گیشن پین پر کسی بھی لائبریری کو کلک کر کے آپ اس میں رکھی میوزک اور ویڈیو سے متعلق فائلوں کی تفصیلی جانکاری حاصل کر سکتے ہیں۔ لائبریریز کے علاوہ یہاں ڈرائیو میں لگی CD اور پلے لسٹ کی فہرست بھی نظر آتی ہے۔

3۔ **ڈیٹیلس پین (Details Pane)**: نیوی گیشن پین میں آپ جو بھی لائبریری چنتے ہیں، اس لائبریری میں رکھی سبھی میوزک اور ویڈیو فائلوں کی تفصیلی جانکاری اس علاقے میں دکھائی جاتی ہے۔ اس علاقے میں نظر آ رہی فائلوں کو چن کر پلے (Play) بٹن دبا کر آپ انھیں چلا سکتے ہیں اور من پسند میوزک یا ویڈیو کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

4۔ **لسٹ پین (List Pane)**: لسٹ پین کا علاقہ میڈیا پلیئر کی دائیں جانب کی پٹی کے ذریعے تقسیم ہوا نظر آتا ہے۔ یہ علاقہ تین ٹیب (Tabs) کے گروپ سے بنا ہے۔ پلے ٹیب (Play Tab)، برن ٹیب (Burn Tab) اور سنک ٹیب (Sync Tab)۔

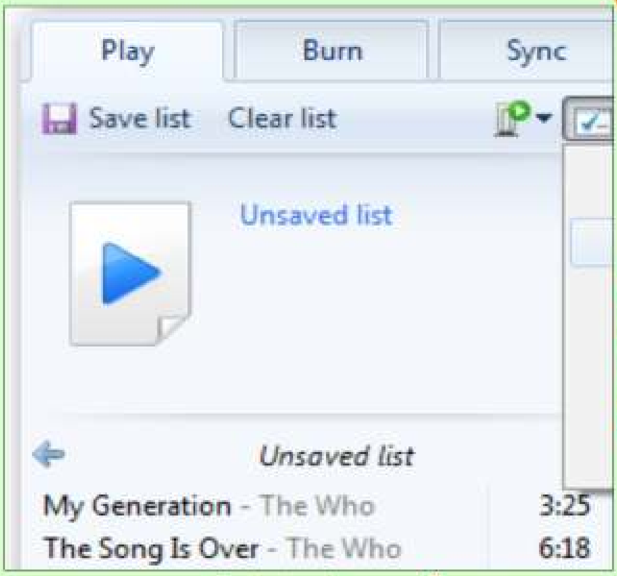

تصویرW-11.2:لسٹ پین میں پلے ٹیب

• پلے ٹیب(Play Tab): اس ٹیب کے تحت آپ ڈیٹیلس پین میں دکھائی دے رہی مختلف میوزک یا ویڈیو فائلوں میں سے کچھ فائلوں کو چن کر ان کا ایک گروپ بنا سکتے ہیں۔ اس گروپ کو پلے لسٹ (Playslist) بھی کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک پلے لسٹ بنا سکتے ہیں، جس میں صرف اردو زبان کے گانوں کی فائلیں ہوں، ایک پلے لسٹ جس میں صرف پرانے گانوں کی فائلیں ہوں، ایک پلے لسٹ جس میں صرف ایک نئے ویڈیو (نئی فلموں) کی فائلیں ہوں، وغیرہ۔ پلے لسٹ کی مدد سے آپ کو بار بار الگ الگ فائلوں کو شروع کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ پلے لسٹ میں آپ کسی بھی ایک فائل کو اگر شروع کر دیتے ہیں، تو بقیہ سبھی فائلیں بھی اس فائل کے ختم ہونے کے بعد ایک کے بعد ایک چلتی رہتی ہیں۔

پلے لسٹ بنانے کے لیے پہلے ڈیٹیلس پین میں نظر آ رہی فائلوں کو چن کر، انھیں ڈریگ کر کے پلے ٹیب کے علاقہ میں چھوڑ دیجیے۔ آپ کو اپنی من پسند پلے لسٹ کا گروپ بنتا ہوا نظر آئے گا۔ جب یہ گروپ پورا بن جائے، تب سیو لسٹ (Save List) کا بٹن دبا دیجیے، پلے لسٹ بن جائے گی۔

• برن ٹیب (Burn Tab): آپ کے کمپیوٹر پر رکھی فائلوں کو سی ڈی (CD) یا ڈی وی ڈی (DVD) پر مستقل طور پر کاپی (Copy) کرنے کے عمل کو برن کرنا کہتے ہیں۔ اس طریقے سے آپ کسی بھی قسم کی فائلیں (دستاویز، میوزک یا ویڈیو) برن کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے سب سے پہلے ایک خالی CD یا DVD کو سی ڈی ڈرائیو میں ڈالیں۔ پھر ڈیٹیلس پین میں نظر آ رہی فائلوں کو چن کر، انھیں ڈریگ کر کے برن ٹیب کے علاقے میں چھوڑ دیجیے۔ آپ کو چنی ہوئی سبھی فائلوں

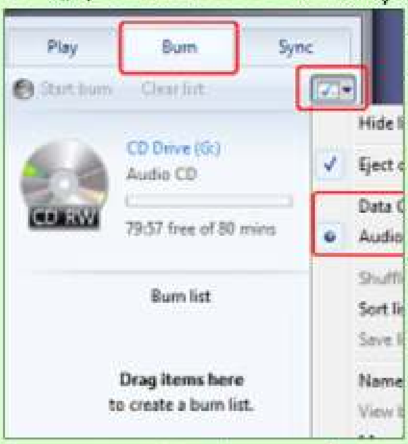

تصویرW-11.3:لسٹ پین میں برن ٹیب

کی فہرست نظر آئے گی۔ اس فہرست کے اوپر سی ڈی یا ڈی وی ڈی میموری پیش کرتا ہوا ایک علامتی نشان بھی نظر آئے گا، جس سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فہرست میں اور کتنی فائلیں ڈالی جا سکتی ہیں یا کتنی فائلیں فہرست سے ہٹانی ہوں گی، جس سے CD/DVD کی میموری کے زیادہ سے زیادہ حصے کا استعمال ہو۔ فہرست میں سبھی فائلیں آجانے کے بعد اسٹارٹ برن (Start Burn) کا بٹن دبا کر آپ برن کا عمل شروع کر سکتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ جب تک یہ عمل چل رہا ہے، اس کے دوران سی ڈی ڈرائیو کو کھولنا نہیں چاہیے، ورنہ CD/DVD ہمیشہ کے لیے خراب ہو سکتی ہے۔

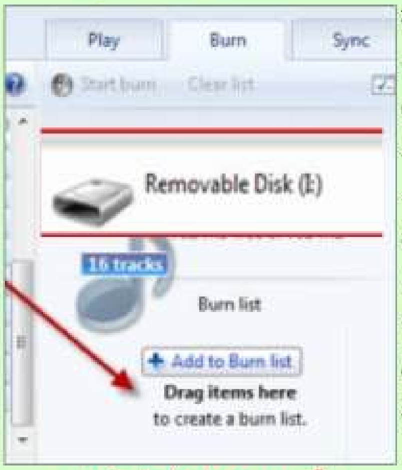

تصویرW-11.4:لسٹ پین میں سنک ٹیب

• سنک ٹیب(Sync Tab): اس ٹیب کے ذریعے آپ اپنے کمپیوٹر میں رکھی سبھی میوزک اور ویڈیو فائلوں کو دوسرے آلات، جیسے کہ موبائل/ اسمارٹ فون، پین ڈرائیو، ٹیبلیٹ کمپیوٹر وغیرہ میں ڈال سکتے ہیں۔ اس عمل کا طریقہ بھی برن عمل کی طرح ہے۔ سب سے پہلے اپنے کمپیوٹر کو آلات (جیسے کہ موبائل/ اسمارٹ فون) سے یو ایس بی تار کے ذریعے جوڑیں۔ ڈیٹیلس پین میں فائلیں چن کر انھیں سنک علاقہ میں ڈریگ کریں۔ سبھی چنی ہوئی فائلوں کی فہرست بن جانے کے بعد اسٹارٹ سنک (Start Sync) بٹن پر کلک کریں۔ فائلیں سنک ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ جب تک یہ عمل چل رہا ہے، اس کے دوران اگر آپ آلات کے تار کمپیوٹر سے نکال دیتے ہیں یا ہٹا دیتے ہیں، تو اس سے فائلیں، ہمیشہ کے لیے خراب ہو سکتی ہیں۔

5۔ پلے بیک کنٹرولس ایریا (Playback Controls Area): یہ نام اس گروپ کے بٹنوں کو دیا گیا ہے، جن کے ذریعے آپ میوزک یا ویڈیو فائل پلے (Play) کر سکتے ہیں۔ فائل کو آگے (Forward) یا پیچھے (Rewind) کر سکتے ہیں، آواز کو کنٹرول کر سکتے ہیں، وغیرہ۔

تصویر W-11.5: پلے بیک کنٹرولس ایریا

ونڈوز میڈیا پلیئر کے دائیں نچلے کونے کے بٹن کو کلک کرنے پر میڈیا پلیئر دوسری شکل 'Now Playing Mode' میں آجاتا ہے۔ اس شکل میں آپ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ فی الوقت کون سی آڈیو یا ویڈیو فائل چل رہی ہے۔

اس شکل میں بھی پلے بیک کنٹرولس ایریا (Playback Controls Area) ہوتا ہے، جس میں مختلف بٹنوں کے ذریعے آپ فائل کو چلا (Play) سکتے ہیں۔ فائل کو آگے

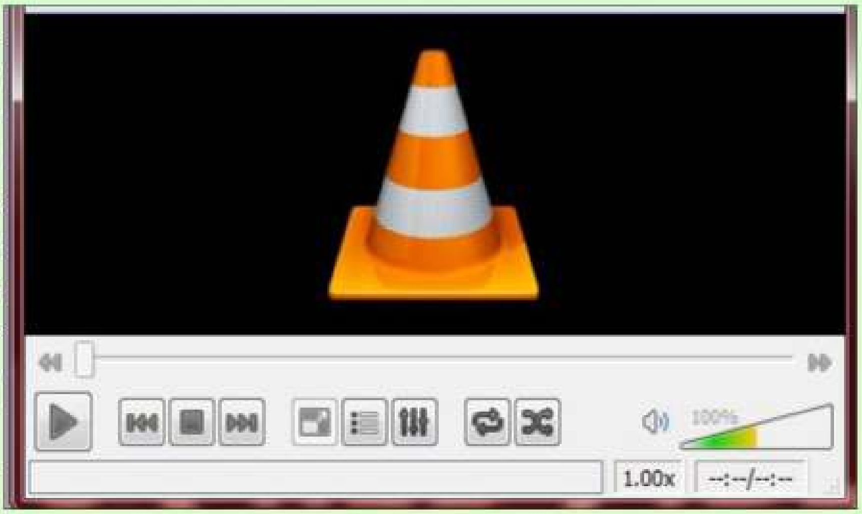

تصویر W-11.6: ونڈوز میڈیا پلیئر کی دوسری شکل

(Forward) یا پیچھے (Rewind) کر سکتے ہیں، آواز کو کنٹرول کر سکتے ہیں، وغیرہ۔

آڈیو یا ویڈیو فائل چلانا (Playing Audio or Video File)

نیوی گیشن پین میں نظر آ رہی لائبریریز کو کلک کرنے پر آڈیو یا ویڈیو فائلیں ڈیٹیلس پین میں نظر آنے لگتی ہیں۔ Music لائبریری میں خاص طور سے Artist، Album اور Genre جیسے آپشن بھی نظر آتے ہیں، جن کو چننے پر آپ آڈیو (میوزک) کی فائلوں کو گلوکار، البم یا اسٹائل کے مطابق دکھا سکتے ہیں۔

میڈیا پلیئر کی ونڈو میں اوپری دائیں کونے میں دیے گئے سرچ باکس کی مدد سے آپ من پسند فائل تلاش کر سکتے ہیں۔

کسی بھی آڈیو یا ویڈیو فائل کو چن کر، کنٹرولس ایریا میں پلے بٹن دبا کر آپ کسی بھی فائل کو چلا سکتے ہیں۔

سی ڈی سے میوزک کاپی کرنا (Copying Music from the CD)

سی ڈی سے میوزک ونڈوز میڈیا پلیئر لائبریری میں کاپی کرنا بہت آسان ہے۔ اس عمل کو 'رپ' (Rip) کرنا کہتے ہیں۔ سی ڈی سے میوزک رپ کر کے کمپیوٹر میں ڈالنے سے وہ آپ کے کمپیوٹر میں فائلوں کی شکل لے لیتا ہے، جسے آپ پورٹ ایبل میوزک پلیئر، پاکٹ پی سی وغیرہ میں اسٹور کر سکتے ہیں یا اسے ایک الگ سی ڈی میں اسٹور کر کے اپنے ساتھ کہیں بھی لے جا سکتے ہیں۔

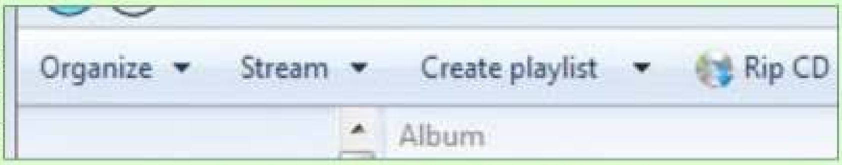

تصویر W-11.7: ونڈوز میڈیا پلیئر کے مینو میں رپ سی ڈی کا آپشن

سی ڈی سے میوزک 'رپ' کرنے کے لیے پہلے آڈیو سی ڈی کو ڈرائیو میں ڈال دیں۔ سی ڈی کے سبھی گانوں کی فہرست ڈیٹیلس پین میں دکھائی دینے لگے گی۔ پھر ایک یا ایک سے زیادہ گانوں کو چن لیجیے۔ اخیر میں مینو بار میں نظر آ رہے بٹن 'Rip CD' کو کلک کر دیجیے۔ عمل شروع ہو جائے گا۔

'رپ سیٹنگس' (Rip Settings) کے مینو کو کلک کرنے پر ڈراپ ڈاؤن مینو کھلتا ہے، جس میں میوزک کو رپ یا کاپی کرنے کے کئی آپشن دیے جاتے ہیں۔ ان میں (Format) فارمیٹ آپشن اور (Audio Quality) آڈیو کوالٹی آپشن کی ہم خاص طور سے بات کریں گے۔

فارمیٹ آپشن کلک کرنے پر سب- مینو کھلتا ہے، جس میں درج ذیل آپشن دیے جاتے ہیں۔

- **ونڈوز میڈیا آڈیو پرو**- یہ فائل فارمیٹ کم اسٹوریج صلاحیت والے آلات، جیسے موبائل فون میں فائلیں اسٹور کرنے میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس فارمیٹ میں آڈیو کوالٹی بٹ ریٹ کم رکھتے ہوئے بڑھا دی جاتی ہے۔
- **ونڈوز میڈیا آڈیو**- اس فارمیٹ میں فائل کا سائز گھٹا دیا جاتا ہے، لیکن اسے 'رپ' کرنے میں زیادہ وقت لگتا ہے۔
- **ونڈوز میڈیا آڈیو لاس لیس**- یہ فارمیٹ سب سے بہتر آڈیو کوالٹی دیتا ہے اور ساتھ ہی فائل کا سائز بڑھا دیا جاتا ہے۔

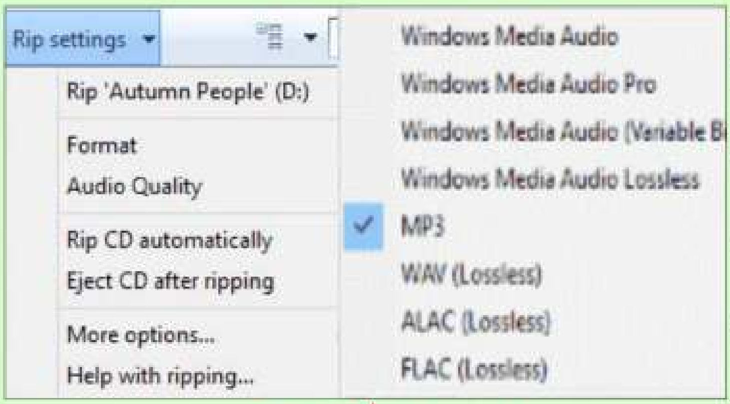

تصویر W-11.8: 'رپ سیٹنگس' کے مینو آپشن

- **ایم پی 3 ڈبلیو اے وی (لاس لیس)**- یہ فائل فارمیٹ زیادہ لچیلا پن فراہم کرتا ہے۔

فائل فارمیٹ چننے کے علاوہ آپ بٹ ریٹ بھی چن سکتے ہیں۔ بٹ ریٹ چن کر آپ آڈیو کوالٹی اور فائل سائز کے درمیان من چاہا تال میل بنا سکتے ہیں۔ عام طور پر بٹ ریٹ کرنے سے پہلے فائل سائز کم ہو جاتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی آڈیو کوالٹی میں بھی کمی آتی ہے۔

اس باب میں ونڈوز میڈیا پلیئر کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بارے میں مزید جانکاری حاصل کرنے کے لیے ونڈوز میڈیا پلیئر کی ہیلپ سہولت کی مدد حاصل کیجیے۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

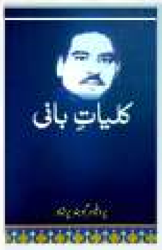

کلیات بانی

مرتب: پروفیسر گوبند پرساد
صفحات: 382، قیمت: 180 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عمیر منظر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس (یو پی)

جدید غزل گو کی حیثیت سے بانی (1932-1981) کے مرتبے کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا۔ لفظوں پر غیر معمولی دسترس اور ان کے اسلوب نے انھیں ایک واضح شناخت عطا کی۔ گزشتہ چند دہائیوں کے دوران جدید غزل کا کوئی بھی مطالعہ بانی کے بغیر نہیں کیا گیا۔

نئے شعری رویوں میں بانی (راجیند رمنچندہ) کے شعری تجربوں اور اس کی مختلف فنی جہات کو نہ صرف تسلیم کیا گیا بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ یہ تخلیقیت سے بھرپور شاعری ہے۔ تقریباً نصف صدی قبل 1971 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ 'حرف معتبر' شائع ہوا تھا اور اس کے پانچ برس بعد دوسرا مجموعہ 'حساب رنگ'۔ اب یہ مجموعے تقریباً نایاب ہو چکے ہیں۔ 'شفق شجر' کے نام سے بانی کا تیسرا مجموعہ کلام 1983 میں شائع ہوا تھا، جس کی ترتیب و تہذیب میں رام پرکاش راہی اور جے رام داس فلک نے کی تھی۔ اب یہ مجموعے دستیاب نہیں ہیں۔ ایسی صورت میں کلیات بانی کی اشاعت، شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بالعموم اور بانی کی شاعری کو پسند کرنے والوں کے لیے بالخصوص ایک اہم ادبی واقعہ ہے۔

پروفیسر گوبند جو سینٹر فار انڈین لینگویجز، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی میں ہندی کے پروفیسر ہیں، انھوں نے کلیات کو اس طرح مرتب کیا ہے کہ اردو کے ساتھ ساتھ بانی کی غزلوں اور نظموں کو دیوناگری میں بھی منتقل کر دیا ہے، جس سے عام ہندی داں طبقے تک بانی کا کلام بآسانی پہنچ جائے گا۔ دیوناگری میں مشکل الفاظ کے معنی بھی دیے گئے ہیں۔ بانی کی لفظیات کو دیوناگری میں منتقل کرنا آسان نہیں ہے مگر پروفیسر گوبند نے بہت سلیقے سے اس کام کو انجام دیا ہے۔ چونکہ اس سے قبل بھی وہ بعض اہم اردو کتابوں کو دیوناگری کا قالب عطا کر چکے ہیں۔ اس لیے سابقہ تجربوں کی روشنی میں انھیں ضرور آسانی میسر رہی ہوگی۔

پروفیسر گوبند نے ابتدا میں ایک تفصیلی مقدمہ بھی لکھا ہے، جس میں بانی کے شعری کمالات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بعض اشعار کی تشریح و تعبیر بھی بیان کی گئی ہے۔ گوبند نے لکھا ہے کہ بانی کے یہاں شعری روایت سے استفادہ کی خوب صورت شکلیں ملتی ہیں اور انھوں نے نئے شعری رجحان کو بھی نہایت سلیقے سے برتا ہے۔ گوبند کا خیال ہے کہ بانی کی شعری لفظیات عشق اور درد کے گہرے احساس کو اظہار کی نئی تخلیقی توانائی عطا کرتی ہے (ص 24)۔ بانی کے متنوع تصویری رنگ مضامین کی نئی صورت گری کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ بانی کی تجریدیت محض مجرد پیکروں کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ اس کی ایک خاص خوبی فکر و فن کا اعتدال بھی ہے (ص 24)۔ گوبند نے اپنے تفصیلی مقدمے (لفظوں کے لشکر میں اکیلا: بانی) میں وضاحت اور صراحت کے ساتھ بانی کی تخلیقی ہنر مندی کو پیش کیا ہے۔

اس موقعے پر انھوں نے نئی لفظیات اور اظہار کی وہ تخلیقی سطح جو جدید شاعروں سے عبارت تھی اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ پروفیسر گوبند نے لکھا ہے:

نئے شاعر کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ اس لفظیات کا تجسس ہے جو نئے شعری احساسات کو قارئین تک مکمل طور سے ترسیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس کے لیے اسے نئے لفظوں کی تلاش سے لے کر نئی تشبیہ سازی، نئی علامت نگاری اور لفظوں کی نئی بندش اور پھر لفظوں کے نئے معنی تک کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ (کلیات بانی ص 28)

ضروری نہیں کہ پروفیسر گوبند کی ان باتوں سے مکمل اتفاق کیا جائے مگر انھوں نے نئی شاعری کی تفہیم و تعبیر کے لیے بہت سے راستوں کو تلاش کرنے کی ضرور کوشش کی ہے اور صرف بانی تک خود کو محدود نہ رکھ کر اس پورے عہد کو دیکھنے اور تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

کلیات کی اشاعت بلاشبہ ایک اہم قدم ہے البتہ چند امور ایسے ہیں جن پر توجہ کی ضرورت تھی۔ بانی کے تینوں مجموعہ کلام پر التزام کے ساتھ بانی کا نام، تاریخ پیدائش،

وطن اور تعلیم کا اندراج ہے۔ کلیات میں اس کا التزام کسی وجہ سے نہیں کیا جاسکا یہاں تک کہ بانی کا اصل نام بھی کہیں نہیں ہے۔ کلیات میں بانی کے دوسرے مجموعہ کلام 'حساب رنگ' کی فہرست کے حاشیہ میں یہ عبارت درج ہے کہ 'اصل کتاب 'حساب رنگ' میں جناب عتیق اللہ کا مقدمہ شامل تھا جسے زیرنظر مجموعے میں نہیں دیا جارہا ہے' (کلیات بانی ص: XII) یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ پہلے مجموعہ کلام 'حرف معتبر' میں گوپال متل کا دیباچہ اور اس کے بعد راج نارائن راز کا مضمون بھی کلیات میں شامل نہیں ہے۔ اسی مجموعے میں چندر پرکاش شاد جنھوں نے حرف معتبر کی غزلوں کو منتخب کیا تھا' کچھ انتخاب سے متعلق ایک مختصر تحریر ہے، اسے بھی شائع نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حرف معتبر میں رتن پوری، مشفق خواجہ، مظہر امام، سلام مچھلی شہری، ندا فاضلی، بشیر بدر، کمار پاشی، محمود ہاشمی، مخمور سعیدی، کرشن موہن اور عمیق حنفی کی مختصر تحریریں کلیات میں شامل نہیں ہیں۔ 'حساب رنگ' میں چند سطریں پروفیسر سید احتشام حسین کی بھی ہے۔ 'شفق شجر' میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کی طویل تحریریں بانی شناسی کے لیے بہت کارآمد ہیں۔ ظاہر ہے ان تمام کا ذکر نہ کرکے صرف ایک تحریر پر حاشیہ لگانے سے یہ واضح ہوگا کہ صرف انھوں نے ہی لکھا تھا۔ بہتر ہوتا کہ مقدمے میں ان تمام کا ذکر کیا جاتا اور لکھ دیا جاتا کہ یہاں صرف شعری متن شائع کرنا مقصود ہے اس لیے مجموعے میں شامل دیگر تحریروں کو کلیات میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

حرف معتبر میں ایک غزل جس کا مطلع ہے۔

تمام راستہ پھولوں بھرا ہے میرے لیے
کہیں تو کوئی دعامانگتا ہے میرے لیے

نو(9) اشعار پر مشتمل ہے۔ چونکہ شفق شجر میں بانی کی 'نئی غزلیں' حرف معتبر اور حساب رنگ کی پرانی غزلوں کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ نہیں معلوم کس طرح شفق شجر کے مرتبین (رام پرکاش راہی، جے رام داس فلک) نے 'شفق شجر' میں اس غزل کو 'نئی غزلیں' کے تحت درج کردیا تھا۔ 'شفق شجر' (ص 73) میں یہ غزل محض چھ(6) اشعار پر مشتمل ہے۔ غالباً اسی لیے یہ غزل کلیات بانی (ص128) اور (ص348) دونوں جگہ درج کرلی گئی ہے۔ اشعار کی تعداد بھی وہی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اس لحاظ سے قابل مبارک باد ہے کہ اس نے کلاسیکی شعر و ادب کے ساتھ ساتھ جدید شعرا پر بھی قابل قدر کام کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ 2016 میں 'راجیند رمنچندہ بانی' کے نام سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مونوگراف شائع کیا تھا اور اب کلیات کی شکل میں ان کا کلام منظر عام پر آچکا ہے۔ شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک اہم ادبی تحفہ ہے۔

محمود ایاز کی تحریریں

مرتب: اکرم نقاش

صفحات: 619، قیمت: 275، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: شاہد حبیب

540/122، ٹیگور مارگ نزد شباب مارکیٹ، لکھنؤ (یوپی)

ترقی پسند تحریک جب اپنے حصے کی خدمت ادا کرچکی تو ہمارے ادب میں فکری سطح پر ایک خلا پیدا ہوگیا تھا۔ اس خلا کو محسوس کرکے اس کو پر کرنے کی کوشش جن لوگوں نے کی، ان اساطین میں محمود ایاز (1997-1929) کا نام سرفہرست لیا جاتا ہے۔ محمود ایاز نے اردو کی معروف بستیوں سے بہت دور بنگلور سے 1959 میں سہ ماہی رسالہ 'سوغات' جاری کیا تھا، گو یہ رسالہ مستقل جاری نہیں رہ سکا۔ تین الگ الگ ادوار میں نکلنے کے باوجود 30 سے بھی کم شمارے ہی منظر عام پر آسکے تھے، پھر بھی اس کے ذریعے سے انہوں نے اعلیٰ درجے کے ادب کی ترویج واشاعت کا کام انجام دیا اور نئے مغربی رجحانات اور تنقیدی وفلسفیانہ افکار کو اردو میں روشناس کرانے کی کوشش کی۔

ادب کے مؤرخین کا کہنا ہے کہ ان کی انھی کوششوں کی بدولت آگے چل کر اردو میں جدیدیت کے رجحان کی داغ بیل پڑی۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ محمود ایاز ترقی پسندی کے مقابلے میں کسی دوسری فکر کو کھڑا کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ دراصل ادب میں انتہا پسندی کے مخالف تھے چاہے وہ ترقی پسندی کے نام سے ہو یا جدیدیت کے نام سے۔ وہ نہ کسی تبدیلی یا تجربہ پسندی کے منکر تھے اور نہ شاکی۔ بس ان کی شرط تھی کہ تبدیلی مثبت ہو اور ادبی اقدار کی پاسداری کرتی ہو۔ اس کا اظہار انہوں نے سوغات میں لکھے اپنے عالمانہ اداریوں، انگریزی ادب کے ترجموں اور اپنے روشن خیال مضامین کے ذریعے کیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ ساری چیزیں اب تک سوغات کے بوسیدہ شماروں میں بکھری پڑی تھیں۔ ان سب کو یکجا کرنے کا خیال اردو کے ایک بے لوث خادم اور منفرد شاعری کی شناخت رکھنے والے گلبرگہ کے فرزند اکرم نقاش کو آیا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ جناب اکرم نقاش نے یہ کام اردو کی بے لوث خدمت کے جنون میں انجام دیا یا اپنی ریاست کو اردو ادب میں جائز مقام دلانے کی خواہش سے مجبور ہوکر۔ ممکن ہے دونوں جذبے کارفرما رہے ہوں۔ لیکن بہر حال یہ دونوں جذبے احترام کی نظر سے دیکھے جانے کے مستحق ہیں۔ 22 صفحات پر مشتمل بسیط مقدمے سے پتہ چلتا ہے کہ اکرم نقاش کے ذہن میں جب یہ بات آئی تو پہلے مرحلے میں محمود ایاز کے صرف اداریوں کو ہی جمع کرنے کا خیال آیا تھا لیکن ان کے زرخیز دماغ نے یہ کمانڈ دیا کہ صرف اداریے ہی کیوں؟ انگریزی ادب کے تراجم اور مضامین بھی تو اتنے ہی بلکہ ان سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ چنانچہ انہوں نے 2012 میں جب کام کو شروع کیا تو محمود ایاز کی تمام تحریروں کو جمع کرنے کا خمار ان کے ذہن میں سوار ہوچکا تھا۔ یہ خمار اردو کے لیے بہتر ثابت یوں ہوا کہ ڈھائی تین سال کی مسلسل جستجو وتلاش کے بعد ملک بھر کی نجی و پبلک لائبریریوں میں پہلے سوغات کے شماروں کی فراہمی ممکن ہوگئی۔ 619 صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں محمود ایاز کے کل 19 اداریے (دور اول کے سات، دور دوم کا ایک اور دور سوم کے گیارہ) 12 تبصرے اور 11 تراجم کے علاوہ دو انٹرویو، ایک مضمون، ایک مذاکرہ اور محمود ایاز کا مجموعہ کلام 'نقش برآب' بھی شامل ہیں۔

محمود ایاز بہت ہی محنت سے اور فرصت سے سوغات کے اداریے تحریر کرنے کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے معاصر ادب کو سمت ورفتار کے تعین میں مدد ملتی تھی۔

محمود ایاز اپنے سلجھے ہوئے تبصروں کی وجہ سے اردو دنیا کے محبوب بھی بنے اور معتوب بھی۔ کتاب میں شامل 12 تبصروں سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ 'آگ کا دریا' پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے جس توازن کا ثبوت پیش کیا ہے ویسا کم ہی مبصرین کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ توازن کی ایک مثال پیش خدمت ہے:

''آگ کا دریا'' کا وہ حصہ جو قدیم ہندوستان کی تاریخ سے شروع ہوکر سرل ہاروڈ ایشلے کی کہانی پر ختم ہوتا ہے۔ اگر ناول سے ختم کردیا جائے تو اس ناول اور ابتدائی دوناولوں (میرے بھی صنم خانے اور سفینۂ غم دل) میں بہت کم فرق ملے گا۔'' پھر آخر میں لکھتے ہیں: ''اس ناول میں کمزوریاں اور خامیاں بھی ہیں جن کا ابتدا میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود آگ کا دریا ایک عظیم کوشش ہے اور ناول نگاری میں

یہ ناول ایک سنگ میل ہے۔'' (ص 197)

اس مجموعے میں محمود ایاز کے 11 تراجم شامل ہیں جو بیشتر فکشن سے متعلق ہیں۔ جے بی پرسٹلے کے مضمون کو 'ادیب کا مستقبل' کے نام سے سلیس اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اس طرح ایرش فرام کی تخلیق کو 'زوال آدم خاکی' کے نام سے اردو جامہ پہنایا گیا ہے۔ اسی طرح کی انتہائی اہم تخلیقات کو اردو میں منتقل کرکے محمود ایاز نے جس دانشوری کی روایت قائم کیا تھا اس کو پانے کے لیے آج بھی کئی دانشور خواب دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔

محمود ایاز نے شاعری بھی کی۔ ان کی شاعری کا مجموعہ بھی اکرم نقاش نے اس میں شامل کرکے شاعری کے متوالوں کو بھی محمود ایاز کی طرف متوجہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

قومی اردو کونسل سے ہماری توقعات اس لیے بھی زیادہ ہیں کہ وہ اردو کا سب سے فعال ادارہ ہے۔ اس لیے جب تک دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، منشی نول کشور پریس جیسے اداروں کی مفقود کتابوں کی تلاش اور اس کی ازسرنو اشاعت کے ساتھ میں سماجی وسائنسی علوم کی نصابی وغیر نصابی کتب کی مزید فراہمی نہیں ہو جاتی تب تک محمود ایاز کی ان بکھری تحریروں کو یکجا کرنے کی کوشش کے لیے بجا طور پر کونسل کو سراہا جائے گا۔

انتخاب سخن جلد سوم سلسلۂ مومن

مرتب: حسرت موہانی

صفحات: 326، قیمت: 155 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی

مبصر: عبدالباری، ڈی 29 شاہین باغ، اوکھلا، نئی دہلی 110025

مولانا حسرت موہانی کے جملہ کارناموں میں سے ایک اہم اور نادر کارنامہ 'انتخاب سخن' کے نام سے دو سو سے زائد اساتذہ کے کلام کا انتخاب ہے، حسرت موہانی نے گیارہ جلدوں میں اساتذہ کے کلام کا انتخاب شائع کیا، مجموعی طور پر یہ انتخاب تین ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، ابتدا میں حسرت کا ارادہ انتخاب دواوین کے نام سے پانچ جلدوں میں شائع کرنے کا ارادہ تھا مگر بعد میں حسرت کا ارادہ بدل گیا اور 'انتخاب سخن' کے نام سے گیارہ جلدوں میں شائع کیا۔

اس انتخابی سلسلے کے ذریعے حسرت موہانی نے بہت سے ایسے اساتذہ کو دوبارہ زندہ کیا اور قارئین سے روشناس کرایا جو گمنام ہو چکے تھے اور ان کا کلام ضائع ہونے کی کگار پر پہنچ چکا تھا، انتخاب کلیات جعفر علی حسرت کے دیباچہ میں خود حسرت نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

''اردو زبان کی بدقسمتی سے اور ناقدردانوں کی غفلت کی وجہ سے بہت سے زبردست استادوں کا کلام برباد ہو گیا، ایسا کہ اب تلاش کرنے پر بھی اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا اور بہت سا کلام ضائع ہونے کے قریب ہے یعنی یہ کہ اگر بہت جلد اس کی حفاظت اور اشاعت کا انتظام نہ کیا جائے گا تو کچھ دنوں میں دنیا سے ناپید ہو جائے گا''

اس اقتباس سے جہاں حسرت کے اس اہم کارنامہ کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں حسرت کا مقصد بھی واضح ہوتا ہے، حسرت نے انتخاب کی شکل میں ایسا عمدہ شعری نمونہ اہل اردو کے سامنے پیش کیا کہ اگر ان کے دیگر علمی، ادبی اور اہم سیاسی کارنامے نہ بھی ہوتے پھر بھی ان کو زندگی عطا کرنے کے لیے یہ انتخاب کافی تھا۔

چونکہ حسرت خود ایک اچھے شاعر تھے اور تنقیدی بصیرت بھی عمدہ رکھتے تھے چنانچہ اس کا ثبوت اس انتخاب میں بھی پیش کیا ہے، غزلیات کے انتخاب میں مطلع اور مقطع کے ساتھ تین شعر کو ضرور شامل کیا، چاہے وہ عمدہ ہوں یا کمزور اس کی وجہ سے قاری بسہولت شاعر کے کمزور اور مضبوط دونوں پہلوؤں کو سمجھ اور جان سکتا ہے اور شاعر کے کلام پر آسانی سے کوئی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔

حسرت نے یہ انتخاب گیارہ جلدوں میں شائع کیا اور ہر جلد کسی نہ کسی سلسلہ سے منسوب ہے، پہلی جلد سلسلۂ شاہ حاتم ہے، دوسری جلد سلسلہ 'ذوق، تیسری جلد سلسلۂ مومن، چوتھی جلد جزو اول سلسلۂ مظہر اور جزو دوم سلسلۂ میر درد و سوز، پانچویں جلد سلسلۂ جرأت، چھٹی جلد سلسلۂ مصحفی، ساتویں جلد سلسلۂ آتش، آٹھویں جلد سلسلۂ اسیر و امیر، نویں جلد سلسلۂ ناسخ، دسویں جلد سلسلۂ غالب اور گیارہویں و آخری جلد متفرق ہے۔

ان تمام جلدوں کے سلسلوں سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حسرت نے کیسے کیسے کلاسیکی مشہور اور غیر مشہور اور کچھ ہم عصروں کے کلام کو محفوظ کر دیا ہے۔

زیر تبصرہ انتخاب سخن جلد سوم سلسلہ مومن ہے یہ دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں مومن، نسیم دہلوی، تسلیم اور خود حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب ہے جبکہ دوسرے حصے میں شیفتہ، اشرف، قلق، شگفتہ، مہر لکھنوی، اصغر گونڈوی، عرش گیاوی، ہادی مچھلی شہری اور شفیق جونپوری جیسے جلیل القدر اور مستند شعرا کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ اس انتخاب سے حسرت کی ذہانت اور فن ترتیب پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس حصے میں ویسے تو نظم، رباعی، قطعہ، منقبت، نعت اور حمد وغیرہ سب کچھ موجود ہے مگر بیشتر حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ ابتدا سے شیفتہ تک حسرت نے کسی شاعر کے ساتھ استاد کا نام نہیں لکھا مگر بعد میں اشرف سے لے کر شفیق جونپوری تک سوائے ہادی مچھلی شہری کے سب کے اساتذہ کا نام لکھنے کا بھی التزام کیا ہے؛ تاکہ شاعر کی حیثیت اور وقعت کے ساتھ اس کے کلام کی اہمیت کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ حسرت موہانی نے خود اپنے کلام کا دو حصوں میں انتخاب کیا، پہلے حصے میں ردیف کے اعتبار سے الف سے ی تک ترتیب ہے، اس حصے میں صرف غزل شامل ہے، جبکہ دوسرے حصے کو تاریخ اور مقام کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے، اس میں رباعی، نظم، مدح، نعت، اور قطعہ وغیرہ متفرق چیزیں شامل ہیں۔

اس اہم اور قابل قدر انتخاب کلام کی اشاعت کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی اور اس کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم لائق تحسین اور قابل مبارکباد ہیں؛ اس لیے کہ قومی کونسل نے پہلی مرتبہ اس انتخاب کو اس خوبصورتی سے شائع کیا ہے کہ یہ عوام وخواص دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

قومی کونسل نے ایک تو حسرت موہانی جیسے جلیل القدر شاعر، صحافی، ناقد اور مبصر ومرتب کے قیمتی سرمایے کو دوبارہ قارئین کے روبرو کروایا اور دوسری اہم بات یہ کہ قومی کونسل نے اس کتاب کو کمپیوٹر سے ٹائپ کراکے شائع کیا ہے اس کی وجہ سے ہر قسم اور ہر سطح کے اردو والے اسے بہ سہولت پڑھ سکتے ہیں، اس سے قبل دو مرتبہ اشاعت ہوئی ایک کانپور سے اور دوسری لکھنؤ سے، پہلی میں تو صرف مومن، نسیم، تسلیم اور حسرت کے کلام ہی شامل تھے، جبکہ لکھنؤ سے مکمل شائع ہوا تھا، مگر قدیم طرز تحریر کی وجہ سے ہر کس وناکس اس سے استفادہ نہیں کر سکتا تھا؛ اس لیے اس کے قارئین کا دائرہ محدود ہو گیا تھا، قومی کونسل کے اس اقدام سے قارئین کا دائرہ بھی بڑھے گا اور ہر کس وناکس استفادہ کر پائیں گے۔

کاغذ اور جلد کی عمدگی کے ساتھ ساتھ قیمت بھی بہت مناسب ہے، طلبہ، اساتذہ اور عوام سبھی کے لیے انتہائی مفید ہے، امید ہے کہ قارئین پسند کریں گے۔

تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات

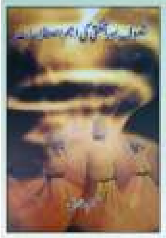

مصنف: شمیم طارق

صفحات: 411، قیمت: 185 روپے، سنہ اشاعت: 2018

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: محمد مقیم، A-10، بٹلہ ہاؤس چوک

نزد جامعہ کوآپریٹو بینک، نئی دہلی 1100 25

دنیائے ادب میں شمیم طارق کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی شہرت ایک نقاد، محقق اور کالم نگار کے طور پر مستحکم ہے اور اب تک ان کی تقریباً ڈیڑھ درجن سے زائد کتابیں شرف قبولیت سے ہمکنار ہوئی ہیں۔

شمیم طارق زیر نظر کتاب کے مولف ہیں اور یہ کتاب تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات کے معنی و مفاہیم پر مبنی ہے۔ کتاب کے آغاز میں شمیم طارق نے 9 صفحے کا 'عرض مولف' تحریر کیا ہے۔ یہ بات تو سبھی کے علم میں ہے کہ تصوف اور بھکتی کی تحریک عہد وسطی کی اہم تحریکوں میں سے ہے۔ ان تحریکوں کے زیر اثر عہد وسطی میں نظریۂ وحدانیت کا موضوع تاریخ کے طلبا کے لیے بڑی دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ نہ صرف دلچسپی کا موضوع رہا ہے بلکہ اس میدان میں تخصص کا بھی چلن رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف اور بھکتی کی تحریک نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور ادب والسنہ پر ایک نہیں کئی جہتوں سے اپنے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جوں جوں ہندوستان میں رنگوں نسلوں اور زبانوں کا امتزاج بڑھتا رہا تصوف اور بھکتی کی تحریک مزید اہمیت اختیار کرنے لگی۔ اصل میں یہ تحریکیں جس رواداری اور انسان دوستی کی معلم تھیں وہ ہندوستان جیسے تکثیری ملک کے لیے نہایت ضروری تھیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ تصوف اور بھکتی کی تحریکیں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی تشکیل و تزئین میں اساسی کردار کی حامل ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ہندوستانی عہد وسطی کا ایک دور ان تحریکوں سے معنون ہے اور عہد وسطی کا مطالعہ کرنے والے مورخین نے اس دور کو سمجھنے اور حقائق کو از سر نو جاننے اور سماجی و مذہبی تاریخ و عقائد کو مرتب کرنے کے لیے ان تحریکوں اور ان کی ادبیات سے خاصا تعاون حاصل کیا ہے۔

مذکورہ بالا باتوں پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ہندوستان جیسے تکثیری شناخت رکھنے والے ملک میں تصوف اور بھکتی کی تحریک کی کیا اہمیت ہے اور ان کی عصری معنویت کیا ہے۔ تصوف اور بھکتی کی تحریک محض ایک روحانی یا وجدانی تجربہ یا مابعدالطبیعاتی مشاہدہ نہیں ہے بلکہ اس کی ساخت اور اس کی ادبیات پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ باقاعدہ ایک شعبۂ علم ہے۔ لہٰذا اس کے اپنے کلیدی الفاظ، اپنی لفظیات اور اصطلاحات ہیں جو اس نظام فکر کی ذہنی و قلبی کیفیات کی تفہیم میں معاون ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ہمارے علم میں یہ بات ہے کہ تصوف اور بھکتی نے ہماری ادبیات کو بھی متاثر کیا ہے۔ ظاہر ہے متاثر کرنے کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں، فکری سطح پر بھی اور لسانی سطح پر بھی۔ کم از کم اردو غزل کے بارے میں تو یہ مقولہ مشہور ہی ہے کہ ''تصوف خوب است برائے شعر گفتن''۔ ہماری شاعری میں مابعدالطبیعاتی اور وجودی فکر کے جو عناصر ہیں وہ تصوف ہی کے رہین منت ہیں۔ فکر معنی سے وجود میں آتی ہے اور معنی ایک تصور کے مطابق لفظ ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصوف اور بھکتی کی لفظیات یعنی اصطلاحات کا استعمال ہماری شاعری میں متصوفانہ عناصر کو جگہ دیتا ہے۔ جب تک تصوف کی اصطلاحات کے معنی تک رسائی نہ ہوگی مفہوم تک رسائی نہیں ہوگی۔ شمیم طارق نے تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات کو ایک کتاب میں یکجا کر کے اور ان اصطلاحات کی تشریح کر کے علم و ادب کی گرانقدر خدمت کی ہے۔ ان اصطلاحات اور ان کی تشریح کو درج کرنے میں شمیم طارق کو جس جانفشانی اور مسائل سے گزرنا پڑا ہے اس کا اندازہ انھی کے الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے:

''مشاہدات و مکاشفات یا واردات پر مبنی تخلیقات کی تشریح کرنے والوں نے بھی ایک ہی اصطلاح کے کئی کئی بلکہ متضاد مفاہیم متعین کیے ہیں جن سے ان کی معنوی کائنات میں وسعت بھی پیدا ہوتی گئی ہے اور ابہام بھی۔ یہ مفاہیم بھی بکھرے ہوئے ہیں، یکجا نہیں ہیں۔ کسی کتاب یا کتاب کے کسی باب میں ان اصطلاحات کو جمع کرنے اور ان کی تشریح کرنے کی کوشش کی بھی گئی ہے تو اس میں کسی ایک ہی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے اور وہ بھی صرف تصوف کی اہم اصطلاحات کا، اس میں بھکتی کی اہم اصطلاحات کی تشریح نہیں کی گئی ہے۔''

اس بیان سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ یہ کام کس قدر محنت طلب تھا۔ دوسرے یہ کہ شمیم طارق نے ایک ہی اصطلاح کے مختلف معانی و مفاہیم نیز شروحات کو درج کرنے کا التزام کیا ہے اور وہ بھی صرف تصوف کی اصطلاحات ہی نہیں بلکہ بھکتی کی اصطلاحات کو بھی اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ شمیم طارق کسی بھی موضوع سے رواروی میں نہیں گذرتے بلکہ ان کا قلم اس موضوع میں ایک نئی جان ڈال دیتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب بھی ان کی ایک ایسی ہی تالیف ہے جو نہ صرف موضوع کے انتخاب بلکہ اس کی تکمیل میں بھی از اول تا آخر ان کی علمیت کی غماز ہے۔ اپنے 9 صفحے کے عرض مولف میں بھی انھوں نے گویا دریا کو کوزے میں سمو دیا ہے۔ یہ عرض مولف بھی محض روایتی یا رسمی نوعیت کا نہیں بلکہ موضوع کے عین مطابق ہے۔ اس میں انھوں نے نہ صرف اصطلاح کی تعریف کا تعین کیا ہے بلکہ حوالوں کے ذریعے اپنی بات کو مستحکم بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ شمیم طارق نے اصطلاح اور محاورے میں فرق کی بھی وضاحت کی ہے جس سے کم از کم ہم ایسے طالب علموں کے ذہن میں یہ بات زیادہ واضح اور صریح ہو جاتی ہے کہ آخر کیوں اصطلاحیں مشکل ہوتی ہیں۔ شمیم صاحب نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح تصوف کی اصطلاحیں تشکیل پاتی ہیں اور انھیں سمجھنے کے لیے کون سی مخصوص تربیت درکار ہے۔ میں شمیم طارق صاحب کو ایسی اہم کتاب کی تالیف کے لیے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ایسی گراں قدر کتاب کی اشاعت کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

تنویر احمد علوی کا جہانِ معانی (جلد اول و دوم)

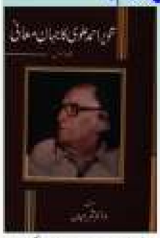

مرتب: ڈاکٹر ثمر جہاں
صفحات: 660+446=1106
قیمت: 380+263=643 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6
مبصر: یوسف رامپوری، ٹانڈہ رامپور، یوپی

ڈاکٹر تنویر احمد علوی اردو زبان و ادب کی مختلف الجہات شخصیت کا نام ہے۔ وہ بیک وقت عظیم مصنف بھی تھے، محقق بھی، تنقید نگار بھی، مترجم، مورخ، شاعر اور استاد بھی۔ ان کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کی تصنیف و تالیف کردہ چالیس سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ان سے کہیں زیادہ ان کے مقالات و مضامین جو مختلف رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئے۔ تنویر احمد علوی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا، انھیں تشنہ لب نہیں چھوڑا، اس لیے ان کی تحریریں قارئین اور ریسرچ اسکالروں کے لیے دستاویزات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے باعث تنویر احمد علوی کے تمام مضامین تک رسائی آسان بات نہیں ہے۔ وہ رسائل جن میں ان کے مضامین شائع ہوئے، ان میں سے بیشتر اب دستیاب نہیں ہیں۔ بعض معدودے چند لائبریریوں میں موجود ہیں، لیکن وہاں تک ہر شخص کی پہنچ مشکل ہے۔ چنانچہ اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ ان کے تمام مضامین کو جو انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور مختلف جرائد و رسائل میں شائع ہوئے، جمع کیا جائے۔ یہ کارنامہ انجام دیا ڈاکٹر ثمر جہاں نے۔ انھوں نے بڑی عرق ریزی سے تنویر احمد علوی کے مضامین کو جمع کرکے ایک کتاب 'تنویر احمد علوی کا جہانِ معانی' ترتیب دے دی جو دو جلدوں میں ہے۔ دونوں ہی جلدیں کافی ضخیم ہیں۔ پہلی جلد 660 صفحات پر مشتمل ہے اور دوسری جلد میں 446 صفحات ہیں۔

جلد اول میں مطالعۂ ذوق کے تحت جو مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ اس طرح ہیں: ذوق کی قصیدہ نگاری، قصائد ذوق کی علمی فضا، ذوق ایک منفرد قصیدہ نگار، ذوق ایک صاحبِ علم و فن شخصیت، ذوق کا معیار قصیدہ نگاری، ذوق اور ظفر اور ذوق کا اسلوب بیان: ایک جائزہ۔ یہ تمام مضامین تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کے ہیں کہ ان سے ذوق اور ان کی شخصیت کی بابت تحقیقی و تنقیدی مواد فراہم ہوتا ہے۔ جو لوگ ذوق کی قصیدہ نگاری یا ذوق کے فن اور شخصیت پر ریسرچ کے خواہاں ہیں، ان کے لیے یہ مضامین گراں قدر ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تنویر احمد علوی موضوع کی تہوں میں جانے کے قائل تھے۔

مطالعۂ غالب کے تحت جو مضامین جلد اول میں مجتمع ہوئے ہیں، وہ اس طرح ہیں: غالب کے سوانحی کوائف، خطوط غالب کی روشنی میں غالب کی سوانح عمری، غالب اور ذہن جدید، غالب اور شعور حیات، 1857 کا ہنگامہ اور خطوط غالب، غالب کا شخصی اسلوب، مہر نیمروز: ایک مطالعہ، عہد غالب میں دلّی کی ادبی محفلیں اور شاعرانہ معرکے، کہتے ہیں جس کو عشق... نسخۂ شیرانی، کنز المطالب شرح دیوان غالب، تصویر کا دوسرا رخ، غالب کے فارسی خطوط، غالب کے فارسی قصائد، فارسی زبان میں غالب کے قصیدہ ہائے حمد و نعت و منقبت اور غالب کی معنویت عصر حاضر میں۔ مطالعۂ غالب کے مضامین کی یہ فہرست اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ غالب پر جن شخصیات نے مستقل کام کیا ہے، ان میں ایک نام تنویر احمد علوی کا بھی ہے جنھوں نے غالب کی شاعری، خطوط نویسی اور شخصیت پر بہت کچھ لکھا۔ اس لیے غالب پر کام کرنے والوں کے لیے تنویر احمد علوی کے ان مضامین کو نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا جو پیش نظر کتاب کی پہلی جلد میں مطالعۂ غالب کے تحت شاملِ اشاعت ہیں۔

ذوق اور غالب دونوں کا زمانہ ایک ہے۔ دونوں ہی اردو کے بڑے شاعر رہے ہیں۔ دونوں کے درمیان بہت کچھ مماثل بھی ہے اور بہت کچھ متفاوت بھی۔ دونوں کے درمیان ادبی معرکہ آرائیاں بھی رہی ہیں۔ مرتبہ ڈاکٹر ثمر جہاں نے ان مضامین و مقالات کو ذوق و غالب کے معاصرین کے عنوان کے تحت جمع کر دیا ہے۔ معاصرینِ ذوق و غالب کے حوالے سے جو مضامین اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں ان میں دو مضامین 'مومن ایک خاص شعری و شعوری روش کا شاعر' اور 'مومن اور ان کے نقاد' ہیں۔ دو مضامین مولوی امام بخش صہبائی پر ہیں۔ ان میں سے ایک 'انتخابِ دواوین' ہے جس کو مولوی امام بخش صہبائی نے ترتیب دیا۔ اس مضمون کے توسط سے کئی شعرا کے دواوین کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ذوق و غالب کے معاصرین کے تحت درج مضمون 'بہادر شاہ ظفر کا ایک نایاب و نادر نسخہ' بھی اہم ہے۔ گویا کہ ذوق و غالب اور ان کے عہد کی شخصیات اور شاعری پر تنویر احمد علوی نے جس تواتر اور استقلال کے ساتھ کتابیں اور مضامین لکھے، ان سے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ عہد ذوق و غالب تنویر احمد علوی کی تحقیق و تحریر کا خاص میدان رہا ہے۔

تنویر احمد علوی کے تحقیقی و تنقیدی میدانوں میں ایک میدان بارہ ماسہ ہے۔ اس موضوع کے حوالے سے انھوں نے کئی مضامین لکھے ہیں۔ مرتبہ ڈاکٹر ثمر جہاں نے اس کتاب 'تنویر احمد علوی کا جہانِ معانی' کی جلد اول میں انھیں مطالعۂ بارہ ماسہ کے ذیل میں درج کیا ہے۔ مطالعۂ بارہ ماسہ کے تحت جمع کردہ مضامین کی فہرست اس طرح ترتیب دی گئی ہے۔ بکٹ کہانی، افضل اور ان کا وطن، بارہ ماسہ کی روایت، بارہ ماسے کی روایت (پنجابی بارہ ماسہ)، سندیش راسک، بارہ ماسہ (ایک مشترک ادبی روایت)۔ بارہ ماسہ کے حوالے سے متذکرہ بالا مضامین بڑی عرق ریزی کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

تنویر احمد علوی صرف محقق و نقاد ہی نہیں تھے بلکہ وہ اچھے مترجم بھی تھے۔ ڈاکٹر ثمر جہاں نے ان کے بعض تراجم کو اس کتاب میں جگہ دے کر ان کی شخصیت و خدمت کے اس پہلو کو بھی اجاگر کر دیا ہے۔ تراجم کے عنوان کے تحت مندرجہ ذیل تراجم کو پیش کیا گیا ہے: تصوف اور عہد ملوکیت، حضرت میاں جیو نور محمد صاحب، پیش لفظ: صحیفۃ الابرار، مکتوباتِ عالیہ، رسالہ صاحبیہ (پہلی قسط) اور رسالہ صاحبیہ (دوسری قسط)۔ ان تراجم کی زبان بہت عمدہ ہے۔

حصہ اول کی ابتدا میں ڈاکٹر ثمر جہاں نے تنویر احمد علوی کا سوانحی خاکہ 'سوانحی کوائف' پیش کیا ہے کہ ایک نظر میں تنویر احمد علوی کی شخصیت سے تعارف ہو جاتا ہے اور ہم آہنگی بھی۔ عرض مرتب کے بعد ایک مقدمہ ہے جو مرتبہ ڈاکٹر ثمر جہاں نے ہی تحریر کیا ہے۔ اسے ایک مبسوط مقدمہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ مقدمہ ساٹھ صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں موصوفہ نے تنویر احمد علوی کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔

پیش نظر کتاب 'تنویر احمد علوی کا جہانِ معانی' کی جلد دوم میں تنویر احمد علوی کے 37 مضامین جلد اول کی طرح مختلف عنوانات کے تحت شامل اشاعت ہوئے ہیں۔ مثلاً کلاسیکی اصناف، شخصیات، متفرقات اور تاثراتی مضامین۔ کلاسیکی اصناف کے ذیل میں جو مضامین آئے ہیں۔ ان کی فہرست اس طرح ہے: داستان ایک سمعی فن، واقعاتی

مرثیے، اردو مرثیہ اور اصلاح معاشرت، شاہجہاں آباد کے مرثیہ نگار، میر تقی میر کی مثنویوں کا تہذیبی پس منظر، ذکرِ میر، میر کی تاریخی حیثیت، سودا کی قصیدہ نگاری، قصائد عرفی، اردو میں مکتوب نگاری کا فن اور انشائے بہارِ بے خزاں اور رقعاتِ مرزا بیدل۔ شخصیات کے تحت جن علمی، ادبی اور عبقری شخصیات پر مضامین شامل ہیں ان میں مولانا محمد حسین آزاد، مولانا شرف الحق دہلوی، امداد الرشید صابری، حکیم عبدالحمید، داغ دہلوی، شیرانی، اصغر گونڈوی، معین احسن جذبی، نورالحسن ہاشمی، امیر حسن عابدی، رشید حسن خاں اور سرسید کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تنویر احمد علوی مختلف میدانوں سے وابستگی رکھتے تھے۔

متفرقات کے تحت مرتبہ نے تنویر احمد علوی کے مضامین تحقیقی تنقید، شاہجہاں آباد۔ ایک تہذیبی روایت، عہدِ محمد شاہجہانی کی جھلکیاں، جدید غزل: فکری وفنی سطح پر ایک نقطۂ انحراف، مقدمہ شعرو شاعری سے ہماری شاعری تک اور اردو کی مشترکہ تہذیبی وراثت کو جگہ دی ہے۔تاثراتی مضامین کی فہرست میں 'خواتین کربلا: کلام انیس کے آئینے میں'، 'اردو زبان اور سماجی سیاق'، 'ڈاکٹر عبدالستار دلوی'، 'مقدمہ شعرو شاعری اور ہماری شاعری' اہمیت کے حامل ہیں۔

کتاب کے آخر میں ڈاکٹر ثمر جہاں نے اپنے دو مضامین 'تنویر احمد علوی اور اصولِ تحقیق وضوابط' اور 'علم وادب کا ستون۔ڈاکٹر تنویر احمد علوی' کو شامل اشاعت کیا ہے۔ اس کتاب کو تنویر احمد علوی کے مضامین کا بہترین انتخاب کہا جاسکتا ہے۔مرتبہ ڈاکٹر صاحبہ مبارک باد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے محنت سے تنویر احمد علوی کے مختلف اوقات میں لکھے اور شائع ہوئے مضامین کو یکجا کرکے کتاب میں محفوظ کرنے کا اہتمام کیا۔مجموعی طور پر دونوں جلدوں میں تنویر احمد علوی کے 76 مضامین جمع ہوگئے ہیں۔مرتبہ نے خود لکھا ہے:

''یہ کتاب (دو جلدوں میں) تنویر احمد علوی کے ان 76 مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنی پچاس سالہ ادبی زندگی کے دوران لکھے اور انھیں گاہے بہ گاہے دیگر رسائل میں چھپوائے۔''

جلد اول کی طرح جلد دوم میں بھی مرتبہ ڈاکٹر ثمر جہاں نے مقدمہ شامل کیا ہے لیکن یہ مقدمہ لفظ بہ لفظ وہی ہے جو جلد اول میں ہے۔جلد دوم میں اسی مقدمہ کی اشاعت کا کوئی حاصل نظر نہیں آتا، کیونکہ جلد اول کے مقدمے میں ہی موصوفہ دوسری جلد کے مضامین سے بھی بحث کرچکی ہیں۔گویا کہ پہلی جلد کا مقدمہ دونوں جلدوں پر مبنی ہے لیکن دوسری جلد میں اسی مقدمے کی اشاعت محض تکرار ہے اور 60 سے زائد صفحات کا ضیاع بھی۔ ایسے ہی دوسری جلد میں عرضِ مرتب کا مضمون بھی وہی ہے جو پہلی جلد میں ہے۔ یہی بات سوانحی کوائف کے بارے میں بھی کہی جائے گی۔ جسے پہلی اور دوسری دونوں جلدوں میں شامل کیا گیا ہے۔مجموعی طور پر سوانحی کوائف، عرض مرتب اور مقدمہ میں 80 کے لگ بھگ صفحات بلا فائدہ خرچ ہوئے ہیں۔ یہ بات اس لیے بھی کہی جاسکتی ہے کہ دونوں جلدوں کو اس طرح شائع کیا گیا ہے کہ وہ مستقل الگ الگ کتابیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی کتاب ہے۔اس لیے دوسری جلد میں اسی مقدمے کی دوبارہ اشاعت کی نہ ضرورت ہے اور نہ افادیت۔کہیں کہیں پروف کی غلطیاں بھی ہیں، لیکن اتنی ضخیم کتاب میں اس نوع کی غلطیوں کا باقی رہ جانا حیرت کی بات نہیں ہے۔مجموعی طور پر یہ کتاب ادبی وعلمی حلقوں کے لیے مفید تر ہے۔ذوق، غالب، مومن اور ان کے عہد کے حوالے سے کام کرنے والوں کے لیے تو یہ کتاب اور زیادہ قیمتی ہے، ساتھ ہی تنویر احمد علوی کی شخصیت، فن اور ان کے کارہائے نمایاں سے واقفیت کے لیے بھی یہ کتاب بہت عمدہ ہے۔ یقیناً اسے ادبی وعلمی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

رموزِ تحقیق

مصنف: ڈاکٹر مسعود جامی

صفحات: 146، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت (سوم): 2017

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 6

مبصر: ابراہیم افسر، وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا

نگر پنچایت، سِوال خاص، ضلع میرٹھ (یوپی) 250501

زیرِ تبصرہ کتاب 'رموزِ تحقیق' ڈاکٹر مسعود جامی کی ادبی، علمی و تحقیقی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔اُردو ادب میں ڈاکٹر مسعود جامی کی شناخت بنیادی طور پر ڈرامہ نویس، افسانہ نگار اور شاعر کی ہے۔موصوف ایک عرصے تک رانچی یونی ورسٹی سے ملحق کالج جے این کالج میں صدر شعبہ اُردو کے عہدے پر فائز رہے۔مبارک باد کے مستحق ہیں ڈاکٹر مسعود جامی صاحب جنھوں نے تحقیق جیسے خشک موضوع پر قلم اُٹھا کر اپنی صلاحیت اور قابلیت کو دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا۔عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ اساتذہ تحقیق کے بجائے تنقید کو ترجیح دیتے ہیں۔دراصل تحقیق آنکھوں سے تیل ٹپکانے کا عمل ہے۔تحقیق میں سہل پسندی مانندِ زہر ہے۔یہ کتاب پہلی بار 2010 میں منظرِ عام پر آئی۔محض سات برسوں میں اس کے تین اڈیشن بازار میں آچکے ہیں۔اس کتاب کی وجہ تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود جامی رموزِ تحقیق کے حرفِ اوّل میں لکھتے ہیں:

''تحقیق کے طالب علم کو ریسرچ کے رموز ونکات سے آگہی ہونی چاہیے۔مگر اس سب سے پہلے اپنے طالب علم کو اس کی طرف متوجہ کرائے تو تحقیق کے کام کے قدرے بہتر ہونے کا امکان ہے۔لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ اب بھی ریسرچ Methodology پر اُردو میں کتابیں فوراً دستیاب ہو جاتی ہیں۔اُردو میں ایسا نہیں ہے۔اس زبان میں تحقیق پہلے کی جاتی ہے طریقۂ تحقیق پر کتاب بعد میں لکھی جاتی ہے۔''

(رموزِ تحقیق (اشاعت سوم)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، 2017، صفحہ 7)

اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے قبل ہمارے ادبی بزرگوں نے اس ضمن میں خاطر خواہ کام کیا ہے۔سرسید احمد خاں کی کتابوں میں تحقیق اور تنقید کے دونوں پہلو ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب آبِ حیات میں تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیقی پہلو بھی نمایاں ہیں۔اسی طرح خواجہ الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعروشاعری میں جہاں ایک جانب تنقیدی پہلو نمایاں ہیں وہیں دوسری جانب ہمیں اس میں تحقیقی نقوش بھی دستیاب ہوتے ہیں۔علامہ شبلی نعمانی، مولوی عبدالحق، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی کی تحریروں میں بھی تحقیقی پہلو نظر آتے ہیں۔اُردو ادب میں باقاعدہ تحقیق کو ایک فن کے طور پر حافظ محمود خاں شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اُردو کے ذریعے متعارف کرایا۔متقدمین میں عبدالرزاق قریشی کی کتاب مبادیاتِ تحقیق کو اس تعلق سے اولیت حاصل ہے۔عبدالرزاق قریشی کے علاوہ ڈاکٹر خلیق انجم کی متنی تنقید، رشید حسن خاں کی ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی کتاب اصولِ تحقیق ترتیب ومتن، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب، ذوق وجستجو، پروفیسر کلب عابد کی کتاب عمادالتحقیق، ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیق کا فن ڈاکٹر شمین اختر کی کتاب تحقیق کے طریقۂ کار، ڈاکٹر سید حامد کی کتاب تحقیق اور حاصلِ تحقیق، ڈاکٹر مشفق خواجہ کی تحقیقی مقالات، ڈاکٹر ابن کنول کی کتاب تحقیق وتدوین وغیرہ کے علاوہ کچھ ایسی کتابیں بھی منظرِ عام پر آئیں جو تحقیق مضامین کے مجموعے تھیں۔ان میں پروفیسر کلیم الدین کی کتاب مقالاتِ قاضی عبدالودود، ایم شاہد اعظمی کی مرتب کردہ اُردو تحقیق اور مالک رام کا نام قابل ذکر ہے۔کتابوں کے علاوہ رسائل وجرائد کے خصوصی گوشے اور تحقیقی نمبر بھی منظرِ عام پر آئے جو طلبہ کے ساتھ

ساتھ اساتذہ کے لیے کارآمد ثابت ہوئے۔ ان رسائل میں رسالہ آجکل کا تحقیق نمبر اور رسالہ نقوش کا تحقیق اور تصحیح متن نمبر کو فوقیت حاصل ہے۔

رموزِ تحقیق کو ڈاکٹر مسعود جامی نے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اوّل میں تحقیق کا مطلب، اس کی تعریف، تحقیق کی قسمیں، ادبی تحقیق کی وسعت اور اقسام، تحقیق اور تنقید کا رشتہ، ادبی تحقیق کی صورتِ حال اور طریقۂ کار، محقق کے اوصاف اور فرائض اور نگراں کے اوصاف اور فرائض پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں موضوع کا انتخاب کے تحت موضوع کے انتخاب کی ضرورت، خوبیاں، حدود، تنوع، اور موضوع کا انتخاب کیوں کرنا چاہیے؟ کے ساتھ طریقۂ کار، موضوع کی پہچان اور پرکھ پر تحقیق طلب باتیں کی گئی ہیں۔ تیسرے باب میں تحقیقی منصوبہ بندی عنوان کے تحت خاکہ، خاکہ کی ضرورت، خاکے کو مرتب کرنے کی ضرورت، فکری نکات اور تقسیم کرنے کے طریقے، دیباچہ یا تمہید، خاکے کی اقسام، خاکہ اور نگراں، خاکہ اور ترمیمات کے ذیلی باب قائم کیے گئے ہیں۔ چوتھے باب میں ڈاکٹر مسعود جامی نے مواد کی فراہمی اور ان کی پرکھ کا عنوان قائم کرتے ہوئے بنیادی مواد کی اہمیت وافادیت پر توجہ مرکوز کی۔ پانچویں باب میں مواد کی ترتیب اور پیش کش، اصل متن کا مطالعہ، متن اور بنیادی نکات، متن اور مقالے کی تسوید، امدادی اور بنیادی کتب کا مطالعہ، فراہم کردہ مواد کا استعمال، مقالے کی تسوید میں ابواب کی ترتیب، اختتامیہ اور مواد، ضمیمہ، تمہید اور مواد، حوالوں، اقتباس اور نشانات کے مندرجات کی نشان دہی پر توجہ مرکوز کی۔ چھٹے اور آخری باب میں ڈاکٹر مسعود جامی نے مقالے کی ہیئت، زبان و بیان، کتابت اور جلد سازی، مقالے کی تصحیح اور انٹرویو پر اپنا اظہارِ خیال پیش کیا۔

ڈاکٹر مسعود جامی نے اس کتاب میں اُن تمام تحقیقی نکات اور امور پر اپنی بات کو مدلل طریقے سے رکھا جن سے طلبہ اور نگراں کا سابقہ دورانِ تحقیق ہوتا ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ طلبہ بنیادی مواد کی بجائے ثانوی مواد اور ماخذ پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ تساہل کا یہ عالم ہے کہ انٹرنیٹ پر موجود تحقیقی مواد کو ہی بنیادی مواد سمجھ کر پیش کیا جاتا ہے۔ دورانِ تحقیق طلبہ صرف اپنے شہر میں رہ کر ہی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اُن مقامات، کتب یا لائبریریوں سے مستفیض نہیں ہوتے جہاں انھیں اپنے موضوع سے متعلق بنیادی مواد کے فراہم ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ طلبہ یہ زحمت بھی گوارہ نہیں کرتے کہ جس موضوع پر وہ تحقیق کر رہا ہے کیا اس موضوع کے تعلق سے کسی اور یونی ورسٹی یا بیرونِ ملک بھی پی ایچ ڈی ہوئی ہے یا نہیں؟ دیکھنے میں یہ بھی آتا ہے کہ ایک ہی موضوع پر ایک ہی یونیورسٹی میں تھوڑے بہت ردّ و بدل کے ساتھ تحقیقی کام منظرِ عام پر آتے ہیں۔ بہر کیف! رموزِ تحقیق میں ان تمام امور پر ڈاکٹر مسعود جامی صاحب نے مفصل بحث کی ہے جو دورانِ تحقیق طلبہ کے لیے کارآمد اور مفید ہوگی۔ اس کتاب کی ضخامت اتنی ہے کہ طلبہ اسے ایک ہی نشست میں اس کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

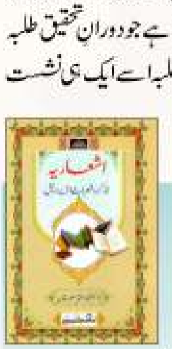

اشاریہ تذکرہ شعرائے اتر پردیش

مرتب: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں

صفحات: 152، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں

مبصر: ڈاکٹر الف ناظم، شعبۂ اردو، گورنمنٹ پی جی کالج، دیوبند ضلع سہارنپور (یوپی)

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو، اداروں اور انجمنوں کے کاموں کو تنِ تنہا پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتی ہیں۔ معروف محقق اور تذکرہ نگار، ڈاکٹر عرفان عباسی بھی ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے جنھوں نے ہزاروں شعراء کا کلام اور سوانحی حالات کو تذکروں میں محفوظ کر دیا۔ 32 جلدوں پر مشتمل تذکرۂ شعرائے اتر پردیش ڈاکٹر عرفان عباسی مرحوم کا وہ کارنامہ ہے جس کے ذریعے ہزاروں گمنام شعراء کو حیاتِ دوام تو حاصل ہوئی ہی، محققین اور ریسرچ اسکالرز کے لیے بھی بڑی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب 'اشاریہ تذکرۂ شعرائے اتر پردیش' عباسی صاحب کی 32 جلدوں پر مبنی تذکروں کا اشاریہ ہے جسے اردو کے معروف محقق، نقاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے مرتب کیا ہے۔ مذکورہ اشاریے سے قبل بھی ڈاکٹر اطہر مسعود خاں کے مرتب کیے ہوئے متعدد اہم اشاریے منظرِ عام پر آکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اور بہت سے اشاریے ابھی اشاعت کے منتظر ہیں۔ اردو میں عموماً رسائل کی اشاریہ سازی کا رجحان ہے لیکن ڈاکٹر اطہر مسعود خاں نے اردو کی اہم کتابوں، تذکروں اور مایہ ناز مصنفین کی خدمات کے اشاریے ترتیب دے کر اشاریہ سازی کے میدان میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر عرفان عباسی مرحوم نے جتنی محنت سے شعرا کا کلام اور ان کے حالات قلمبند کر کے انھیں تذکروں میں محفوظ کر دیا ہے، ہمارے عہد میں اس کی دوسری مثال نظر نہیں آتی۔ ان کی تذکروں پر مبنی کتابیں 'آپ' آپ ہیں 'آپ تھے' اور 'تذکرۂ شعرائے اتر پردیش' اردو زبان کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ایک طرف جہاں ان تذکروں میں بہت سے معروف شعرا و ادبا کے خاکے شامل ہیں تو دوسری طرف ہزاروں غیر معروف شعرا کے خاکے ان تذکروں میں شامل کر کے انھیں اردو کی ادبی تاریخ کا حصہ بنا کر آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اطہر مسعود، عباسی صاحب کی تذکرہ نگاری کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''قدیم تذکروں میں شاید ہی اس قدر معلومات یکجا کی جاتی ہوں جتنی عرفان عباسی صاحب نے اپنے تذکروں میں اکٹھی کر دی ہیں۔ انھوں نے شعرا سے متعلق تمام بنیادی اور ضروری باتوں کو بڑی خوبصورتی سے ترتیب دیا ہے۔ شعرا کے نام، تخلص، ولدیت، تلمذ، تعلیم، سکونت، تاریخ ولادت و وفات، تصاویر، قلمی اسکیچ، عکس تحریر، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے نام، خاندان، اولادیں، مشاعروں میں کلام پڑھنے کا انداز، مشاغل، عادات و اطوار، سماجی مالی اور ادبی حیثیت، طرزِ گفتگو، لباس، چال ڈھال، وضع قطع غرض چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی تذکرے میں شامل کرنے سے عباسی صاحب نے گریز نہیں کیا۔ انھوں نے تذکروں میں دونوں طرح کے شعرا کو یکجا کیا یعنی ایک وہ جو اردو کے مشہور و معروف شاعر ہیں اور دوسرے وہ شعرا جو صرف اپنے علاقے تک معروف ہیں۔''

ڈاکٹر اطہر مسعود خاں ایک عرصے سے رامپور رضا لائبریری، رامپور سے وابستہ ہیں۔ وہ رضا لائبریری سے رجوع کرنے والے ریسرچ اسکالرز کی بڑی مدد کرتے ہیں۔ انھیں محسوس ہوا کہ لائبریری میں آنے والے اسکالرز کو اپنے موضوع سے متعلق مواد کی تلاش میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہزاروں کتابوں کو بیک وقت دیکھنا آسان نہیں۔ اگر رسائل یا کتب کے اشاریے موجود ہوں تو طلبہ و اسکالرز کو اپنے مطلوبہ مواد تک رسائی حاصل کرنا بے حد آسان ہو جاتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر اطہر مسعود لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک روز رضا لائبریری میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی پی ایچ ڈی کی ایک اسکالر کو وہاں موجود 'تذکرۂ شعرائے اتر پردیش' کی سبھی جلدوں کو کھنگالتے ہوئے دیکھا۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ انھیں لکھنؤ کے ایک شاعر کے تذکرے اور سوانحی تعارف کی تلاش ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں بتایا کہ ان ساری جلدوں میں مطلوبہ شاعر کی تلاش و جستجو میں آپ کا بہت سا وقت ضائع ہوگا اور چونکہ میں نے 'تذکرۂ شعرائے اتر پردیش' کی سبھی جلدوں کا اشاریہ مرتب کیا ہے اس لیے چند منٹوں ہی میں آپ کو بتایا جا سکتا ہے کہ آپ کا مطلوبہ شاعر کون سی جلد میں ہے۔ اور یہ درست ہے کہ جامعات میں تحقیق کرنے والے اسکالروں کا مطلوبہ مواد تک رسائی حاصل

کرنا، بڑا دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔ دوسرے ان کو اس بات کا عموماً علم بھی نہیں ہوتا کہ ان کے موضوع سے متعلق مواد کہاں کہاں دستیاب ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اشاریے کی مدد سے مواد حاصل کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے اور وقت بھی ضائع نہیں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اطہر مسعود نے زیر تبصرہ کتاب کا وقیع مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں تذکرہ نگاری کی روایت، اس کی اہمیت و افادیت پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ، ڈاکٹر عرفان عباسی کی خاکہ نگاری و تذکرہ نگاری کی خصوصیات اور امتیازات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اطہر مسعود لکھتے ہیں کہ عرفان عباسی صاحب نے تقریباً دس ہزار ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ مرتب کیا۔ جن میں 32 جلدوں پر مشتمل تذکرۂ شعرائے اتر پردیش بھی شامل ہے۔ اس تذکرے کی ہر جلد میں پچاس شاعروں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اور ہر جلد لگ بھگ 350 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس طرح 32 جلدوں میں 1600 شاعروں کا تذکرہ گیارہ ہزار سے زائد صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ محققین و ریسرچ اسکالرز کو اپنے مطلوبہ مواد کی تلاش و جستجو میں گیارہ ہزار صفحات کی ورق گردانی میں دشواری ہوگی۔ دوسرے، تذکرے میں ایک ہی نام اور تخلص کے کئی کئی شاعر موجود ہیں۔ چنانچہ انھیں دشواریوں سے بچنے اور اسکالرز کی سہولت کے لیے ڈاکٹر اطہر مسعود خاں نے مذکورہ تذکرے کی بتیسوں جلدوں کی اشاریہ سازی کا ڈول ڈالا۔ یہ اشاریہ کئی برس کی محنتِ شاقہ کے بعد منظرِ عام پر آسکا ہے۔ مرتب نے کتاب کو ہر اعتبار سے مفید اور کار آمد بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اشاریے میں ڈاکٹر عرفان عباسی صاحب کی تمام مطبوعہ کتب کی فہرست (تاریخ وار اور باعتبارِ حروفِ تہجی) دی گئی ہے۔ مرتب نے عباسی صاحب کو تفویض کیے گئے اعزازات کی بھی ایک فہرست درج کردی ہے۔

عباسی صاحب نے تذکرۂ شعرائے ریختی بھی مرتب کیا تھا، کتاب کے آخر میں اس کا بھی اشاریہ شامل کردیا گیا ہے۔ غرض یہ کہ ''اشاریہ تذکرۂ شعرائے اتر پردیش'' محض اسکالرز کے لیے ہی مفید نہیں ہے، ڈاکٹر عرفان عباسی پر تحقیقی کام کرنے والے محققین کے لیے بھی مشعلِ راہ کا کام دے گا۔

تصوف

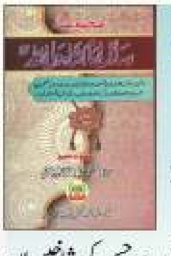

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ (جلد اول)

مرتب: مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

صفحات: 645، قیمت: 350 روپے

ملنے کا پتہ: شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، مسجد کا کا نگر، نئی دہلی۔ 110003

مبصر: ڈاکٹر مولانا بدر الحسن قاسمی کویت

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مثال اس شجرہ طوبیٰ کی ہے جس کی شاخیں ان کے بعد برپا ہونے والی تمام دینی و علمی سرگرمیوں پر سایہ فگن ہے چنانچہ فکر و نظر کے اختلاف کے باوجود امت کا ہر طبقہ ان کی طرف انتساب پر فخر محسوس کرتا ہے اور ہر گروہ ان کی تعلیمات کو اپنے لیے مشعل راہ اور نشان ہدایت سمجھتا ہے۔ عام علمائے دین ہی نہیں مجددین امت کی فہرست میں بھی ایسی جامعیت رکھنے والی کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی۔

اگر وہ فتح البیان، الفوز الکبیر اور فتح الخبیر میں عظیم مفسر اور قرآنی اسرار و حقائق کے ماہر نظر آتے ہیں تو موطا امام مالک کی شرح المسوی المصفی شرح تراجم ابواب البخاری میں بلند پایہ محدث اور علوم حدیث کے دروبست سے باخبر شارح و ناقد معلوم ہوتے ہیں جبکہ اپنی مایہ ناز تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں فلسفہ دین کے رمز شناس اور احکام شریعت کے اسرار و مقاصد کے محرم راز نظر آتے ہیں جو ان کا امتیاز ہے اور جس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نظر نہیں آتا لیکن جو لوگ ان کی فیوض الحرمین، تاویل الاحادیث اور الخیر الکثیر کے ساتھ ہمعات، لمعات، تفہیمات الٰہیہ اور انفاس العارفین وغیرہ پر نظر رکھتے ہیں انھیں وہ شیخ محی الدین ابن عربی، صدر الدین قونوی، اور سمنائی وغیرہ کی زبان بولتے نظر آتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ علم الحقائق یا نظریاتی تصوف کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جو خواطر و واردات اور الہام و انکشافات پر مبنی ہے، شرعاً جن کا نہ جاننا لازم ہے اور نہ ان کے ماننے اور تسلیم کرنے کا انسان مکلف ہے۔ چنانچہ خود حضرت شاہ صاحب نے ایسی باتوں سے برأت کا اظہار کیا ہے جو شرعی نصوص سے متصادم ہوں یا جو امت کے اجماعی اور متفقہ فکر و عقیدہ سے الگ ہوں۔ جہاں تک مکتوبات کا تعلق ہے تو اہل دل کے مکاتیب بڑے ہی مفید و موثر ہوا کرتے ہیں، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے مکتوبات کو ہی اپنے اظہار خیال کا ذریعہ اور حقائق کے بیان کا وسیلہ بنایا ہے چنانچہ ان کے مکتوبات علم و عرفان کا بیش قیمت خزینہ ہیں اور سیکڑوں علمی کتابوں پر بھاری ہیں، اسی طرح شیخ شرف الدین یحیٰ منیریؒ اور خواجہ محمد معصومؒ کے مکتوبات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ پہلے شائع ہوچکے ہیں اور مکتوبات کا مجموعہ بھی علوم و معارف کا بیش قیمت خزینہ ہے جو فارسی سے اردو میں منتقل کیے گئے ہیں ان میں کہیں ذاتی احوال ہیں تو کہیں تصوف کی بعض اصطلاحات کی تشریح اور سالک کے پیش آنے والے مقامات کی وضاحت اور اعمال کی تلقین۔

مجھے خوشی ہے کہ مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی اب تک 9 جلدیں شائع ہوچکی ہیں جس کی متعدد جلدیں میرے پاس ہیں اور مطالعہ میں رہی ہیں، اس کی پہلی جلد میں ہمعات، سطعات، لمعات، الطاف القدس اور الخیر الکثیر وغیرہ کتابیں شامل ہیں جو تصوف و سلوک کی تشریحات و توضیحات، اور مصطلحات پر مشتمل ہیں، جن سے کوئی بھی طالب تصوف و سلوک مستغنی و بے نیاز ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور اسلامی تصوف کی تفہیم کے لیے اس مجموعہ رسائل کا مطالعہ، از حد ضروری ہے۔

مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی نے عربی اور فارسی زبان سے اردو زبان میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے علوم و معارف پر مبنی ان کی تصنیفات و افادات کو معیار و انداز سے شائع کرنے میں اپنا خاص مقام بنالیا ہے اور اپنی پیہم جدوجہد اور مسلسل محنت سے اپنے قائم کردہ ادارہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، علمی حلقہ میں متعارف کرالیا ہے اس لیے وہ اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہے۔

امید ہے کہ ان کی یہ پیش کش عام قارئین اور تحقیق و ریسرچ کے شائقین سب کے لیے یکساں مفید ہوگی اور کتاب کو قبول عام و خاص حاصل ہوگا۔

طب و صحت

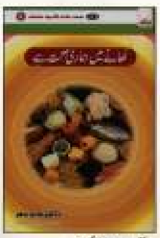

کھانے میں ہماری صحت ہے

مصنف: ڈاکٹر عابد معز

صفحات: 50، قیمت: 40 روپے

ناشر: ہدیٰ پبلی کیشنز، پرانی حویلی، حیدرآباد

مبصر: جاں نثار معین، سینئر ریسرچ اسکالر، ڈپارٹمنٹ آف ویمن ایجوکیشن، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، تلنگانہ

مشرقی تہذیب کے شیدائی ڈاکٹر عابد معز عصر حاضر کے منفرد طنز و مزاح نگار اور بہترین

طبیب ہیں۔ قدیم وجدید دونوں علوم وفنون سے واقف ہیں، اور اردو زبان وادب کے رمز آشنا بھی ہیں۔ حالانکہ وہ پیشے سے طبیب ہیں لیکن خود ادب کے مریض ہیں۔ انھوں نے اصناف ادب کے کئی گوشوں پر اپنے فہم وادراک سے صفحۂ قرطاس پر روشنی بکھیر دی ہے۔

زیر نظر کتاب 'کھانے میں ہماری صحت ہے' کتابچہ لکھ کر سائنسی بصیرت سے آگہی پیدا کی ہے۔ کیونکہ کھانے میں مختلف قسم کی غذائیں دستیاب ہیں صحیح غذا کا انتخاب کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اسی لیے مصنف نے اچھی صحت کے لیے کس طرح کی غذا استعمال کرنا چاہیے اس پر چند سوالات اٹھائے ہیں۔ ہم کیوں کھاتے ہیں؟، ہمیں کھانے کی ضرورت کیوں ہے؟ روایتی کھانے اور فاسٹ فود کیا ہیں؟ ہمیں کتنا کھانا چاہیے؟ اور غیر صحت بخش کھانے کے نقصانات کیا ہیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر ہر دن فکریں ہوتی رہتی ہیں۔ کیونکہ اچھی صحت کے لیے ہمیشہ انسان سوچتا ہے کہ ہمیں کیوں، کیسے اور کب کھانا چاہیے۔ ان تمام اشکال کے جوابات کو بڑی سہل اردو میں مصنف نے بڑی باریک بینی سے مشاہدات کی روشنی میں بیان کیا ہے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم فرماتے ہیں ''ہاضمہ کی شکایات زیادہ تر غلط قسم کی خوراک کھا لینے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ دیگر امراض کا گھٹاؤ بڑھاؤ (بھی) بڑی حد تک غذا پر منحصر ہے'' اس سے معلوم ہوتا ہے انسان اچھی صحت کا مالک بننے کے لیے غذا زود ہضم ہو اور غذائیت سے بھرپور۔ جو لوگ صحیح غذا نہیں کھاتے ایسے لوگ متعدد امراض میں مبتلا ہو کر ہسپتالوں، نجی کلینکوں اور معالجین کے ہاں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ قدرت نے بھوک پیدا کی تاکہ انسان کو اپنی غذائی ضروریات کا احساس ہو۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عابد معز کا خیال ہے:

صحت کی برقراری اور بہتری اور امراض بالخصوص غیر متعدی کہنی امراض (Non Communicable Chronic Diseases) کے بچاؤ میں کھانا یا غذا کا بہت اہم اور بڑا رول ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کی ایک پرانی کہاوت ہے کہ We are what we eat۔ علم تغذیہ کی ترقی نے اس کہاوت کو صحیح ثابت کر دکھایا ہے۔ ہمارے جسم کا ہر خلیہ اس غذا، پانی اور ہوا سے تیار ہوتا ہے جو ہم کھاتے، پیتے اور سانس لیتے ہیں۔ غذا ہماری نشو ونما کرنے کے علاوہ ہماری ساخت اور نفسیات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ غذا سے ہم بہت حد تک کہنہ امراض میں مبتلا ہوتے یا محفوظ رہتے ہیں۔ غذا ہی ہماری عام صحت بنائے رکھنے میں معاون ہوتی ہے۔ صحت بخش کھانے صحت کو برقرار رکھتے ہیں تو غیر معیاری اور غیر متوازن غذا سے ہماری صحت خراب ہو سکتی ہے۔ اس بات کو ہم اردو میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''کھانے میں ہماری صحت ہے۔''

اپنی غذائی ضروریات کا سارا دارومدار اپنی خواہشات کے مطابق ہے یعنی جس چیز کو جس وقت چاہا کھا لیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ بھوک کا تصور ہی ختم کر دیا گیا۔ گویا جو لوگ غذا کے معاملے میں قوانین قدرت کی پیروی نہیں کرتے یا اس کی اہمیت کو سمجھے بغیر من مانی کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ امراض کی شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر عابد معز نے غذا، اس کی اہمیت وضرورت اور اس کے استعمال کے موضوع پر ایک تحقیقاتی کتابچہ 'کھانے میں ہماری صحت' تیار کیا۔ مصنف نے کھانے کی خرابیاں اور غذا کی خوبیاں دونوں کی بہترین عکاسی کی ہے۔ اس تصنیف میں انگریزی اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے۔ مصنف نے قدرتی اشیا سے علاج پر خصوصی توجہ رکھی ہے۔ یہ تصنیف اپنے آپ میں ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلوب معیاری، طرز نگارش دل کش، زبان وبیان نقص سے پاک اور عام فہم جملوں کا استعمال ہوا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں غذا اور صحت کو جس مربوط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ مصنف کے وسیع مطالعے، گہرے تفکر اور تحقیقی کدو کاوش کا بین ثبوت ہے۔ توقع ہے کہ ڈاکٹر عابد معز کا یہ تحقیقی کام علمی طبی حلقے میں تحسین کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ غذا اور صحت پر دوبارہ غور وفکر کے نئے دریچے کھلیں گے۔ غذا شناسی کی راہ میں یہ تصنیف ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی قرأت کے بعد کھانے میں ہماری صحت کس طرح اہم ہے۔ اس پر دوبارہ غور وخوض کیا جائے گا۔ یہ کتابچہ بے حد مفید ہے ہر گھر میں ہونا چاہیے۔

شاعری

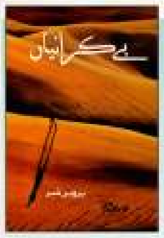

بے کرانیاں (شعری مجموعہ)

مصنف: پروین شیر
صفحات: 294، قیمت: 1200 روپے، سنہ اشاعت: 2018
پیش کش: ادارہ نیا ادب بنگلور
مبصر: جاوید عالم، 211، کاویری ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

پروین شیر ایک شاعرہ، مصورہ اور سفرنامہ نگار کی حیثیت سے کافی مقبول ہیں۔ ان کی شاعری اور سفرنامے پر مختلف مگر اہم ترین نقادوں نے جو مضامین لکھے ہیں ان سے بھی ان کے کلام کی قدر وقیمت کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں سے قمر رئیس، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی، عتیق اللہ اور ابوالکلام قاسمی وغیرہ کے علاوہ اور بہت سے لوگ ہیں۔ پروین شیر کی شاعری میں مجھے جس چیز نے بہت زیادہ متاثر کیا وہ ان کے موضوعات کا تنوع ہے۔ عام طور پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ شعرا بہت جلد خود کو دہرانے لگتے ہیں گویا ان کی زندگی کے تجربات کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہوتا کہ وہ ہر تخلیقی شہ پارے کے ساتھ ایک نئے وجود کا احساس دلائیں۔ پروین شیر کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ایک معروف مصور بھی ہیں اور ان کی ہر کتاب ان کی مصوری سے ہم آمیز ہوتی ہے۔ مصوری میں وہ گہرے رنگوں کا استعمال زیادہ کرتی ہیں اور گہرے رنگ بھی ایک سے زیادہ ہوتے ہیں اور آپس میں گڈمڈ بھی ہوتے ہیں۔ مصوری کے ان نمونوں میں مصور کے باطن کے درد کو فوراً محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ درد ذاتی بھی ہے اور آفاقی بھی۔ یہ ایک ایسا درد ہے جس کے کئی نام ہیں اور سب احساس کرب اور احساس نا آگہی سے جا کر مل جاتے ہیں۔

پروین شیر کی شاعری میں انھوں نے اپنے ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کرب کا اظہار زیادہ کیا ہے اور یہ کرب اس نا آگہی کے احساس کے ساتھ وابستہ ہے جو ان کی ذات اور دنیا کے مابین واقع ہے۔ 'شہر بے پایاں' ان کی ایک مشہور نظم ہے۔

سورج اوڑھے تپتی ریت پر چلتے رہنا
چلتے چلتے / منہ کے بل گر کر اٹھ جانا
کپڑے جھاڑ کر / چہرے سے مٹی اور گرد ہٹا کر
زخمی تلووں پر پھاہا رکھ کر، ریتیلی
لمبی تپتی پگڈنڈی پر / چلنا، گرنا، اٹھنا، چلنا
پھر گر جانا...

نظم کیا ہے، گویا انسانی زندگی کا پورا منظر نامہ قلم بند کر دیا ہے، کوئی راستہ سیدھا نہیں ہے، ہر لمحہ ایک چیلنج ہے، امید اور ناامیدی، سعی وسعی لا حاصل، پھر بھی مسافت ایک جبر ہے جسے کسی منزل پر ختم ہو جانا ہے۔ لیکن غور کرنے کا مقام ہے کہ پروین شیر نے 'پھر گر

جانے' پر نظم کو ختم کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ نظم رجا اور امید پر ختم ہو رہی ہے بلکہ ختم نہیں ہو رہی ہے جاری ہے کیونکہ زندگی کا سفر ابھی جاری ہے خواہ پتھریلے راستے ہوں کہ سکڑی سمٹی ہوئی پگڈنڈیاں یا اوبڑ کھابڑ اور خاردار زمین، گرنا محض ایک سنگ میل ہے۔ پروین شیر کی نظموں میں اس قسم کا علامتی رنگ بہت گہرا ہے جس کی بیرونی سطح بہت شفاف دکھائی دیتی ہے کیونکہ اس میں ڈکشن کا نظم وضبط ہوتا ہے لیکن اندر ایک پگھلا ہوا لاوا ہوتا ہے یا زندگی اپنی پوری رنگارنگی کے ساتھ لفظوں کا جامہ پہن لیتی ہے، 'تخلیقیت' کے یہ مصرعے دیکھیں۔

فکر کی پو پھٹی/ راستوں کی ہیلی سے لپٹی ہوئی
رات سے ایک سنہری کرن/ یوں ہویدا ہوئی
جیسے درخشاں ستاروں کا ایک جال ہو
یا رو پہلے دیے کی تھرکتی ہوئی/ ایک لونور کی کھینچتی ہو لکیریں ہزار
یا سیاہی کی چادر پہ ہو جیسے چاندی کی جھلمل سی گوٹ

پوری نظم حرکی پیکروں کا ایک دبستان ہے۔ شاعرہ کو لفظوں سے تصویریں بنانا ہی نہیں آتا ڈرامہ سازی کا فن بھی آتا ہے'اک سنہری کرن یوں ہویدا ہوئی' یا 'ایک لونور کی کھینچتی ہو لکیریں ہزار/ یا سیاہی کی چادر پہ ہو چاندی کی جھلمل سی گوٹ'۔ سنہری کرن کا یکا یک ہویدا ہونے میں حس باصرہ کا عمل دیدنی ہے۔ نور کی کھینچتی ہو لکیریں ہزار میں بصری پیکر بن رہا ہے اور کھینچتی میں سمعی پیکر تشکیل پا رہا ہے کیونکہ کسی بھی چیز کو جب کھینچا جاتا ہے تو اس عمل میں آواز بھی پنہاں ہوتی ہے۔ نور میں ایک مابعد الطبعیاتی رنگ بھی شامل ہو گیا ہے اور پھر نور مجرد ہے جسے شاعرہ نے مجسم کر دیا ہے اور جو ایک سماوی تاثر پیدا کر رہا ہے۔ آخری مصرعہ کے بارے میں بس یہی کہنا چاہوں گا کہ شاعرہ نے سیاہی اور چاندی کے تضاد کو جس طریقے سے ہم آہنگ کر دیا ہے اسے فن کا کمال ہی کہنا چاہیے۔ جھلمل میں بھی حرکت ہے گویا پوری نظم میں ایک ایسا تحرک ہے جو سیدھا ہمارے حواس پر اثر انداز ہوتا ہے۔

میری نظر میں پروین شیر کی شاعری image making کے ارد گرد گردش کرتی ہے۔ وہ سوچتی ہیں تصویروں میں، وہ سوچتی ہیں رنگوں میں، وہ سوچتی ہیں پیکروں میں اور ان کی مصوری صرف رنگوں اور لکیروں کا کمال نہیں ہے بلکہ ان کی ہر پینٹنگ میں شعریت کا رنگ بھی شامل ہے۔ ان کے درد کے اظہار میں مٹھاس اور نرمی ہے، نغمگی ہے، غنائیت ہے، وہ پھولوں سے رنگ اور خوشبوئیں چراتی ہیں، چاند سے چاندنی، تتلیوں سے ان کا رقص، شبنم سے اس کی نمناکی، شعلے سے اس کا نور اور ان سب سے مل کر جو چیز تیار ہوتی ہے وہ پروین کی شاعری اور ان کی مصوری ہے لیکن یہ سب زندگی کے کارزار میں ہوتا ہے جو تضادات سے معمور ہے اور کبھی کسی ایک رنگ پر قائم نہیں رہتا۔ اسی لیے پروین کی شاعری امید اور نا امیدی، نا امیدی اور امید کے درمیان پنڈولم کی طرح جھولتی رہتی ہے۔

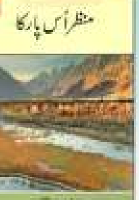

منظر اُس پار کا

شاعر: محمد مختار وفا

صفحات: 165، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز دہلی 95

مبصر: سعید اختر اعظمی، اعظم گڑھ، یوپی

روداد لمحہ بہ لمحہ بدلتے رنگوں کی ہو یا طلوع صبح وغروب آفتاب کی، اپنا منفرد اسلوب رکھتی ہے۔ دل کا کیا ہے وہ تو کچھ نہ کچھ کہتا ہی رہتا ہے، مگر رنج وراحت کا اعلامیہ بن کر 'چشم بینا' ہی سامنے آتی ہے اور ہر وہ روداد سناتی ہے جو دل پہ گزرتی ہے۔ اس میں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی تعبیریں بھی ہوتی ہیں اور تشنہ طلبی کی شرح بھی۔ محمد مختار وفا راز دروں کا اظہار کرنے والی آنکھوں کو 'شاداب چمن کی لال پری' کا اعزاز دیتے ہیں جو صبح کی دستک ہوتے ہی سکون وچین چرالے جاتی ہے۔ وہ سرخی چشم نم کو غم کا آئینہ خانہ تسلیم کرتے ہیں جو برفابی ہونے کے سبب سیل رواں بننے سے قاصر ہے اور قطرہ قطرہ نوک مژگاں پہ ٹھہرنا ہی اس کا نصیب ہے۔

'سفر ادھورا ہے' (1986) کی تکمیل کی خاطر اپنے دوسرے سخن پڑاؤ 'منظر اُس پار کا' پہ چند لمحے ٹھہر کر آگے بڑھنے کا قصد رکھنے والے محمد مختار وفا (ولادت: یکم مارچ 1955، وفات: 9 اگست 2018) کا یہ آخری پڑاؤ ثابت ہوا۔ اس میں چشم وخواب کے تذکرے کے شانہ بہ شانہ دیگر روایتی موضوعات بھی ہیں جسے بحسن وخوبی برتا گیا ہے۔ 150 سے زائد غزلوں اور مناجات کے درون میں جن احساسات کو عیاں کیا گیا ہے وہ نوائے دل ہی نہیں ترجمان حالات حاضرہ بھی ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے۔

قصہ ہوا تمام، سبھی گھر کو چل دیے
کوئی بھی نوحہ خواں نہیں بجھتے الاؤ پر

سب قتل ہو چکے ہیں تو حیرت کی بات کیا
حیرت کی بات یہ ہے کہ قاتل نہیں کوئی

ہر کہانی کی ہو تکمیل ضروری تو نہیں
نامکمل سا کوئی باب تو رہنے دیتے

تمام ہو چکے سب ہجر رُت کے ہنگامے
بدن سے قرب کا موسم لپٹتا جاتا ہے

کسی کی یاد سے آباد دل کو رکھا ہے
رہے نہ کوئی تو آسیب گھر میں رہتے ہیں

غزل کے روایتی آہنگ وآداب کو انھوں نے یوں احساسات کے 'شعری پیکر' میں ڈھالا ہے۔

فقط زبان کا ہم ذائقہ بدلتے ہیں
غزل میں ورنہ کوئی بات ان کہی کیا ہے

جب تک دلوں میں درد سموتی نہیں غزل
کچھ لفظ ٹانک دینے سے ہوتی نہیں غزل

غزل ہی پر موقوف نہیں، مناجات میں بھی انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے اور عجز وانکساری کا دامن تھامے رکھا ہے۔

مسئلہ ہوں میں اگر، حل کر دے
اے خدا مجھ کو مکمل کر دے

میری پہچان ترے ذکر سے ہو
تیری خوشبو بنوں، صندل کر دے

شہر وقریہ کے تضادات، ثمرات ومضمرات اور دیس پردیس کا نقشہ انھوں نے یوں کھینچا ہے کہ ہر تصویر روشن روشن لگنے لگی ہے۔

اب گاؤں میں جنم نہیں لیتیں کہانیاں
لمبی جٹاؤں والے سبھی پیڑ کٹ گئے

خدایا شہر کی آلودگی نہ دے اس کو
ہمارے گاؤں کی آب وہوا سلامت ہے

گھر کی دہلیز سے باہر تو نکل کر دیکھو
دھوپ میں سایہ دیوار کہاں ہوتا ہے

کوئی گھر بار تج کر گاؤں سے کرتا نہیں ہجرت
کنارا کاٹ کر دریا کا پانی چڑھ رہا ہوگا

جنت یہیں تھی گھر کی مہکتی فضاؤں میں
کچھ لوگ بے سبب ہی ادھر سے اُدھر گئے

قدآور ادبی شخصیات کی آرا سے عاری 'منظر اُس پار کا' محمد مختار وفا کے افکار و اظہار کے حوالے کو بہر طور معتبر کرتا ہے۔

ہم نے گزاری عمر سفر طے کرنے میں
کوئی راتوں رات سخنور بن جاتا ہے

ہم بھی کس شان سے تخلیق سخن کرتے ہیں
اپنا کچھ غم نہیں، اوروں کی عزاداری ہے

یہی بہت ہے کہ اپنی نوا میں زندہ ہوں
نواح شہر سخن کا اسد نہ میر ہوں میں

■

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

'مظہر امام' توسیعی خطبہ

دربھنگہ: مقامی ایم ایل ایس ایم کالج دربھنگہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون

سے مظہر امام توسیعی خطبہ پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ مظہر امام اپنے ہمعصروں میں اس لیے ممتاز تھے کہ وہ لفظوں کو نئے معانی کا پیکر عطا کرنے میں سبقت رکھتے تھے۔ انھوں نے غزل کو موضوعی دائرے سے نکال کر اعتبار بخشا نظم میں حقیقی عناصر کو پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ مظہر اسم با مسمّی تھے وہ مظہر بھی تھے اور امام بھی۔ ان کے یہاں روایت سے استفادہ کے ساتھ جدیدیت کی آنچ بھی موجود ہے۔ ان کی شاعری میں پوری انسانیت کے تحفظ کا بیان ملتا ہے۔ وہ ایک ترقی پسند تھے لیکن کبھی روایت شکن نہیں رہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں اخلاقی پہلو نمایاں ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ مظہر امام ایک سنجیدہ ناقد بھی تھے۔ توسیعی خطبہ کے انعقاد پر کالج انتظامیہ اور کالج کے شعبہ اردو کو مبارکباد دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ ہندوستان میں پہلا کالج ہے جو مظہر امام پر توسیعی خطبہ کا انعقاد کر رہا ہے۔ ارتضیٰ کریم نے کہا کہ مظہر امام نے گرچہ بہت کم افسانے لکھے ہیں، لیکن اس کی وقعت بہت ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مظہر امام کی شاعری نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہے اور بہار سے تعلق رکھنے والے ادبا اور شعرا کے لیے سرمایہ افتخار ہے۔ توسیعی خطبہ میں سی ایم کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مشتاق احمد نے کہا کہ مظہر امام اپنے ہم عصروں میں نہ صرف اپنی بلند قامتی کی وجہ سے بلکہ اپنے موثر اظہار بیان کی وجہ سے بھی ممتاز رہے۔ انھوں نے کہا کہ مظہر امام کا پہلا مجموعہ زخم تمنا 1962 میں شائع ہوا تھا جبکہ شہر یار کا مجموعہ 1965 میں شائع ہوا تھا۔ اس لیے جدید شاعری کے نقادوں کو اس نکتے پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر انیس صدری اور شعبۂ اردو کے استاد پروفیسر فاراں شکوہ یزدانی نے بھی مظہر امام کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشن کیا۔ سنڈیکیٹ ممبر ڈاکٹر بیدناتھ چودھری نے خطاب کیا۔ پروگرام کی صدارت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ودیاناتھ جھا نے کی۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر آفتاب اشرف نے استقبالیہ پیش کرتے ہوئے مظہر امام کی حیات وخدمات اور دربھنگہ کی ادبی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی۔ پروگرام کی نظامت کنوینر ڈاکٹر آفتاب اشرف نے کی۔ پروفیسر مادھو چودھری کے کلمات تشکر پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ 'انقلاب' پٹنہ، 2 ستمبر 2018

قومی تعمیر وتشکیل میں مدارس اور اردو کا کردار

پٹنہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اردو کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگر ہندوستان میں اردو نہ ہوتی تو ملک بھی آزاد نہ ہوا ہوتا۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے سیوک فاؤنڈیشن اور بزم صدف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام اور قومی اردو کونسل کے تعاون سے منعقدہ بین الاقوامی سمینار 'قومی تعمیر وتشکیل میں مدارس اور اردو کا کردار' کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ مدارس کے علما ہی تھے جنھوں نے وطن کی آزادی میں اپنے تن کی بازی لگا دی تھی اور ایک سے بڑھ کر ایک عالم نے مدارس کے توسط سے قوم و ملک کی تعمیر وتشکیل میں کردار نبھایا۔ انھوں نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مدارس کا ماضی بہت شاندار رہا ہے لیکن ماضی اور حال کی بنیاد پر مستقبل کی تعمیر ہونی چاہیے۔ راجیہ سبھا کے رکن پارلیمان اور آر جے ڈی کے سینئر لیڈر ڈاکٹر احمد اشفاق کریم نے اردو اور مدارس کے حوالے سے کہا کہ آج ہر جگہ اردو کی بود و باس نظر آرہی ہے تو اس کی وجہ مدارس ہیں اور اہل مدارس نے اردو کو زندہ رکھا ہے۔ آندھرا پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر ایس نعمان نے مدارس کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دینے کے مفروضے کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ مدارس دہشت گردی کا اڈہ نہیں بلکہ انسانیت کی آماجگاہ ہیں اور وہاں ادب، تہذیب، ثقافت، اقدار اور محبت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ پروفیسر سشیل کمار نے اس موقعے پر کہا کہ مدارس کو اس کے قیام کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے اور جب تک اس کے صحیح پس منظر میں نہیں دیکھا جائے گا، اس وقت تک بات غلط نظر آئے گی۔ شہاب الدین احمد نے بزم صدف کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ مختلف سطح پر یہ بزم اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کہا کہ مدارس کے بارے میں جو غلط فہمی پائی جاتی ہے اسے دور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہیومن چینل کے صدر انجینئر محمد اسلم علیگ نے مدارس اور اردو کے حوالے سے کہا کہ مدارس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن اصلاحات کی ضرورت ہے اور اسی کے ساتھ ہمیں اپنے محسنوں اور بزرگوں کی قدر کرنی چاہیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر محمد سجاد نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ مدارس نے ملک کی تعمیر میں پہلے بھی اہم کردار ادا کیا ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے صحیح تناظر میں دیکھا جائے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کہا کہ اردو کو دو چیزوں تک محدود کر دیا گیا ہے۔

افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے ادیب و شاعر اور بزم صدف انٹرنیشنل کے ڈائرکٹر صفدر امام قادری نے کہا کہ مدارس اور اردو کا رشتہ بہت گہرا ہے اور مخالفت کے باوجود اس کا رشتہ قائم ہے۔ دیگر مقررین میں تنویر عالم، ڈاکٹر شمبھو سریواستو، سابق رکن قانون ساز کونسل بہار، پروفیسر کشن، ڈاکٹر محمد گوہر، ڈاکٹر مولانا حسن رضا خاں، شکیل کاکوی، امتیاز کریمی ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ جبکہ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر منی کمار جھارکھنڈ، عابد انور دہلی اور احمد جاوید قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر واحد نظیر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے نظامت کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 14 اگست 2018

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

پروفیسر نیر مسعود کی شخصیت

لکھنؤ: نیر مسعود کے یہاں کتنی علامت نگاری ہے اور کتنا استعارہ ہے اس سے قطع نظر ان کے افسانے کی خوبی یہ ہے کہ وہ خود آپ سے کہتے ہیں کہ جو آپ چاہیں سمجھ لیں۔ وہ جزئیات نگاری سے کام لیتے ہیں۔ جزئیات ان کے افسانے کا ایک بڑا وصف ہے۔ زندگی میں بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہوتے ہیں ان میں سے اکثر انسان کی زندگی کو کس طرح متاثر کرتے ہیں یہ نیر مسعود نے افسانوں میں پیش کیا۔ یہ خیالات معروف نقاد، قلمکار اور سبکدوش ایڈمنسٹریٹو افسر شمس الرحمٰن فاروقی نے پیش کیے۔ اوماناتھ بلی آڈیٹوریم میں ادبی انجمن 'اسلوب' کے تحت اور اتر پردیش اردو اکادمی اور فخر الدین علی احمد کمیٹی اتر پردیش کے مالی اشتراک سے ہوئے سمینار میں بطور صدر خطاب کر رہے تھے۔ سمینار دو نشستوں پر مشتمل تھا۔ پہلی نشست کی صدارت سید محمد اشرف اور دوسری نشست کی صدارت شمس الرحمٰن فاروقی نے کی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے نیر مسعود سے ذاتی تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تحریروں میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ افسانہ خواب میں دیکھ کر لکھا گیا ہو یا خیال میں۔ اصل بات ہوتی ہے اس کے متن سے قاری کیا اثر لے رہا ہے۔ وہ تحریر قاری کو کس قدر متوجہ کرتی ہے۔ پہلی نشست کے صدر سید محمد اشرف نے کہا کہ بظاہر آسان اور سادگی سے بھرپور نثر نیر مسعود کی صناعی کا کمال ہے۔ اس موقعے پر قاضی افضال حسین، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر انیس اشفاق، قاضی جمال حسین، ابوالحسنات حقی، پروفیسر صغیر افراہیم اور ڈاکٹر معید الرحمٰن نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 7 اگست 2018

منٹو کی یاد میں

ایشیاٹک سوسائٹی کے زیر اہتمام اردو کے ممتاز ادیب اور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے فن کو خراج پیش کرنے کے مقصد سے 'منٹو کی یاد میں' ایشیاٹک سوسائٹی کی وسیع و عریض لائبریری کے دربار ہال میں منعقد کی گئی یہ تقریب ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ تھی۔ اس تقریب میں اردو رسم الخط سے نابلد لیکن اس کے سحر میں گرفتار سامعین موجود تھے جو ممبئی کو منٹو کی نظروں سے دیکھنا اور سمجھنا چاہتے تھے۔ تقریب کی شروعات منٹو کی کہانیوں کے خصوصی آڈیو ویژول سے کی گئی جس میں منتخب کہانیوں 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' اور 'کھول دو' کا ڈرامائی ورژن دکھایا گیا۔ اس کے بعد افتتاحی کلمات لائبریری اور تقریب کے منتظمین کی جانب سے ادا کیے گئے۔ بعد ازاں معروف کہانی گروپ 'کتھا کتھن' کے سینئر ممبر جمیل گلریز اور ان کی ٹیم نے منٹو کے دو مختلف انداز میں لکھے گئے افسانوں 'سونے کی انگوٹھی' اور 'لائسنس' کی ڈرامائی ریڈنگ کرتے ہوئے سامعین سے داد و تحسین وصول کی۔

ڈاکٹر پارومتا چکرورتی نے 50، کی دہائی کے باغی قلمکار کہلانے والے سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے فن کا تقابلی جائزہ پیش کیا۔ انھوں نے منٹو کو ملک کا بہترین فکشن رائٹر قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''جس دور میں منٹو شہرت کی بلندیوں تک پہنچ رہے تھے، اسی دور میں عصمت چغتائی کا قلم بھی شباب پر تھا۔ ان دونوں قلمکاروں کا فن اس دور میں فرقہ واریت اور شدت پسندی کے خلاف شدید احتجاج کر رہا تھا۔'' ڈاکٹر چکرورتی کے مطابق ان افسانہ نگاروں کی عصری معنویت آج بھی برقرار ہے اور ان کا کوئی بھی افسانہ ایسا نہیں ہے جو آج کے حالات پر صادق نہ آتا ہو۔ ڈاکٹر پارومتا چکرورتی کے پرمغز مقالے کے بعد فلم انڈسٹری کے معروف اسکرپٹ رائٹر اور قلمکار دیویندر موہن نے منٹو اور ممبئی کے تعلقات پر گفتگو کی۔ انھوں نے منٹو کے ذریعے تقسیم ہند سے قبل تحریر کیے گئے کرداروں اور ڈراموں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ منٹو نے منفی کرداروں کی پیشکش میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ تقسیم ہند کے کرب کو بھی انھوں نے صفحہ قرطاس پر اتارا لیکن ان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے ممبئی کو ویسا ہی پیش کیا جیسی کہ وہ تھی۔''

تھیٹر، ٹیلی ویژن اور فلموں کے معروف اداکار راجندر گپتا نے اپنے مقالے کا آغاز منٹو کے اس مشہور جملے سے کیا کہ 'میں ہی چلتی پھرتی بمبئی ہوں' اور کہا کہ منٹو نے یہ جملہ صرف روانی میں نہیں کہہ دیا تھا بلکہ انھوں نے ہمیشہ اپنی تحریروں میں اس کا عملی ثبوت بھی پیش کیا۔'' راجندر گپتا کے مطابق منٹو نے ایک کاسموپولیٹن شہر کے تہہ خانوں میں پروان چڑھنے والی کہانیوں کو آواز دی، انھیں الفاظ عطا کیے۔ تہہ خانوں کی ان کہانیوں کو وہ روشنی عطا کی جس کی وہ متلاشی تھیں۔

'منٹو کی یاد میں' کے آخری سیشن میں مشہور اداکارہ نندیتا داس نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے نہ صرف اپنی فلم منٹو کا تفصیل سے ذکر کیا بلکہ دوران خطاب اپنے کئی جملوں سے یہ واضح کر دیا کہ وہ نہ صرف منٹو کو تفصیل سے پڑھ چکی ہیں بلکہ کسی بھی ماہر منٹو کے ساتھ گھنٹوں اس موضوع پر گفتگو بھی کر سکتی ہیں۔ انھوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''میں نے طالب علمی کے دور میں منٹو کو پڑھا تھا اور اسی وقت اس کی مداح بن گئی تھی لیکن اس کی تحریریں دیوناگری میں بھی بہت کم دستیاب تھیں، اسی لیے مجھے دیوناگری میں ان کی کلیات 'دستاویز' حاصل کرنے میں کافی وقت لگ گیا۔ بہر حال میں نے اسے پڑھا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ منٹو کو وہ مقام نہیں مل سکا جس کا وہ حقدار تھا۔'' نندیتا داس کے مطابق منٹو عصری لحاظ سے بھی انتہائی اہم ہے کیونکہ اس کی کہانیاں ہر مذہب کے ٹھیکیداروں، سیاست دانوں اور سماج کے ٹھیکیداروں کو آئینہ دکھاتی ہیں، ان پر طنز بھی کرتی ہیں اور اپنے قاری کو مختلف نظریے سے سوچنے کا راستہ فراہم کرتی ہیں۔ نندیتا داس نے اپنے خطاب کا اختتام ان جملوں پر کیا کہ ''منٹو میرے لیے وہ قلمکار ہے جس نے مجھے اپنے آپ سے سوال کرنا سکھایا۔'' واضح رہے کہ اس تقریب سے قبل رفیق بغدادی کی قیادت میں ایک مارچ کا انعقاد بھی کیا گیا تھا۔ اس مارچ میں ان علاقوں کا دورہ کیا گیا جہاں سے منٹو کا کبھی گزر ہوا تھا۔ مارچ کے شرکا ان گلیوں اور شاہراہوں سے گزرے اور منٹو کے دور کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔ مارچ کا اختتام عرب گلی پر ہوا جہاں کسی زمانے میں سعادت حسن منٹو رہائش پذیر تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اگست 2018

'اردو افسانے میں حب الوطنی' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

اردو افسانے میں حب الوطنی

میرٹھ: آزادی کے بعد حب الوطنی کی تلاش ایک مشکل عمل ہے۔ اب ہمارے سامنے آزادی جیسا کوئی مقصد تو ہے نہیں لیکن حب الوطنی کا حاصل صرف جنگ آزادی ہو یہ درست نہیں۔ آزادی کے بعد حب الوطنی کے مختلف شیڈس ملتے ہیں۔ مشترکہ تہذیبی وراثت، اتحاد و اتفاق، پانی مٹی سے محبت، ملک دشمن عناصر کے خلاف جہاد، ملک کو آگے لے جانے والے اعمال وغیرہ ایسے شیڈس ہیں جو ہمیں وطن سے محبت سکھاتے ہیں۔ یہ الفاظ تھے پروفیسر اسلم جمشید پوری کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سیمینار ہال میں شعبۂ اردو اور ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کے اشتراک سے منعقدہ یک روزہ سمپوزیم بعنوان 'اردو افسانے میں حب الوطنی: آزادی کے بعد' میں کلیدی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو افسانوں میں حب الوطنی کے ہر رنگ کا نمایاں عکس ملتا ہے۔ اس سے قبل پروگرام کا افتتاح نائب شیخ الجامعہ پروفیسر ایچ ایس سنگھ کے ہاتھوں عمل میں آیا اور صدارت معروف ادیب نند کشور وکرم نے کی۔ نظامت ڈاکٹر آصف علی اور شکریے کی رسم ڈاکٹر شاداب علیم نے انجام دی۔ تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے شین کاف نظام نے کہا کہ کہانی کا تعلق کہنے سے ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ افسانے کے موجودہ خد و خال مغرب سے متاثر و مستعار ہیں لیکن ان کی پرکھ اور پہچان کے پیمانے مشرق کے اپنے ہیں۔ افسانہ انفرادی ذہن کی دین ہے جبکہ کہانی اجتماعی حافظے کی دین ہے۔ پروفیسر ایچ ایس سنگھ نے اس پروگرام کے انعقاد پر ساہتیہ اکادمی اور شعبۂ اردو کے اراکین کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے سمپوزیم کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ عہد حاضر میں انتہائی اہم ہے کیونکہ ہماری نوجوان نسل حب الوطنی کے اصل مفہوم کو بھلا چکی ہے۔ پہلے اجلاس کا صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف ادیب وشاعر نند کشور وکرم نے کہا کہ اردو افسانہ صدیوں سے لکھا جا رہا ہے۔ لگ بھگ نصف صدی تک حب الوطنی کے موضوع پر بے شمار افسانے لکھے گئے لیکن آزادی کے بعد اس موضوع پر کم ہی لکھا گیا اور دیگر موضوعات پر افسانے لکھے گئے۔ دوسرے اجلاس کی محفل صدارت میں پروفیسر طارق چھتاری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سلام بن رزاق، ممبئی اور ڈاکٹر سید معراج الدین رونق افروز رہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر صاحب علی، ڈاکٹر عابد حسین حیدری اور ڈاکٹر پرویز شہریار نے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 اگست 2018

دھلی:

پروفیسر چندر شیکھر ازبکستان کے کلچرل کونسلر مقرر

نئی دھلی: پروفیسر چندر شیکھر نہ صرف فارسی زبان و ادب کے محقق و قلمکار ہیں، بلکہ وہ مشرقی اقدار و روایات کے امین بھی ہیں اور فارسی ادبیات کے نگہبان بھی، فارسی مخطوطات کی ایڈیٹنگ میں ان کا قابل قدر حصہ ہے۔ علمی و تحقیقی کارناموں کی وجہ سے انھیں متعدد اعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے، پروفیسر چندر شیکھر کو ازبکستان کا کلچرل کونسلر بنایا جانا بھی ایک اعزاز ہے اور یہ اعزاز نہ صرف شعبۂ فارسی کے لیے بلکہ پوری یونیورسٹی کے لیے قابل فخر ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر چندر شیکھر کے ازبکستان کا کلچرل کونسلر بنائے جانے کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر سید حسنین اختر نے تقریب کی نظامت کرتے ہوئے کیا۔ شعبۂ عربی کے استاد پروفیسر ولی اختر نے کہا کہ آج وہ جس ملک کے کلچرل کونسلر بنائے گئے ہیں وہ بھی عربی و مشرقی تہذیب کا گہوارہ ہے، مجھے امید ہے کہ وہ اس گہوارے کے امین بن کر پاسداری کریں گے۔ شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر علی اکبر شاہ نے کہا کہ پروفیسر چندر شیکھر کی ذات ایسی ہے، جس پر ادارہ فخر کر سکتا ہے، ان کی علمی و تحقیقی خدمات کے اعتراف میں ایران کا سب سے بڑا اعزاز ان کو دیا گیا۔ انھوں نے ایسے وقت میں اس زبان میں روح پھونکی جب اس کے طالب علم مایوسی کے شکار تھے۔ آج کے سیناریو میں پروفیسر چندر شیکھر کی ذات مشعل راہ ہے۔ تقریب میں شعبۂ سنسکرت کے پروفیسر رمیش بھاردواج، آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر موہن، پروفیسر آدتیہ نارائن، شعبۂ بدھسٹ اسٹڈیز کے ڈاکٹر آئی این سنگھ، شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر مشتاق احمد قادری نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا، کلمات تشکر شعبۂ عربی کے استاد ڈاکٹر مجیب اختر نے پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 اگست 2018

کتابوں سے وابستگی ضروری

نئی دھلی: وقت کے ساتھ ساتھ کتابیں ہماری زندگی میں اہمیت کھوتی جا رہی ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی اور بڑھتی مصروفیت کی وجہ سے ہم کتابوں کو اپنا وقت نہیں دے پاتے ہیں۔ کتابیں ہمارے لیے ہمیشہ سے بنیادی ضرورت رہی ہیں۔ مگر کتابیں ہمارے لیے وقت کی بربادی کی وجہ بن گئی ہیں۔ جمعہ کو شیوا جی کالج میں منعقد ٹیڈ ایکس پروگرام کے دوران 'بک آن' دی دہلی میٹرو' کی بانی شروتی شرما نے بتایا کہ ان کا مقصد ہے کہ لوگوں میں پڑھنے کی عادت کو دوبارہ بیدار کریں۔ کتابیں زندگی کو قیمتی مواد فراہم کرتی ہیں۔ کتابیں زندگی کو ری ڈائریکٹ کرنے کا کام کرتی ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ کتابیں ہمارا ثقافتی ورثہ ہیں، جن کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ آئی آئی ٹی دہلی سے آئے ڈاکٹر نلادری چٹرجی نے کہا کہ جدید دور میں ہمارا ثقافتی ورثہ ہمارا حصول علم ہی ہے۔ وقت کے ساتھ ہم بھلے ہی آگے بڑھ رہے ہیں، لیکن ہمارے باپ دادا کے ذریعے لکھی گئی کتابیں ہمارے لیے علم کا سمندر ہیں۔ آج ہم سوشل میڈیا سے کافی جڑ گئے ہیں، لیکن ہم یہ بھول گئے ہیں کہ وہ بھی انسان کے ذریعے ہی بنایا گیا ہے۔ اس پروگرام میں دہلی یونیورسٹی کے کالجوں سے آئے طالب علموں نے حصہ لیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2018

اترپردیش:

ڈرامہ سنجوگ

میرٹھ: شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور UPTA کے مشترکہ اہتمام میں معروف ڈراما نویس ستیش ڈے کے مزاحیہ ڈراما 'سنجوگ' کا کامیاب اسٹیج شو منعقد ہوا۔ اس موقعے پر مہمانان خصوصی محترم ڈاکٹر معراج الدین احمد (سابق وزیر حکومت اترپردیش) اور محترم پربھودیال بالمیکی (سابق وزیر حکومت اترپردیش) اور مہمان ذی وقار

محترم ڈاکٹر بی ایس یادو (پرنسپل، ڈی این کالج، میرٹھ)، نیرج شرما (ہدایت کار اور اسکرپٹ نگار) موجود تھے۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر کے کے شرما نے کی۔ نظامت ونود کمار بے چین نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ہماری مسلسل کوشش ہے کہ میرٹھ میں ادبی فضا ہموار ہو۔ ڈرامے کے تئیں عوام میں بیداری آئے۔ میرٹھ کے نوجوانوں میں خاصا Talent ہے۔ ایک ڈرامے کو تیار کرنے میں جو محنت اور وقت لگتا ہے، وہ اداکار ہی جانتا ہے۔ ہمیں ان کی ہر ممکن ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ پروفیسر کے کے شرما نے اپنے صدارتی خطبے میں شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور UPTA کے آج کے ڈرامے کی تعریف کرتے ہوئے کہا ''اس طرح کی کاوشیں جاری رہنی چاہئیں۔ اس سے نوجوانوں کو صحیح سمت میں آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ محترم ڈاکٹر بی ایس یادو نے بھی اس موقعے پر خطاب کیا۔ ڈرامے میں مرکزی کردار میں ہیمنت گوئل اور راؤ یوسف نے سامعین کو اپنے مزاحیہ کردار اور مکالموں سے قہقہے لگانے پر مجبور کردیا۔ معاون اداکاروں میں سریندر شرما، کاتیاینی گپتا، بھارت بھوشن، انل شرما وغیرہ نے لاجواب اداکاری کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 20 اگست 2018

سول سروسز میں کامیابی کیسے حاصل کی جائے

الہ آباد: مائینا رٹیز ٹریننگ سنٹر اور شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی نے 'سول سروسز میں کامیابی کیسے حاصل کی جائے' عنوان سے ایک خطبے کا انعقاد کیا جس میں دہلی سے تشریف لائے معروف مفکر و ماہر تعلیم ڈاکٹر شمشاد احمد نے بطور مقرر خاص شرکت کی۔ سنٹر کوآرڈینیٹر ڈاکٹر صالحہ رشید نے مہمانوں کا استقبال کیا اور موضوع پر روشنی ڈالی۔ شمشاد احمد نے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ سول سروسز میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے خاص منصوبہ بندی کی ضرورت ہے جس سے اپنا مقصد حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ انھوں نے کہا کہ اتنی بڑی آبادی والے ہندوستان میں ضروری نہیں کہ ہر شخص آئی اے ایس بن جائے۔ اس کے ساتھ دوسری سروسز کے دروازے بھی کھلے رکھنے چاہئیں۔ اس کے لیے سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے مقصد کا تعین، جنون، حوصلہ اور ضد مل کر ایک تاریخ رقم کرتے ہیں اور یہ جنون محنت کرنے والے کے قدموں میں ساری دنیا کو جھکا دیتا ہے۔ ان کے مطابق جاہل ہونا اتنا بڑا گناہ نہیں ہے جتنا سیکھنے کی طرف مائل نہ ہونا ہے جس نے محنت اور صبر سے کام لیا، کامیابی نے اسی کی

'اردو زبان اور ہماری ذمہ داریاں' کے موضوع پر منعقدہ میٹنگ

پیشانی چومی ہے۔ انسان اپنے عمل سے بڑا ہوتا ہے نہ کہ پیدائش سے۔ اس موقعے پر عربی فارسی زبان و ادب کے حوالے سے انھوں نے کریئر کے ان گنت امکانات بتائے۔ انھوں نے کہا کہ انڈیا اکنامک زون میں عربی جاننے والوں کی مانگ سب سے زیادہ ہے۔ عربی زبان سے دنیا کا سب سے بڑا مارکیٹ پٹرول مارکیٹ جڑا ہوا ہے۔ ڈاکٹر کریم اللہ انصاری نے پروگرام میں شریک مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 11 اگست 2018

اردو زبان اور ہماری ذمہ داریاں

نجیب آباد: اردو ٹیچرس ایسوی ایشن نجیب آباد کی منعقدہ میٹنگ میں اردو زبان اور ہماری ذمہ داریاں کے عنوان پر گفتگو کی گئی، جس میں مقررین نے اردو کو ہر بولنے پڑھنے، سمجھنے والے کی زبان بتایا اور محبت کی زبان قرار دیا۔ اردو کو ہی اپنی بول چال کی زبان بنائے جانے کا عزم کیا گیا۔ اردو کی موجودہ جو حالت ہے اس کے لیے ہم خود ذمے دار ہیں۔

ادب سٹی میں منعقدہ میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے ایسوی ایشن کے صدر ماسٹر تنویر احمد نے 'اردو زبان اور ہماری ذمہ داریاں' موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہندوستانی زبان ہے، جو مختلف زبانوں کا مرکب ہے۔ اردو زبان نے تہذیب دی ہے تمدن دیا ہے اور باہمی اتحاد کو مضبوط کرنے کا کام کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی ہی زبان نہیں ہے، بلکہ اس کی آبیاری میں غیر مسلموں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے کہا کہ جو لوگ اردو کو مسلمانوں کی زبان بتاتے ہیں یا مسلمانوں سے اس زبان کو منسوب کرتے ہیں وہ تاریخ سے واقف نہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلائیں، اپنی ذمے داری کو سمجھیں، گھروں میں اردو اخبارات اور رسائل لگائیں، اپنے بچوں کو پڑھائیں، اپنی بول چال میں اردو کا استعمال کریں اور یہ ثابت کریں کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے کہ جس کو آسانی کے ساتھ بولا جاسکتا ہے۔ میٹنگ کے صدر عابد رشید نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ٹیچرس کو چاہیے کہ وہ اردو مضمون ہی بچوں کو پڑھائیں۔ وقت ملے تو دیگر مضامین بھی پڑھائیں۔ ترجیح اردو کو دیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 اگست 2018

سرسید اور علی گڑھ تحریک

علی گڑھ: سرسید احمد خاں نہ صرف دوسروں سے بخوبی کام لینا جانتے تھے بلکہ ان کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ سرسید ماضی کی روشنی میں مستقبل کی حکمت عملی تیار کرتے تھے۔ ان خیالات کا اظہار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ تعلیم میں سرسید مشن اویرنیس پروگرام کے تحت 'سرسید اور علی گڑھ تحریک' موضوع پر منعقدہ پروگرام میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر طارق چھتاری نے بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ ڈاکٹر فائزہ عباسی نے اپنے خطاب میں کہا کہ سرسید نے ہندوستان کے حالات کو دیکھ کر راہِ فرار اختیار نہیں کی، بلکہ باشندگان وطن کو بحران و مشکلات سے نکالنے کی کوشش کی۔ سرسید ان لوگوں میں سے تھے جنھیں دوسری قوموں کی مخالفت سے زیادہ اپنے لوگوں کی مخالفت جھیلنی پڑی۔ سرسید نہ صرف ایک ماہر تعلیم بلکہ مورخ، مصنف، مفکر، مقرر، قانون داں اور آرکیٹیکٹ کے ساتھ ساتھ دردمند دل رکھنے والے سچے محبِ وطن تھے اور ان میں ذرہ برابر بھی مذہبی تفریق نہیں تھی۔ پروفیسر محمد پرویز نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ سرسید کے وژن اور مشن کو سبھی کو جاننے اور اسے اپنی زندگی میں اپنانے کی ضرورت ہے۔ مذاکرے میں زیبا منیر، فاطمہ اور ہما خاں نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کوئز پروگرام میں سلمان انصاری نے اوّل انعام حاصل کیا۔ جبکہ دوئم، سوئم اور چہارم انعامات بالترتیب زماں، فاطمہ اور پرم جیت سنگھ نے حاصل کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 اگست 2018

گلکرائسٹ کی ادبی خدمات پر خصوصی خطبہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے تحت واقع لینگویج آف ایڈورٹائزنگ میڈیا اینڈ مارکیٹ (ایل اے ایم ایم) میں یونیورسٹی آف منی سوٹا، امریکہ کی محترمہ شارلٹ میڈرے کے خصوصی خطبے کا اہتمام کیا گیا جس میں انھوں نے جان بورتھوک گلکرائسٹ کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اپنے خطاب میں محترمہ شارلٹ میڈرے نے گلکرائسٹ کے ذریعے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو پیش کی گئی رپورٹ پر گفتگو کرتے ہوئے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی زبانوں کی درس وتدریس پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ گلکرائسٹ کے ادبی رویے سے اُس دور میں انگریزی زبان کی درس وتدریس میں بڑی مدد ملی اور اس سے ہندوستانی و برطانوی نوآبادیاتی وراثت کے تحفظ کا راستہ ہموار ہوا۔ اس موقعے پر شعبۂ لسانیات کے صدر پروفیسر ایس امتیاز حسنین نے مہمان مقرر کا خیر مقدم کرتے ہوئے بنارس ہندو یونیورسٹی کے پروفیسر راجناتھ بھٹ کو پروگرام کی صدارت کے لیے مدعو کیا۔ ایل اے ایم ایم کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر ایم جے وارثی نے گلکرائسٹ کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کے مطالعے سے ہندوستانی زبانوں خاص کر ہندوستان کی ابتدا اور نشوونما کے سلسلے کو سمجھنے میں آسانی ہوگی کیونکہ بعد کے دور میں یہی زبان شمالی ہند کی اصل زبان بنی۔ اس موقعے پر شعبۂ لسانیات کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس کے علاوہ پروفیسر آفرینہ رضوی، ڈاکٹر مسعود اے بیگ، ڈاکٹر صباح الدین احمد سمیت دیگر معززین موجود تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 5 اگست 2018

تلنگانہ:

ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی کا توسیعی لیکچر

حیدر آباد: ترجمے کے اصول ونظریات عملی ترجمے کے ذریعے ہی تشکیل پاتے ہیں، ترجمہ نگاری کے دوران مختلف مترجمین نے جو حکمت عملیاں اپنائی تھیں انھی کی بنیاد پر بعد کے ماہرین ترجمہ نے ترجمے کے اصول ونظریات کی بنیاد رکھی۔ عملی ترجمے کے لیے ان اصول ونظریات کو اپنانا بھی ضروری ہے جس کے بغیر ترجمہ کا عمل آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی سابق ایسوی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں شعبۂ ترجمہ کے طلبا واسکالرز سے خطاب کے دوران کیا۔ ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی عصر حاضر کے ایک بہترین مترجم بھی ہیں۔ انھوں نے کئی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے، ان میں ٹیگور کی مشہور زمانہ 'گیتا نجلی' بھی شامل ہے جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی عطا کیا گیا۔ وہ یہاں 'ترجمے کے نظریات' کے موضوع پر ایک توسیعی لکچر پیش کر رہے تھے۔ دوران لکچر انھوں نے کہا کہ ترجمہ اور ترجمے کے نظریے کا معاملہ، تخلیق وتنقید کی مانند ہے اگر تخلیق کار اپنی تخلیق پیش ہی نہ کرے تو آخر ایک نقاد، تنقید کس طرح سے کرے گا اسی طرح اگر نقاد اس تخلیق کا تنقیدی پہلو ظاہر نہ کرے تو آخر اس تخلیق کی خوبی یا خامی کو کیسے سامنے رکھا جائے گا۔ بعض مرتبہ مصنفین خود اپنی کتابوں کا دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی کرتے ہیں جس میں وہ اپنے ترجمے کے لیے کافی آزادی کا استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبۂ ترجمہ میں بھی علم ترجمہ کے مختلف نظری پہلوؤں پر کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے شعبہ کے اساتذہ میں سے ڈاکٹر فہیم الدین احمد کی تصنیف 'علم ترجمہ نظری وعملی مباحث' اور ڈاکٹر محمد جنید ذاکر کی تصنیف 'اصلاحی مباحث' کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان میں جن مضامین کو شامل کیا گیا ہے ان کے مطالعہ سے بھی ترجمے کے نظریات واضح ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے عملی ترجمہ کے دوران ترجمہ کے نظریات کو نظر انداز کیے جانے پر ہونے والی غلطیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ بسااوقات مترجم عملی ترجمہ کے دوران ترجمہ کے اصول ونظریات پر توجہ نہیں دیتا جس کے نتیجے میں کئی غلط ترجمے ہوجاتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی کے لکچر کے بعد طلبا واسکالرز نے مہمان مقرر سے مختلف سوالات بھی کیے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 21 اگست 2018

محفل افسانہ کا انعقاد

حیدر آباد: افسانہ ادب کی مقبول نثری صنف ہے جس میں عصر حاضر کے مسائل کی عکاسی سے سماجی اصلاح ممکن ہے اور یہ بات خوش آئند ہے کہ دور حاضر کے افسانہ نگار اپنے عہد کے سماجی مسائل کا عرفان رکھتے ہیں اور انھیں اپنے افسانوں کے ذریعے پیش کرتے ہوئے سماجی اصلاح کا اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے افسانہ نگار اپنے عہد کے مسائل پر توجہ دیں اور انہیں اپنی تخلیقات کے ذریعے اجاگر کریں۔ ان خیالات کا اظہار قمر الدین صابری اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام شاداب ہال ریڈ ہلز حیدرآباد میں منعقدہ محفل افسانہ کے شرکا نے کیا۔ محمد قمر الدین صابری ایجوکیشن فاؤنڈیشن حیدرآباد' قلم کاران دکن اور تلنگانہ اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقدہ اس محفل افسانہ کی صدارت پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے کی۔ ڈاکٹر نکہت آرا شاہین پرنسپل اورینٹل کالج حیدر آباد نے مہمانوں کا استقبال کیا اور خیر مقدمی تقریر کی۔

محفل افسانہ میں نامور افسانہ نگار خیر النساء علیم نے اپنا سماجی افسانہ 'ایسا بھی ہوتا ہے' پیش کیا۔ صاحبزادہ مجتبی فہیم نے عصر حاضر کے مسائل کو اجاگر کرتے اپنے منی افسانے اعتراف۔ بے بس۔ احساس اور قاتل پیش کیے۔ رفیعہ نوشین نے اپنا افسانہ ماضی کا وعدہ' شبینہ فرشوری نے اپنا افسانہ کبھی آئے نہ جدائی اور ڈاکٹر محبوب فرید مدیر شاداب انڈیا نے طلاق کے موضوع پر افسانہ احساس کی خوشبو پیش کیا۔ ان افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی صدر شعبہ اردو این ٹی آر ڈگری کالج محبوب نگر نے کہا کہ تمام افسانے عصر حاضر کے سماج کے عکاس ہیں اور مثبت قدروں کو پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی نے کہا کہ موجودہ دور کے افسانہ نگاروں کو سماجی مسائل کا ادراک ہے اور ہمارے افسانہ نگار سماج کے مسائل کو تعمیری انداز میں پیش کرتے ہوئے سماجی اصلاح کا اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے تمام افسانہ نگاروں کو دور حاضر کے موضوعات پر افسانے پیش کرنے کے لیے مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر مجید بیدار نے اپنے صدارتی خطاب میں پڑھے گئے افسانوں کا اجمالی جائزہ لیا۔

رپورٹ: پروفیسر ایم ایم انور، سرپرست محمد قمر الدین صابری اردو فاؤنڈیشن حیدرآباد، 31 جولائی 2018

اعزاز و اکرام:

صدر جمہوریہ ایوارڈ کے لیے عربی و فارسی دانشوروں کے ناموں کا اعلان

نئی دھلی: 1996 سے عربی و فارسی کے علاوہ سنسکرت، پالی، پراکرت، کلاسیکل اوریا، کلاسیکل کنڑ،

کلاسیکل تیلگو اور کلاسیکل ملیالم میں نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیات کی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند ایوارڈ کے لیے منتخب شخصیات کے ناموں کا

اعلان یوم آزادی پندرہ اگست کو ہر سال کیا جاتا ہے اور صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں منتخب شخصیات کو اعزاز سے نوازا جاتا ہے، سال گذشتہ کسی وجہ سے اعلان نہیں کیا گیا۔ گذشتہ سال 2017 کے صدارتی ایوارڈ برائے عربی کے لیے پروفیسر محمد نعمان خان، صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی و آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالرس (رجسٹرڈ)، پروفیسر مقصود احمد سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی ایم ایس یونیورسٹی برودہ، مولانا نور عالم خلیل امینی استاذ ادب عربی و رئیس التحریر مجلہ 'الداعی' (عربی) دارالعلوم دیوبند کو منتخب کیا گیا اور ان کے ناموں کا اعلان کیا گیا جبکہ مہارشی بدریان ویاس سمان کے لیے خواجہ معین الدین چشتی عربی اردو فارسی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر مسعود عالم فلاحی کو منتخب کیا گیا۔ سال 2018 کے صدارتی ایوارڈ کے لیے پروفیسر غلام یحییٰ انجم، صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ہمدرد، دہلی، پروفیسر این اے ایم عبدالقدیر، سابق صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی، پروفیسر محمد بدیع الرحمٰن سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی کو منتخب کیا گیا اور مہارشی بدریان ویاس سمان کے لیے ڈاکٹر کے علی نوفل اور پروفیسر اخلاق احمد آہن کو 2018 کے لیے منتخب کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اگست 2018

فاروق نازکی اور محمد یوسف ٹینگ اعزاز سے سرفراز

سرینگر: مرکز عالمی اردو مجلس، دہلی کے زیر اہتمام سرینگر کے ہوٹل شہنشاہ پیلس میں جموں و کشمیر کے دو شہرت یافتہ ادیبوں فاروق نازکی اور محمد یوسف ٹینگ کے اعزاز میں ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی جس میں ریاست کے نامور ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ مجلس کی پہلی نشست اعزازیہ تقریب پر مشتمل تھی جس کی ایوان صدارت میں وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی پروفیسر طلعت احمد، وحشی سعید، محمد یوسف ٹینگ، بیگم فاروق نازکی، حنیف ترین اور ڈاکٹر شیم اختر موجود تھے۔ اس پروگرام کے مہمان خصوصی پروفیسر طلعت احمد تھے جن کی موجودگی نے اس ادبی محفل کو زینت بخشی۔ جبکہ مرکز عالمی اردو مجلس کے صدر اور روحِ رواں حنیف ترین نے خطبہ استقبالیہ دیا۔ صدر نے اپنے خطبے میں پروفیسر طلعت احمد سے استدعا کی کہ وہ کشمیر یونیورسٹی کو جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی کے طرز کا نمونہ بنانے میں تمام تر انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں تاکہ کشمیر کی نئی پود ان کو ہمیشہ یاد رکھے اور تعلیمی سرگرمیوں میں ایک فعال کردار کے طور پر انھیں اور ان کی خدمات کو سنہرے حروف میں یاد کیا جائے۔ پروفیسر طلعت احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں صلاحیت اور ذہانت بدرجہ اتم موجود ہیں۔ نیز وادی میں مذکورہ دونوں شخصیات کے علاوہ بہت سے قلم کار اور ادیب ہیں جنھوں نے زبانوں کی خدمت میں قابل قدر رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ وہ کشمیر یونیورسٹی کو بہتر بنانے میں ایک اہم رول ادا کریں گے۔ محمد یوسف ٹینگ نے بھی زریں خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے شدت سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ وحشی سعید نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ڈاکٹر حنیف ترین اور غلام نبی کمار کی کاوشیں قابل داد اور قابل ستائش ہیں۔ دوران نشست اوّل ہی محمد یوسف ٹینگ کو پروفیسر طلعت احمد، وحشی سعید اور حنیف ترین کے بدست اعزاز سے نوازا گیا۔ فاروق نازکی ناساز طبیعت کے سبب پروگرام میں شامل نہ ہو سکے تاہم ان کی غیر موجودگی میں بیگم فاروق نازکی محترمہ بلقیس نازکی کو ڈاکٹر شیم اختر کے بدست ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ پروفیسر طلعت احمد کی بھی پروگرام میں شال پوشی کی گئی۔ اس نشست میں نظامت کا فریضہ عاصم اسعدی نے ادا کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن'، دہلی، 31 اگست 2018

جنید شیخ کو سماجی و تعلیمی خدمات کے لیے ایوارڈ

سولاپور: راجے بھائی تعلیمی ادارے سولاپور کے ذریعے سماجی اور تعلیمی میدان میں عمدہ کام کرنے کے لیے سوشل اردو ہائی اسکول کے سائنس کے معلم جنید عبدالقیوم

شیخ کو بہترین سماجی خدمات کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 15/اگست کے موقع پر راجے بھائی اردو ہائی اسکول اور جونیئر کالج آف آرٹس اینڈ سائنس سولاپور میں مولانا آزاد ادارہ دہلی کے ممبر اور شیواجی یونیورسٹی کولہاپور کے سینیٹر جناب انور سیفن اور راجے بھائی تعلیمی ادارے کے سکریٹری جناب فیض احمد انعامدار کے دست مبارک سے جنید شیخ کو ٹرافی، شال اور نقد رقم دی گئی۔

پروگرام کی نظامت اسمٰعیل ڈونگاؤنکر نے بخوبی انجام دی۔ سوشل اردو ہائی اسکول کے صدر مدرس عبدالجبار شیخ اور دیگر اساتذہ نے ان کی کارکردگی پر مبارک باد پیش کی۔

پریس ریلیز: جنید شیخ، سولاپور، مہاراشٹر، 17 اگست 2018

بلاری میں کرناٹک اردو اکادمی کے اردو لرننگ سنٹر کے جلسہ ہائے تقسیمِ اسناد

بلّاری: 13/اگست آر عبدالمجید صدر انجمن ترقی اردو ہند شاخ ضلع بلاری کے بموجب 11/اگست کو بمقام بلیو ڈائمنڈ انگلش میڈیم نرسری اینڈ پرائمری اسکول بلاری بوقت 12 بجے دن اور بمقام الم اسٹریٹ بروس پیٹ بلاری، کرناٹک اردو اکادمی کے تحت چلائے گئے دو الگ الگ اردو لرننگ سنٹرز (اردو سیکھو مراکز) کے شاندار جلسہ ہائے تقسیم اسناد، زیر صدارت جناب وحید واجد ایم اے، سابق رکن اکادمی کرناٹک بنگلور منعقد ہوئے۔ وحید واجد نے اپنے خطاب میں اردو بیداری اور مادری زبان کی اہمیت کے حوالے سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترقی و بقا کے لیے بچوں کو کم از کم پہلی جماعت سے ساتویں جماعت تک اردو میں تعلیم دلوائیں، اپنی مادری زبان کو بچائیں۔ وحید واجد نے کہا کہ کرناٹک اردو اکادمی کے تحت چھ ماہی اسکیم 'اردو لرننگ سینٹر' (اردو سیکھو مرکز) کا قیام اسی مقصد کے لیے ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ مستقبل قریب میں ریاست بھر میں اکادمی ہٰذا کے ایسے کئی مراکز کا قیام ہوگا۔ مہمانانِ خصوصی میں جناب حیدر مظہری نے وحید واجد کو آستانہ نور وانچور جیسے مستند آستانہ کی جانب سے دیے گئے خطاب 'نقادِ اعظم دکن' کی مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ یقیناً وحید واجد اس کے مستحق ہیں۔ ضلع بلاری میں ان کی وجہ سے اردو سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حیدر مظہری نے کہا کہ ہم وحید واجد کے علاوہ کرناٹک اردو اکادمی ہٰذا کے بھی شکرگزار ہیں کہ اردو کے بارے میں بلاری کو نہ صرف اہمیت دی بلکہ یہاں اردو کے فروغ کے لیے ایک محنتی، سچے اور اچھے بہترین اردو داں نمائندے کو ذمہ داری سونپی۔ موصوف نے کہا کہ بلاشبہ وحید واجد کی محنت و لگن گراں قدر اور قابل ستائش ہے۔ آر عبدالمجید سابق رکن اکادمی نے اکادمی ہٰذا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ متعلقین اکادمی ہٰذا کے بلاری میں باقاعدہ تین اردو لرننگ سینٹر اور ایک اردو ڈی ٹی پی ٹریننگ سنٹر قائم کرنے کا ہمیں موقع دیا۔ مخدوم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی بلّاری کے سکریٹری اور اردو ٹریننگ سنٹر

کے نگراں جیلانی پاشا، چراغ الدین چراغ حیدر، محمد اکرم سکریٹری اردو ٹیچرز کونسل ضلع بلاری نے بھی حاضرین سے خطاب کیا۔ دونوں سنٹرز ہٰذا کے تربیت یافتگان و معلمین کو سابق رکن اکادمی ہٰذا کے دست مبارک سے اسناد تقسیم کی گئیں۔

رپورٹ: وحید واحد، رائے چور، 13 اگست 2018

ڈاکٹر نواز دیوبندی کو 'دشینت کمار اعزاز'

دیوبند: معروف شاعر آنجہانی دشینت کمار کی یاد میں قائم 'دشینت کمار فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام میرٹھ میں منعقد اعزازی تقریب میں نامور شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی اور ٹی وی اینکر انجنا اوم کشیپ کو ان کی ادبی و صحافتی خدمات کے لیے 'دشینت کمار اعزاز' سے نوازا گیا۔ میرٹھ میں واقع سی سی ایس یونیورسٹی کے ہال میں منعقد اس اعزازی تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر بی جے پی کے صوبائی صدر مہندر ناتھ پانڈے، صوبائی حکومت کے وزیر ڈاکٹر مہندر سنگھ، آئی اے ایس منیشور اور وی سی پروفیسر این کے تنیجا نے شرکت کی۔ تقریب کے دوران ڈاکٹر مہندر ناتھ پانڈے، ڈاکٹر راجندر سنگھ و دیویہ شرما کے ہاتھوں ڈاکٹر نواز دیوبندی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'دشینت کمار اعزاز' سے سرفراز کیا گیا۔ اس بابت ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ دشینت کمار ہندوستانی ادبی تاریخ کے عظیم شاعر ہوئے ہیں، انھوں نے ہمیشہ سماج کی بہتری اور بلندی کے لیے شاعری کی ہے۔ ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ دشینت کمار اعزاز انھیں ملنا ان کے لیے فخر کی بات ہے۔ تقریب میں ٹی وی اینکر انجنا اوم کشیپ کو بھی اعزاز دیا گیا۔ فاؤنڈیشن کے ڈائرکٹر اشونی تیاگی کے مطابق فاؤنڈیشن گذشتہ بارہ برسوں سے یہ ایوارڈ ادبی شخصیات کو دے رہا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 ستمبر 2018

اجرا:

حرفِ درد

ناگپور: شگفتہ عارف کے افسانے سماجی مشاہدے اور انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے کے شواہد پیش کرتے ہیں۔ ہمارے سماج میں بکھرتے ہوئے اخلاقی اقدار کو ان افسانوں میں موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مشہور محقق اور ادیب ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے ناگپور کی ایک افسانہ نگار ڈاکٹر شگفتہ عارف کے دوسرے افسانوی مجموعے

'حرفِ درد' کا اجرا کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر افسانہ نگار، ڈاکٹر سروشہ نسرین، اناؤنسر آکاش وانی، ڈاکٹر ناہید خان سوری اور ڈاکٹر محمد یونس بھی بطور مہمانان خصوصی موجود تھے۔ سرسید ملٹی پرپز ایسوسی ایشن، ناگپور کے زیر اہتمام منعقدہ اس تقریب کی صدارت کے فرائض نامور محقق ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن نے انجام دیے۔ بچوں کے ذریعے تلاوتِ ربانی اور نعت خوانی کے بعد مہمانوں کا استقبال کیا گیا۔ ادارے کے نائب صدر محمد وحیداللہ نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور اس ادارے کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ افسانہ نگار ڈاکٹر اظہر ابرار نے اس کتاب میں شامل ایک افسانے 'بیساکھی' کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ افسانہ نگار نے عورت کی بے بسی اور اس کی مظلومیت کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ معروف انشائیہ نگار ڈاکٹر محمد اسداللہ نے کتاب سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر شگفتہ عارف کے افسانوں کی زبان فنی تقاضوں کی تکمیل کرتی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر اشفاق صاحب نے کتاب پر تبصرہ پیش کرتے ہوئے کئی افسانوں کا تجزیہ کیا اور اس کتاب کو بھرپور تخلیقی توانائی کا مظہر قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ان تحریروں میں فنِ افسانہ نگاری کا خوبصورت اظہار ہوا ہے۔ امسال اتر پردیش اور بہار اردو اکادمی سے انعام یافتہ اس افسانوی مجموعے کے اجرا پر مہمانوں نے مصنفہ کو مبارک باد پیش کی۔ ڈاکٹر شگفتہ عارف نے اس ادارے اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن نے اپنے صدارتی خطبے میں ناگپور کے افسانہ نگاروں کا تفصیلی تذکرہ پیش کیا۔ نظامت کے فرائض جاوید حسین نے انجام دیے۔ اس تقریب میں ناگپور کے شائقینِ ادب اور خواتین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

ڈاک سے: محمد سعیداللہ، سکریٹری سرسید ملٹی پرپز ایسوسی ایشن، ناگپور، 18 اگست 2018

متاعِ شوق

حیدرآباد: حیدرآباد صدیوں سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس کی آبیاری میں بہت سے دانشور، شعرا، ادبا، صوفی اور صحافی شامل ہیں۔ مومن خان شوق حیدرآباد کے مخلص اور معتبر شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں سیاسی، سماجی و ثقافتی افکار کے ساتھ وطن سے محبت، قومی یکجہتی، خلوص، تواضع اور شائستگی کا عنصر نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اردو زبان و ادب کے فروغ و ارتقا کے لیے وقف کر دیا۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے مومن خان شوق کے انتخاب کلام 'متاعِ شوق' کی رسم اجرا تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا جو صفرا ہمایوں ہال، صفدریہ گرلز ہائی اسکول، مہدی پٹنم میں منعقد ہوئی تھی۔

جلسہ کا اہتمام ماہنامہ شاداب انڈیا اور حبیب نگر کلچرل فورم نے کیا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر میر تراب علی سابق صدر شعبہ اردو شیواجی کالج پربھنی نے کی۔ مہمان خصوصی اور مقرر کی حیثیت سے ڈاکٹر محبوب فرید ایڈیٹر ماہنامہ شاداب انڈیا، ڈاکٹر مسعود جعفری اور محمد احمد نے شرکت کی۔ ناظم ادبی اجلاس و مشاعرہ شفیع اقبال نے خیر مقدم کرتے ہوئے مومن خان شوق کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر میر تراب علی نے صدارتی خطاب میں کہا کہ مومن خان شوق حالات حاضرہ پر خوبصورت اشعار کہنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ یہ ان کا گراں قدر مجموعہ ہے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 11 جولائی 2018

روزنامہ 'سچ کی آواز'

نئی دھلی: ایک ایسے وقت میں جبکہ میڈیا پر چوطرفہ بندشیں لادی جارہی ہیں اور درمیانہ نیز چھوٹی سطح کے اخبارات جانکنی کے عالم میں ہیں، اردو صحافت کی دنیا میں آج ایک اور چراغ کا اضافہ ہوا۔ یہ ہمت اور حوصلہ راشٹریہ سہارا اردو کے سابق گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی نے دکھایا ہے۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں 'پروبیٹاز نیوز نیٹ ورک' کے بینر تلے مسٹر علی کے اخبار 'سچ کی آواز' کا اجرا ہوا۔ اس موقعے پر تقریب میں پہنچنے والی سماجی، ملی اور سیاسی شخصیات نے مسٹر علی کے حوصلے کی داد دی اور انھیں یہ یقین بھی دلایا کہ دامے درمے سخنے جوان سے بن پڑے گا مدد کی جائے گی۔ ویسے تو تقریب میں سیکڑوں اہم شخصیات موجود تھیں، مگر ان میں بھی اہم اور سرکردہ لوگوں میں بہار کے سابق نائب وزیر اعلیٰ تیجسوی یادو، ممبر پارلیمنٹ احمد پٹیل، طارق انور و منوج جھا، جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمود مدنی، حج کمیٹی آف انڈیا کے چیئرمین محبوب علی قیصر، سابق ممبران پارلیمنٹ محمد ادیب، م افضل اور ڈاکٹر شکیل احمد، ریختہ گروپ کے سربراہ سنجیو

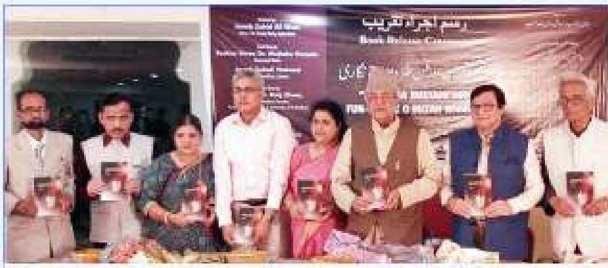

ڈاکٹر گل رعنا کی تصنیف 'مجتبیٰ حسین اور فن طنز و مزاح نگاری' کا اجرا

صراف، اردو دوست محترمہ کامنا پرساد، ایس ایم خان، دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا انڈیا اسلامک سینٹر کے سربراہ سراج الدین قریشی سرفہرست تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 اگست 2018

مجتبیٰ حسین اور فن طنز و مزاح نگاری

حیدرآباد: ڈاکٹر گل رعنا اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو تلنگانہ یونیورسٹی نظام آباد کی تحقیقی تصنیف 'مجتبیٰ حسین اور فن طنز و مزاح نگاری' کی رسم اجرا 18 اگست شام سات بجے بینکویٹ ہال نظام کلب حیدرآباد میں مدیر روزنامہ سیاست جناب زاہد علی خان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ تقریب کی صدارت ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ نامور افسانہ نگار پروفیسر بیگ احساس سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی و سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد نے کی۔ مہمان خصوصی نامور مزاح نگار پدم شری مجتبیٰ حسین، سہیل وحید مدیر نیا دور لکھنو، پروفیسر اشرف رفیع عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر فاطمہ پروین عثمانیہ یونیورسٹی تھے۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے کی۔ مجتبیٰ حسین کے فن پر تقریر کرتے ہوئے مہمان خصوصی سہیل وحید نے کہا کہ مجتبیٰ حسین اس صدی کے سب سے بڑے مزاح نگار ہیں۔ وہ حیدرآبادی ہیں لیکن ان کی تحریروں میں دکنی زبان کی جھلک نہیں ملتی۔ انھوں نے اپنی مزاح نگاری کے طویل سفر میں زندگی کے مشاہدات کو فنکاری سے پیش کیا۔ نامور شاعر شاذ تمکنت کے بھائی جناب امتیاز الدین نے مجتبیٰ حسین کے فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ اور روزنامہ سیاست سے ان کی دیرینہ رفاقت کا اعتراف کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر گل رعنا اور ان کے شوہر کو کتاب کی اشاعت اور بہترین رسم اجرا تقریب منعقد کرنے پر مبارکباد پیش کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر اسلم فاروقی، حیدرآباد، 19 اگست 2018

'بزمِ ادب' خواتین کا راشدہ خلیل پر خصوصی شمارہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور کی اہلیہ اور ممتاز ماہر امراضِ اطفال ڈاکٹر حمیدہ طارق نے کہا کہ خواتین کے علمی و ادبی فروغ کے بغیر معاشرے کی ترقی ممکن نہیں ہے اور مرحومہ بیگم راشدہ خلیل نے خود کو خواتین کے علمی و ادبی فروغ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نیو گیسٹ ہاؤس کے کمیونٹی ہال میں علی گڑھ کی خواتین کی باوقار ادبی و ثقافتی تنظیم 'بزمِ ادب خواتین' کے سالنامہ 'بزمِ ادب' کے خصوصی شمارہ 'راشدہ خلیل' نمبر کا اجرا کر رہی تھیں۔'' اس موقعے پر ہما خلیل نے کہا کہ مرحومہ راشدہ خلیل صاحبہ کے انتقال کے بعد 'بزمِ ادب' کا یہ پہلا شمارہ ہے جو ان سے ہی معنون ہے۔ انھوں نے کہا کہ مرحومہ راشدہ خلیل اس رسالہ کی بانی مدیر تھیں اور انھوں نے 22 سال تک اس کی ادارت، نگرانی اور آبیاری کے فرائض انجام دیے جبکہ آج کے پرآشوب دور میں اتنی پابندی کے ساتھ اردو کا رسالہ جاری رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ پروگرام کی اعزازی مہمان دہلی سے تشریف لائیں بزمِ ادب خواتین کی بانی مرحومہ سیدہ فرحت صاحبہ کی صاحبزادی اور ممتاز ادیبہ و شاعرہ محترمہ عذرا نقوی نے مرحومہ راشدہ خلیل کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی والدہ مرحومہ سیدہ فرحت نے 1962 میں بزمِ ادب خواتین قائم کی جس کو ان کے انتقال کے بعد مرحومہ راشدہ خلیل صاحبہ نے نہ صرف سنبھالا بلکہ اپنے آخری وقت تک اس بزم کے توسط سے معاشرہ میں تعلیم نسواں اور ادب نسواں کے فروغ کے میدان میں خدمات انجام دیں۔ اس پروگرام میں بڑی تعداد میں بزمِ ادب خواتین کی اراکین، قلم کار، صحافی، اور معززین نے شرکت کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 4 ستمبر 2018

شبنمی لمسوں کے بعد

دربھنگہ: 'شبنمی لمسوں کے بعد' پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کا ایک شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول جسمانی جمالیات پر لکھا گیا اپنے قسم کا منفرد ناول ہے۔ ناول میں عصر حاضر کی جنسی بے راہ روی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو نوجوان نسلوں کے لیے ایک پیغام ہے۔ یہ باتیں المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کے دفتر میں معروف شاعر و ادیب پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور کے ناول 'شبنمی لمسوں کے بعد' کی رسم اجرا تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ایل این ایم یو کے سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر حافظ انیس صدری نے بحیثیت مہمان خصوصی کہیں۔ پروفیسر طرزی نے منظوم تبصرے میں پورے ناول کا احاطہ کرتے ہوئے تنقیدی جائزہ پیش کیا۔

نوجوان ناقد ڈاکٹر احسان عالم نے اس موقعے پر ناول کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ''ناول میں جسمانی جمالیات پیش کر کے مناظر عاشق ہرگانوی نے سماج کو ایک درس دینے کی کوشش کی ہے۔ ٹرسٹ کے سکریٹری ڈاکٹر منصور خوشتر نے پروفیسر ہرگانوی کا تعارفی خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ موصوف نے اپنی پوری زندگی اردو ادب کی خدمت میں گزاری ہے۔ اب تک ان کی 225 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ناول 'شبنمی لمس کے بعد' ان کی تمام کتابوں میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس ناول میں جسمانی جمالیات کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا سب سے بڑا پہلو یہ ہے کہ پورے ناول میں جمالیات اور جنس کی باتیں ہیں لیکن اس انداز سے تحریریں پیش کی گئی ہیں کہ کہیں بھی جنسی خواہشات ابھرتی نہیں ہیں بلکہ یہ جمالیاتی حسن ہمارے ذہن کو جھنجھوڑ کر سماج کے حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ آخر میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے ناول کی مختلف جہتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ میں نے اس ناول میں قارئین کے لیے بہت کچھ دینے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس ناول کا مطالعہ گہرائی سے کیا جائے تو اس سے کئی پہلو اجاگر ہوں گے۔

روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ، 9 اگست 2018

وفیات:

کلدیپ نیر

نئی دہلی: ہندوستان میں صحافت کے ایک اہم ستون، حقوق انسانی کے علمبردار، سماجی کارکن، سفارت کار اور

سیاست داں کلدیپ نیر کا 23 اگست کو انتقال ہو گیا۔ ان

کی عمر 95 برس تھی۔ وہ کافی دنوں سے علیل اور اسپتال میں زیرِعلاج تھے۔ پسماندگان میں بیوی اور 2 بیٹے ہیں۔ صدر جمہوریہ ہند رام ناتھ کووند، وزیراعظم نریندر مودی، سابق نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری، سابق وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ سمیت تمام اہم سیاسی پارٹیوں کے لیڈران، متعدد ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ اور گورنروں، صحافیوں اور حقوق انسانی کی تنظیموں، ملک کے اہم صحافیوں نیز مسلم سماجی تنظیموں نے کلدیپ نیر کے انتقال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور ان کے انتقال کو ہندوستانی صحافت کے لیے غیرمعمولی نقصان قرار دیا ہے۔ صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ مسٹر نیر ایک اہم ایڈیٹر اور مصنف، سفارت کار اور ممبر پارلیمنٹ تھے۔ انھوں نے ایمرجنسی کے دوران جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لیے اہم رول ادا کیا۔ لوگ ان کی تحریروں کے لیے انھیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ صدر جمہوریہ نے ان کے خاندان کے ساتھ تعزیت کا اظہار بھی کیا۔ کلدیپ نیر غیرمنقسم ہندوستان کے سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش 14 اگست 1923 کو ہوئی۔ انھوں نے لاہور سے قانون کی پڑھائی کی تھی اور بعد میں امریکہ سے صحافت کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کلدیپ نیر نے اپنی صحافتی سرگرمیوں کا آغاز دہلی کے اردو روزنامے 'انجام' سے کیا تھا اور بعدازاں مشہور مجاہد آزادی رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی کے مشورے پر انگریزی صحافت سے رشتہ قائم کیا۔ انھوں نے اسٹیٹس مین، انڈین ایکسپریس جیسے اہم اخبارات میں کام کیا، یو این آئی کی سربراہی کی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے وزیرداخلہ لال بہادر شاستری سے پریس آفیسر کے طور پر منسلک رہے۔ انھوں نے لندن ٹائمز میں بھی بطور صحافی خدمات انجام دیں۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کا قیام کلدیپ نیر کی کوششوں اور مشوروں کا ہی نتیجہ تھا۔ 1972 میں اس کا اجلاس کلدیپ نیر کی صدارت میں ہوا تھا۔ گذشتہ دنوں ان کی آپ بیتی 'ایک زندگی ناکافی' اردو میں شائع ہوئی تھی۔ وہ برطانیہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر بھی رہے اور انھیں 1997 میں راجیہ سبھا کا ممبر بھی بنایا گیا۔ صحافتی دنیا میں ان کی بہترین خدمات کے لیے 2015 میں انھیں رام ناتھ گوئنکا اسمرتی ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں ان کی کتاب 'بیونڈ دی لائن: این آٹوبایوگرافی' ایک بہترین سوانح عمری ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اگست 2018

سید منظر امام

دربھنگہ: افسانہ نگار، ادیب، شاعر اور صحافی پروفیسر سید منظر امام (سابق صدر شعبۂ اردو، گرونانک کالج دھنباد، جھارکھنڈ ولادت: 10 اگست 1938 مقیم فاطمہ ہاؤس، واسع پور، دھنباد) کا 24 اگست 2018 بروز جمعہ بوقت 7 بجے شام حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ 25 اگست 2018 کو بعد نمازِ عصر تدفین شمشیر نگر قبرستان میں عمل میں آئی جہاں خویش واقارب کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں ان کے شاگرد اور معززین شہر نے شرکت کی اور مرحوم کو نم آنکھوں سے سپردِ خاک کیا۔ جنازے کی نماز مولانا نوشاد عالم ندوی نے پڑھائی۔ ان کی رحلت سے بہار وجھارکھنڈ کا ادبی حلقہ سوگوار ہے۔ مرحوم کی جائے ولادت دربھنگہ اور جائے عمل دھنباد تھی۔ وہ 'امیر منزل'، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ کے آخری ستون تھے۔ ان کے دو بڑے بھائی مسٹر حسن امام درد اور مسٹر مظہر امام پہلے ہی اس جہانِ فانی سے رخصت ہوچکے ہیں۔

روزنامہ 'آگ' لکھنؤ، 29 اگست 2018

ظفر رحمانی

نجیب آباد: نجیب آباد کے بزرگ اور استاد شاعر ظفر رحمانی کا طویل علالت کے بعد 76 سال کی عمر میں 29 اگست کو انتقال ہوگیا۔ ان کی موت کی خبر سے شہر کے ادیبوں اور شاعروں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ بعد نماز مغرب ان کو سپرد خاک کیا گیا۔ شہر نجیب آباد کے بزرگ اور استاذ شاعر ظفر رحمانی ایک اچھے شاعر اور ملنسار شخصیت کے حامل تھے۔ مرحوم بہت سوچ سمجھ کر اشعار کہتے تھے۔ ان کی شاعری اپنی ایک الگ پہچان رکھتی تھی۔ مرحوم کافی دنوں سے گلے کے کینسر کی بیماری سے متاثر تھے اور دہرہ دون میں ان کا علاج چل رہا تھا۔ بیتی شب تقریباً 9 بجے انھوں نے آخری سانس لی اور اس دارفانی کو الوداع کہہ دیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 30 اگست 2018

پریم پال اشک

نئی دهلی: بڑے افسوس کے ساتھ دنیائے اردو کو مطلع کیا جاتا ہے کہ نامور محقق، شاعر اور فلمی صحافی اور مترجم پریم پال اشک کی آج سے سات مہینے پہلے 14 جنوری 2018 کو پچاسی سال کی عمر میں میکلوڈ گنج (ہماچل پردیش) میں وفات ہوگئی مگر دنیائے ادب کو اس کا پتہ بھی نہ چلا۔ مَیں نے اُن کی خیریت جاننے کے لیے انھیں ٹیلی فون کیا تو اُن کے بیٹے نے فون اُٹھایا اور بتایا کہ اشک صاحب کی سات مہینے پہلے وفات ہوچکی ہے۔

پریم پال اشک 5 جون 1932 کو جالندھر (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے دہلی یونیورسٹی سے اُردو میں ایم کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی اور وزارتِ دفاع حکومتِ ہند کے اخبار 'سینک سماچار' میں مدیرِ معاون کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ انھوں نے متعدد کتابوں کی تصنیف وتالیف کی۔ ابتدا میں شاعری کی جانب زیادہ رجحان رہا اور اس صنف میں اُن کی منظوم کتابیں 'یاترا' (1956)، رامائن (1961)، شگنتلا (1963) اور پھر 1968 میں شعری مجموعہ 'گلشن گلشن'، اشاعت پذیر ہوا۔ 1964 میں اُن کی تحقیقی کتابیں سرشار ایک مطالعہ (1964) اور رتن ناتھ سرشار (1982) منظرعام پر آئیں جن کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد بشن نرائن در، (1966) روزمرہ محاورۂ غالب (1969)، ہمارے جاں باز اشاعت پذیر ہوئیں۔ اُنھوں نے فلموں سے متعلق بھی متعدد کتابیں لکھیں، جن میں فلمیں کیسے بنتی ہیں (ترجمہ 1979) ہماری فلمیں ہمارا سماج (1980) سلولائیڈ کی دنیا (1986) تحریک آزادی اور ہندوستانی سنیما، ہمارا سنیما، ہندوستانی سنیما کے پچاس سال، فلم شناسی، پھالکے کے وارث۔ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بہت سی کتابوں کے تراجم بھی کیے جیسے کام سوترا (1971) مقناطیسی علاج، بیچ فلاور ریمیڈیز، بائیوکیمک علاج۔ ازل ایڈ، ہومیوپیتھی سب کے لیے، شمع جلتی رہی، پھلوں اور سبزیوں سے علاج، اناج اور مسالوں سے علاج وغیرہ۔ اُردو میں ان کی خدمات پر انھیں کئی ایوارڈ اور انعامات ملے۔ حکومت اترپردیش (1965) یوپی اُردو اکادمی لکھنؤ (1970) آندھرا پردیش اُردو اکادمی حیدرآباد (1980) اُردو کادمی مغربی بنگال (1981) اردو لینگویج ڈپارٹمنٹ پنجاب (1986) کے علاوہ دہلی اُردو اکادمی نے انھیں ایوارڈ اور دہلی یونیورسٹی شعبۂ اُردو نے بھی اعزاز سے نوازا۔

پریس ریلیز: نند کشور وکرم، دہلی، 20 اگست 2018

قیصر صدیقی

سمستی پور: عہد حاضر کے معروف غزل گو شاعر اور نغمہ نگار قیصر سمستی پوری کا 4 ستمبر بروز منگل کو شہر کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 80 سال تھی۔ ان کی تجہیز وتدفین سمستی پور میں ان کے آبائی

گاؤں نوادہ میں ادا کی گئی۔ مستی پور کے قیصر آباد، نوادہ میں عبدالغنی مرحوم کے گھر ان کی پیدائش 19 مارچ 1937 کو ہوئی تھی۔ ان کا تاریخی نام افتخار احمد تھا لیکن ادبی دنیا میں انھیں قیصر صدیقی کے نام سے شہرت ملی۔ سید وحیدالدین عظیم آبادی اور جرم محمد آبادی جیسے باکمال شاعروں کی صحبت نے ان کی غزلوں کو نکھارا۔ قیصر صدیقی عہد حاضر کے اہم غزل گو شاعروں میں تھے۔ ان کا پہلا مجموعہ 'صحیفہ' کے عنوان سے 1983 میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد کئی مجموعے منظر عام پر آئے اور مقبول بھی ہوئے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں بے وقت کا راگ نہیں الاپا بلکہ اپنے زمانے کے گوناگوں مسائل کو ترجیحی طور سے پیش کیا جس کی وجہ سے ان کی غزلیں معاصر سیاسی، سماجی اور تہذیبی اقدار کی آئینہ دار بن گئیں۔ ان کے شعری مجموعے صحیفہ، بے چراغ آنکھیں، ڈوبتے سورج کا منظر، یہ انجمن دل ہے، اجنبی خواب کا چہرہ، سجدہ گاہ فلک اور 'روشنی کی بات' بے حد مقبول ہوئے۔ انھوں نے فلموں اور قوالوں کے لیے بھی کثرت سے لکھا جن میں بعض کو نغموں کو تاریخی حیثیت اور بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے انتقال سے ادبی دنیا سوگوار ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 ستمبر 2018

حاجی وسیم عثمانی

دیوبند: دارالعلوم دیوبند کے سابق شیخ الحدیث مولانا شریف الحسن عثمانی کے صاحب زادے اور دیوبند کے سینئر صحافی و پریس ایسوسی ایشن دیوبند کے اہم رکن حاجی وسیم عثمانی کا تقریباً 63 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وسیم عثمانی لاولد تھے اور اپنے گھر میں گذشتہ کچھ ماہ سے تنہا رہ رہے تھے، وسیم عثمانی گذشتہ شام مغرب کے وقت اپنے مکان میں مردہ پائے گئے۔ اندازہ لگایا جارہا ہے کہ یہ المناک واقعہ دو دن قبل پیش آیا ہے۔ اچانک ہارٹ فیل ہونا ان کی موت کا ایک سبب سمجھا جارہا ہے۔ مرحوم گذشتہ بیس سالوں سے دہلی و لکھنؤ وغیرہ سے شائع ہونے والے اردو کے مختلف اخبارات و رسائل میں رپورٹنگ کرتے تھے۔ فی الحال وہ روزنامہ 'میراوطن' میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ چند ماہ قبل مرحوم ہارٹ اٹیک کا شکار ہوگئے تھے لیکن خوش مزاج اور زندہ دل شخص تھے۔ صحافی برادری کو یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ ان کے خیر خواہ اور ہمدرد اب ان کے درمیان نہیں رہے۔ نماز جنازہ رات ساڑھے گیارہ بجے احاطہ مولسری میں دارالعلوم دیوبند کے نائب مہتمم مولانا عبدالخالق سنبھلی نے ادا کرائی، بعدازیں قاسمی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ وسیم عثمانی کے انتقال پر مہتمم دارالعلوم دیوبند مفتی ابوالقاسم نعمانی، مہتمم دارالعلوم وقف مولانا محمد سفیان قاسمی، جمعیۃ علماء ہند کے صدر قاری سید عثمان منصور پوری، مولانا عبدالخالق مدراسی نے رنج و غم کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'میراوطن'، دہلی، 5 ستمبر 2018

نیر سرسوی

سرسی سادات: سرسی کی شان عالمی شہرت یافتہ دنیائے اردو ادب کے محترم شاعر نیر سرسوی کا حرکت قلب بند ہونے سے 8 ستمبر کو انتقال ہوگیا۔ آسمان اردو ادب کا یہ چمکتا

ستارہ رات ایک بجے حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے موت کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے سوگیا۔ نیر سرسوی اس دنیا میں نہیں رہے لیکن وہ اپنے سلام، منقبت، مسدس، نوحوں اور غزلوں کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ نیر سرسوی کئی مرتب امریکہ کے شہر اٹلانٹا، پاکستان، عراق میں کربلا اور نجف میں اپنی شاعری کی الگ پہچان بنا چکے تھے۔ انھوں نے پوری دنیا میں شاعری کے ذریعے سرسی کا نام روشن کیا۔ بزم شعرائے میثم بنا کر انھوں نے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعروں کے لیے ایک منچ بنایا۔ بزم شعرائے میثم کی طرف سے ماہانہ طرحی نشست کا سلسلہ شروع کیا، جس کے تحت ہر ماہ بزم کے کسی ایک ممبر کے یہاں طرحی نشست ہوتی تھی۔ ان کی نماز جنازہ میں ہزاروں لوگوں کے علاوہ اردو داں حضرات نے شرکت کی۔ جنازہ کی نماز مولانا محمد حسین الزماں نے ادا کرائی۔ ان کو آبائی قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 ستمبر 2018

خراج عقیدت:

فرید پربتی

سری نگر: وادی کے معروف شاعر، نقاد اور معلم مرحوم ڈاکٹر فرید پربتی کی یاد میں یہاں ایک پروقار نشست ہوئی، جس کا اہتمام کشمیر بک پروموشن ٹرسٹ نے میزان پبلشرز کے تعاون سے کیا تھا۔ تقریب کی صدارت معروف صحافی جاوید آذر نے کی، جبکہ مرحوم پربتی کی اہلیہ محترمہ اور مرحوم کے دیرینہ ساتھی پروفیسر ناصر مرزا بھی ایوان صدارت میں موجود رہے۔ اس موقعے پر فرید پربتی کی زندگی اور آپ کے علمی و ادبی کارناموں کے الگ الگ پہلوؤں پر کئی طلاب اور مرحوم کے ساتھیوں نے روشنی ڈالی۔ نشست کی خاص بات یہ رہی کہ نہ صرف اردو زبان و ادب سے منسلک طلبہ اور اسکالروں نے مقالات پیش کیے بلکہ انجینئرنگ اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان اسکالروں اور طالب علموں نے بھی اس طرح کے مقالات پیش کیے، جن کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ حاضرین نے محسوس کیا اور اس کا برملا اظہار بھی کیا کہ اردو کی کسی شخصیت کے بارے میں پہلی دفعہ ایسے جامع، مدلل اور ٹھوس مقالے پڑھے گئے۔ چنانچہ منتظمین تقریب سے یک زبان ہوکر استدعا کی گئی کہ ان مقالات کو کتابی صورت میں شائع کرایا جائے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 اگست 2018

اظہار مسرت یزدانی

نئی دھلی: انجمن محبان اردو ٹونک کے زیر اہتمام بتاریخ 18 اگست 2018 ایک تعزیتی نشست ڈاکٹر اظہار مسرت یزدانی کی یاد میں سید ساجد علی ٹونکی کی نشست گاہ نیو علی منزل محلہ رجبن ٹونک میں منعقد ہوئی جس میں شہر کے معزز علما، فضلا، ادبا و شعرا نے شرکت فرمائی۔ اس نشست میں مقررین نے راجستھان کے مشہور شاعر ادیب اور نقاد ڈاکٹر اظہار مسرت یزدانی کے سانحہ ارتحال پر ان کی علمی اور ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ یاد رہے کہ 6 اگست 2018 کو ڈاکٹر اظہار مسرت صاحب کا انتقال ایک سڑک حادثے کے بعد جے پور کے سوائی مان سنگھ ہسپتال میں ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر اظہار مسرت 1950 میں پیدا ہوئے۔ آپ کی حسب ذیل کتب شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں: کرب خموشی (شاعری)، روح غزل، فکر ریزے (تبصرہ جاتی مضامین)، روبروئے آئینہ (خود احتساب)، یہ بھی سچ ہے (صحافت)، ترقی پسند ادب کے پچاس سال، اردو شاعری کے باغیانہ روش وغیرہ۔ ان کی سیکڑوں شعری کاوشیں اور مضامین ملک و بیرون ملک سے شائع ہونے والے مقتدر جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں بہت سے انعامات و اعزازات سے بھی نوازا جاچکا ہے جن میں ساہتیہ لیکھن سمان (1992)، راشٹریہ ساہتیہ پریشد انعام (بھوپال)، اعزاز میر 1997، کل ہند میر تقی میر ایوارڈ

وغیرہ شامل ہیں۔ اردو جریدے ’اسباق‘ (پونہ) میں 120 صفحات پر مشتمل خصوصی نمبر اظہار مسرت صاحب پر شائع ہو چکا ہے۔ اس نشست کی صدارت مولانا محمد سعید صاحب نے اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشد عبدالحمید صاحب نے انجام دیے۔

پریس ریلیز: سید ساجد علی ٹونکی، سکریٹری انجمن محبان اردو، دہلی 28 اگست 2018

فراق گورکھپوری

گورکھپور: اردو کے عظیم شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے 122 ویں یوم پیدائش پر منگل کو ان کے آبائی گاؤں بنواپار کے علاوہ شہر کے الگ الگ گوشوں میں تقریبات کا اہتمام کیا گیا، جن میں مقررین نے فراق کی شخصیت اور خدمات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ فراق صاحب اردو ادب کے کوہ نور تھے۔ ان کی شاعری نے ادبی دنیا کو ایک نئی شناخت دی لیکن آج ان کی غزلوں اور نظموں کی طرح یادیں بھی انہی کے شہر میں دم توڑ رہی ہیں۔ بنواپار میں منعدہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فراق سیوا سنستھان کے بانی ڈاکٹر چھوٹے لال یادو نے کہا کہ جس نے اردو شاعری کو نئی شناخت دی ہو، جس نے اپنے نام سے علاقے اور ضلع کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا ہو، ہم اسے کیسے فراموش کر سکتے ہیں، اگر ہم انھیں بھول جائیں تو ہم انسان کہلانے کے لائق نہیں ہیں۔ ہم فراق کو آخری سانس تک نہیں بھولیں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ حکومت کو ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے سنجیدہ کوشش کرنی پڑے گی ورنہ آنے والی نسل فراق کا نام تک بھول جائے گی۔ پروگرام کی صدارت رمیش چند تیواری نے کی، جبکہ نظامت کے فرائض شمبھوناتھ مشرا نے انجام دیے۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 29 اگست 2018

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں ’اردو دنیا‘ کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................. بتاریخ..................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

آپ ’اردو دنیا‘ ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام: ....

پتہ: ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in, 011-26108159: فیکس 011-26109746 :فون

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

بین الاقوامی قانون

مصنف: محمد ظفر محفوظ نعمانی
صفحات: 264
قیمت: 135 روپے

فلکیاتی بستہ

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 73
قیمت: 65 روپے

فلکیاتی نظارے

مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 73
قیمت: 60 روپے

پیکر فکر و عمل: سید حامد

مرتب: سید منصور آغا
صفحات: 454
قیمت: 210 روپے

کلیات فراق (غزلیات) جلد اوّل و دوم

مرتب: جعفر رضا
صفحات: 556 (اوّل) 576 (دوم)
قیمت: (سیٹ) 520 روپے

خواتین کی اختیار کاری وصنفی مساوات

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 302
قیمت: 145 روپے

اصلاح الاصلاح

مصنف: ابراحسنی گنوری
مقدمہ: شمس رمزی
صفحات: 129
قیمت: 85 روپے

خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں
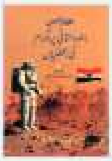
مصنف: انیس الحسن صدیقی
صفحات: 50
قیمت: 50 روپے

انتخاب سخن (جلد سوم) سلسلۂ مومن

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 326
قیمت: 155 روپے

جتنے دور اتنے پاس

مصنف: دھیریندر سنگھ جفا
صفحات: 289
قیمت: 140 روپے

محمود ایاز کی تحریریں

مرتب: اکرم نقاش
صفحات: 619
قیمت: 275 روپے

تصوف اور بھکتی کی اہم اصطلاحات

مصنف: شمیم طارق
صفحات: 411
قیمت: 185 روپے

صرف تمہارے لیے

مصنف: ڈاکٹر سمتیندر راناڈگ
مترجم: ماہر منصور
صفحات: 139
قیمت: 85 روپے

عروج فن کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی

مرتب: ہما مرزا
صفحات: 260
قیمت: 145 روپے

کلیات ماجدی (شخصیت) جلد چہارم

ترتیب وتدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات: 527
قیمت: 230 روپے

شب خون کا توضیحی اشاریہ (جلد اوّل و دوم)

مرتب: انیس صدیقی
صفحات: 1374 مکمل سیٹ
قیمت: 580 روپے مکمل سیٹ

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات

مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: 168 روپے

دنیائے افسانہ

مصنف: محمد عبدالقادر سروری
صفحات: 131
قیمت: 85 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication: **24/09/2018**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, October-2018, Vol.20, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025